دو آدھے
شمیم نکہت

شمیم نکہت کے افسانوں میں انسانی رشتوں کے بارے میں عمیق مطالعہ اور مشاہدہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اس کے کردار تشنگی اور سراب کے معاشرہ کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے سب سے طاقتور رجحان کی نفی کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ انسان دوستی کے ذہن سے تحریر کردہ کہانیاں اپنے کرداروں میں بھی انسان دوستی کے جانفزا رجحانات کی تلاش کا دوسرا نام ہیں۔ یہ کہانیاں ریزہ ریزہ ہوتے دکھائی دینے والے کرداروں میں زندگی کے اُن حیات بخش آدرشوں کا پتہ دیتی ہیں جو کمال ایمانداری کے ساتھ مطالعہ و مشاہدہ کو انسان دوستی کے لیے لازم و ملزوم خیال کرتے ہیں۔

شمیم نکہت کے یہاں ابھی تک وہ نظریاتی خلوص اور تڑپ موجود ہے جو نہ صرف کرداروں کی تفہیم کے لیے ضروری ہے بلکہ ان کی زندگی کے غیر جانبدارانہ مطالعہ کے لیے بھی لازمی شرط ہے۔ ایک بھرپور افسانہ نگار کے لیے علامت زندگی پر محیط استعارہ سے منزّہ اندازِ نظر نہیں ہے۔ علامت زندگی کی زیادہ بھرپور ترجمانی اسی وقت کرسکتی ہے جب وہ زندگی کے اتھاہ سمندر کا حصہ ہو چکی ہو۔ شمیم نکہت کی کہانیوں میں زندگی اور استعارہ باہم یک دگر اس قدر گتھم گتھا ہیں کہ ایک کی موجودگی دوسرے کے لیے مفقود الخبری کی اطلاع نہیں۔ ان کہانیوں کی سادگی بذاتِ خود ایک بڑی تجریدی کاوش ہے اور اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت بھی کہ افسانہ نگار زندگی بیزار ادبی رویوں کے خوگر حضرات کے لیے غریبِ شہر تو ہوسکتا ہے لیکن وہ لازمی طور پر ایک ایسی "سخن" رکھتا ہے جسے قاری پڑھ چکنے کے بعد اپنے وجود میں ایک سوالیہ نشان کے طور پر محسوس کرنے پر مجبور پاتا ہے۔ یہی سادگی اور پُرکاری ہے۔

کراچی
۱۲ر مارچ ۱۹۸۹ء

شمیم احمد (دستخط)

کراچی یونیورسٹی۔ کراچی (پاکستان)

دو آدھے

افسانے

شمیم نکہت

DO AADHE

SHORT STORIES

DR. SHAMIM NIKHAT

دو آدھے

ڈاکٹر شمیم نکہت

بار اوّل

سنہ اشاعت 1989

تعداد اشاعت ایک ہزار

طباعت کلاسیکل پرنٹرس۔ چاوڑی بازار۔ دہلی

کتابت سید حسن اختر

قیمت ساٹھ روپے Rs 60/-

تقسیم کار

- نصرت پبلشرز :- حیدری مارکیٹ۔ امین آباد۔ لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵ - دہلی ٦ - علی گڈھ ١ - بمبئی ٣
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس :- ٣١٠٨ گلی عزیز الدین، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ٦

شارب اور شعاع

کے نام

جن کے بغیر میری زندگی کی کہانی ادھوری تھی

شمیم نکہت

فہرست

پیش لفظ

کہانی لکھنے کے کوئی دو یا دس طریقے نہیں۔ کہانی کے اسالیب تو کچھ اس طرح متنوع ہیں جیسے ذی جانوں کے چہرے، مگر شرط یہ ہے کہ جیسے ہر چہرے کے نقوش ذی جاں کی ذات کی تخلیقی منطق کے عین مطابق بسے بسے محسوس ہوتے ہیں، ویسے ہی کہانی کے خدوخال میں بھی اُسی کے مخصوص ماجرے کے تناؤ کی آباد کاری کا سماں بندھا ہو۔ ماجرے کو بعض نقاد صرف خارجی واقعات سے تعبیر کر کے اس کے اسکوپ کو گھٹا دیتے ہیں۔ ماجرا اگر واقعی محض خارجی مظاہر کے مترادف ہوتا تو کسی کو دیکھنے کے لیے عین بین دو آنکھوں سے دیکھنا لازم ہوتا، جبکہ ہے یہ کہ ہم جسے جب چاہیں، اُسے اُسی وقت جی ہی جی میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ماجرا سازی کا فنی مفہوم واقعات کی صحیح تقطیع کر پانے سے ہی ادا نہیں ہو جاتا۔ اہم بات یہ ہے کہ کہانی کار کی اسلوبی یا موضوعاتی ترجیحوں کے باعث کہانی کے طبعزاد خارجی یا باطنی اسباب کا سدباب نہ ہو۔

شمیم نکہت کی نہایت مناسب ماجرا سازی نے مجھے خاص طور پر اُن کی کہانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ "دو آدھے" کی سبھی کہانیاں مصنفہ کی خود پارسائی کے عناصر کو ہوا دینے کی بجائے نمایاں طور پر وارداتی ہیں اور ہمارے روزمرہ کے تلازموں سے بے ساختہ جُڑ کر گویا ہم پر بیت جاتی ہیں۔ شمیم نکہت نے اِن کہانیوں میں بجا طور پر اپنی دیکھی بھالی محدود زندگی کے مناظر پر اکتفا کیا ہے۔ ہمارے بعض نئے لکھنے والے بین الاقوامی مسائل پر بھاری بھر کم مفروضانہ بحثیں لکھ کر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ بڑی گمبھیر کہانی ہو لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں اکادمی علوم میں مفروضوں کے بغیر بن نہیں پڑتی وہی تاکید اور تناؤ سے عاری ہونے کے باعث مفروضے سرے سے ہی فنونِ لطیفہ کے ذیل سے خارج ہوتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ زندگی کے مانند وارداتی کرائسس سے عبارت ہوتے ہیں۔ اِس لحاظ سے شمیم نکہت نے جین آسٹن کے مانند اپنے فن کو اپنی واردات (EXPERIENCE) تک محدود رکھ کر دراصل اپنی جاذبیت کا

جواز پیدا کر لیا ہے۔

شمیم نکہت کی کہانیوں کی دنیا ہمارے آس پاس کی دنیا ہے اور وہ آئے دن کی چھوٹی بڑی الجھنوں کو اون کے دھاگے کے مانند سلائیوں پر چڑھا کر بڑی مہارت سے بُنتی چلی جاتی ہیں اور اس طرح کہانی جب تیار ہو جاتی ہے تو اِس رنگ بھری اوڑھنی کی مانوس حدت کو محسوس کر کے قاری کا انسانی قدروں میں گہرا پڑا اعتماد استوار ہونے لگتا ہے اور وہ جینے اور جھیلنے پر اپنے آپ کو از سر نو بخوشی آمادہ پا کر مصنفہ کے بارے میں تشکر سے سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پائمال قدروں کا منہ تو ماں پیار سے دھوتی ہی ہے، شمیم نکہت نے عورت ہونے کے ناطے اپنی کہانیوں کے ذریعے ایک اور اہم کام بھی انجام دیا ہے۔ مشرقی عورت کے دُکھ کے ذکر میں عام طور پر شماریاتی اتھلا پن یا بے واسطہ اکادمی علمیت کو روا رکھا جاتا ہے۔ اس کتاب کی بیشتر کہانیاں پڑھ کر ہمیں نہ صرف نسوانی دُکھ کے عملی اسباب کو کھُلے کھُلے سمجھنے بلکہ اِس دُکھ کی رفاقتوں کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔ ہندوستانی عورت کے سانحات کی واقعاتی نوعیت شمیم نکہت کے یہاں اتنی کھری ہے کہ بے اختیار خیال گزرتا ہے، شاید کوئی عورت ہی اِس اندھکار میں بے چاپ داخل ہو کر ہمیں اِس کا ادراک عطا کر سکتی تھی۔

شمیم نکہت کو اس قدر قابلِ مطالعہ بنانے میں اُس کے بے تکلف گیلے گیلے محاورے کا بھی ہاتھ ہے۔ ہمارے بعض نقاد کہانی کی زبان پر بھی زبان کے جامد قاعدوں کا اطلاق کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس شمیم نکہت کی زبان اپنے آپ کو پیش کرنے کی بجائے نہایت خاموشی سے اُس کے افسانوی مقامات کی آبادکاری میں جُٹی ہوتی ہے، اتنی خاموشی سے کہ ہم گویا پڑھ نہ رہے ہوں، بلکہ کچھ واقعی ہوتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔ زبان کے ایسے ہی تخلیقی استعمال کے فروغ سے ہم آئندہ زندگی کے پیچ و تاب کو اپنے فن میں منتقل کرنے پر قادر ہو پائیں گے۔ "دو آدھے" شاید شمیم نکہت کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اُن کا فن برابر رو بہ ارتقاء ہے اور مجھے یقین ہے کہ اپنی اٹوٹ لگن سے وہ اپنی فنی زمین کو پیہم ہموار تر کرتی چلی جائیں گی۔

جوگندر پال

۲۰۴، مندا کنی انکلیو، نئی دہلی ۱۹

۳۔ نومبر ۸۹ء

کہانی سے پہلے

"کہانی" کے بارے میں ناقدین نے کچھ بہت بھاری بھرکم قسم کے اصول بنائے اور ان کے عناصرِ ترکیبی بھی مقرر کیے اور پھر نئی کہانی پرانی کہانی قسم کے لیبل بھی لگا دیے۔ لیکن میری یہ کہانیاں اِن اصولوں پر کتنی پوری اترتی ہیں مجھے نہیں معلوم، مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ دل کی چوٹ جب جب پک کر آنسو بنی ــــ تو کہانی کے روپ میں ٹپک پڑی ــــ

یہ کہانیاں میرے اطراف بکھری ہوئی مختلف دور کی سچائیاں ہیں جو کبھی پسِ دیوار جھانکتی ملیں۔ کبھی گاؤں کے کھیتوں میں اُگی دکھائی دیں اور کبھی شہروں کی گھما گھمی کے گرد منڈلاتی ہوئی ذہن پر چھا گئیں۔ اور کبھی تو اپنے گھر میں سانس لیتی محسوس ہوئیں اور جی اٹھیں۔

کرامت حسین گرلز کالج میں رضیہ آپا نے مضمون دیکھے تو کہا ــــ تم کہانی کیوں نہیں لکھتیں ــــ ہم نے کہانی لکھی ــــ اور ــــ پھر لکھتی رہی ــــ ابتدا میں ہماری کہانیوں کے نقاد بہت اہم تھے۔ کبھی رئیسہ۔ کبھی انیس کبھی مشرف اور کبھی بلقیس۔ ۔ بے بی (یاسمین) بہت چھوٹی تھی ــــ یہ ہماری بہنیں ہیں ــــ جن کی عمریں اُس وقت سترہ سے آٹھ سال تک تھیں۔ کہانی اچھی یا بُری ہونے کا معیار یہاں مقرر ہوتا ــــ اور میں مطمئن ہو جاتی ــــ نہ کہانی کی تکنیک سے مطلب نہ مواد سے اور نہ ہی زبان سے بحث ــــ شروع میں ان معصوم ذہنوں کی گرفت ہی ہماری کہانی کا معیار بنی۔ پھر رضیہ آپا دل بڑھاتیں۔

یونیورسٹی پہنچ کر اس شوق میں اور اضافہ ہوا۔ احتشام صاحب نے ہمت بڑھائی۔ ساتھیوں میں اختر بانو، فاطمہ، اشہد رضوی (شکیب سیتاپوری) احراز نقوی، احمد جمال پاشا، عارف نقوی خوش ہوتے۔ شارب ردولوی مشورے دیتے اور فوراً کسی رسالے میں چھپنے کے

لیے اس کا پتہ لکھوا دیتے (اس وقت وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے سب سے زیادہ ہردلعزیز طالب علم، شاعر اور سب کے 'شارب بھائی' تھے) ـــــ کہانیاں چھپیں اور میری پہچان بنتی گئی۔

ہمارے گھر کا ماحول ادبی نہیں تھا پھر بھی ابا اور چچی (اماں) کے چہروں کی روشنی میری ان تحریروں سے بڑھ جاتی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی ابراہیم کے لیے دعا گو ہوں جنھوں نے میرے علمی و ادبی کاموں میں میرا حوصلہ بڑھایا اور اس کی اشاعت پر مجھ سے زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ وہ پیشے سے انجنیر ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کب اور کیسے وہ اردو ادب سے رشتہ جوڑ بیٹھے کہ آج فیض احمد فیض اور قرۃ العین حیدر کی تحریروں پر بڑی گہرائی سے بات کرتے ہیں ـــــ یہ دونوں ان کے پسندیدہ فنکار ہیں۔

اس مجموعہ میں میری ابتدائی کہانیاں بھی شامل ہیں۔ جن کو میں نے کسی تبدیلی کے بغیر اسی طرح پیش کر دیا ہے۔ کہانیاں معمولی ہوں گی۔ بہت سی کمیاں بھی ہوں گی ـــ لیکن مجھے افسانہ نگار بنانے میں یہی کہانیاں بنیاد بنیں جن سے مجھے ویسی ہی محبت ہے۔ جیسے ماں کو پہلے بچے سے ہوتی ہے۔ اپنی کمیوں کے باوجود وہ پیارا ہوتا ہے۔

۱۹۶۱ء میں جب میں دہلی آ گئی تو میری کہانیوں کا دوسرا دَور شروع ہوا۔ یہاں بھی آس پاس کی بکھری زندگی نے کسی بین الاقوامی مسئلے میں الجھنے ہی نہیں دیا ـــــ کہ کرۂ زمین کے ہر گوشہ میں اگر دیا جل جائے تو ساری دنیا کا اندھیرا خود ہی دور ہو جائے گا ـــــ مسائل تو خود ہی سامنے آئیں گے۔

کہانیاں چھپیں تو غیر ممالک سے رشتے استوار ہوئے۔ رائیں آئیں۔ اعتبار اور اعتماد ملا۔ دہلی آنے کے بعد بنے بھائی (سجاد ظہیر) جیسے اہم اور پیارے انسان نے میرے شعور کو جلا بخشی۔ وہ میری کہانیاں مسکراتے ہونٹوں اور اَدھ کھلی آنکھوں سے سنتے تعریف کرتے۔ اور اکثر عوامی دور میں شائع کرتے۔ میں اور معتبر ہو جاتی ـــــ انھوں نے ہی مجھے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی۔ عصمت آپا۔ سردار جعفری۔ کیفی اعظمی۔ ساحر لدھیانوی، نیاز حیدر، رفعت سروش اور دوسرے بڑے ادیبوں اور شاعروں سے متعارف کرایا۔

رفعت سروش نے ہماری کہانیوں کو براڈ کاسٹ کر کے نہ صرف گھر گھر پہنچایا بلکہ زبردستی

فیچر اور کہانیاں لکھوائیں بھی۔ میں ان کی حوصلہ افزائیوں اور شفقتوں کی ہمیشہ ممنون رہوں گی۔

تنقید کی دنیا کا جانا مانا نام شارب ردولوی (میرے شوہر) میری کہانیوں پر پہلی رائے تو ضرور دیتے ہیں لیکن اِس معاملے میں میرا اور ان کا ہمیشہ اختلاف رہا —— میرا خیال ہے کہ نقاد کہانی کا اچھا سامع نہیں ہو سکتا۔ زبان پر انہیں خاصا اعتراض رہتا ہے لیکن اپنے اختلافات پر انھوں نے کبھی اصرار نہیں کیا —— میرے ادبی کردار کو سنوارنے میں ان کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں پچھلے جنم میں ہم نے موتی دان کیے تھے۔

میں نے اپنی کہانیوں پر پیش لفظ جوگندر پال صاحب سے لکھوایا ہے۔ یہ میرا ارمان تھا —— یہ عظیم کہانی کار ہم دونوں کا پیارا دوست اور میرا IDEAL ہے۔ شکریہ لکھ کر میں غیر نہیں بنوں گی۔

میں اپنے ان عزیزوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے بار بار تقاضے کر کے یہ مجموعہ شائع کرانے کا حوصلہ دیا —— جس میں رتن سنگھ۔ عابد سہیل۔ عارف محمود۔ آغا سہیل شامل ہیں۔

قمر رئیس اور محمد علی صدیقی کی ممنون ہوں کہ ان کی رائیں میرے مجموعے کے حسن میں اضافہ ہیں۔

عزیز ساتھی مشہور شاعر اور آرٹسٹ ڈاکٹر صادق کی بھی ممنون ہوں جن کے برش کی کاوشں نے اِس کتاب کو جاذبِ نظر بنایا۔

میں دہلی انتظامیہ اردو اکادمی اور اس کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی کی شکر گذار ہوں جن کے تعاون سے یہ کتاب شائع ہو سکی۔

آخر میں مَیں اپنی بیٹی شعاع سے معذرت خواہ ہوں کہ اس کے حصے کا بہت سا وقت ان کہانیوں کی نذر ہو گیا۔

ڈی ۵/۱۸ ماڈل ٹاؤن

دہلی ۱۱۰۰۰۹

شمیم نکہت

۵؍ مارچ ۱۹۸۹ء

انصاف

وہ بار بار بھیانک اندھیرے سے اپنے کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی ـــــ لیکن اس کے اِردگرد لپٹے ہوئے مہین مہین مکڑی کے سیاہ جالوں کی گرفت کچھ اور ہی سخت ہوتی جارہی تھی ـــــ رات کے شاید دو پہر ڈھل چکے تھے۔

ویسے رات کی سیاہی میں تو وہ کل شام تین بجے سے ہی اُلجھ کر رہ گئی تھی ـــــ جب اس کے کانوں سے شائیں شائیں کرتی تیز ہوائیں ٹکرائی تھیں ـــــ اس کے ہاتھوں سے ایک بے جان سا کاغذ کا ٹکڑا بار بار چھوٹا جارہا تھا ـــــ کبھی اس کی تحریر سیاہ سمندر بن کر اسے نگل جانے کو دوڑ رہی تھی ـــــ اور کبھی ایک ایک حرف صلیب بن کر اپنی آغوش میں سمو لینے کو بڑھ رہا تھا ـــــ تب ہی اس نے ایک توتلی سی آواز سنی تھی ـــــ "امّی میں آگیا"۔

ننھا سا راحت دوڑ کر اس کی گود میں گھس آیا تھا ـــــ اور ـــــ اچانک اندھیرں کی بارہو گئی تھی ـــــ لیکن بس سانس بھرنے کو ـــــ راحت ـــــ! اُس کی زندگی ـــــ اس کی محبت ـــــ اور ـــــ اس کا مستقبل ـــــ لیکن ـــــ وہ تو پانچ سال کا ہو چکا تھا ـــــ منحوس ـــــ پانچواں سال ـــــ جس کے خوف سے وہ لرز رہی تھی۔ کاش

وہ پانچ سال کا نہ ہُوا ہوتا ۔۔۔ وہ اِن برسوں کو ایر پھیر کر صرف چار کے ہند سے میں بند کر دینا چاہتی تھی ۔۔۔ لیکن وقت کو کس نے بیڑیاں پہنائی ہیں ۔۔۔ اس طوفان کو کون روک پایا ہے ۔۔۔

راحت، بوا کے ساتھ باہر سے کھیل کر آرہا تھا ۔۔۔ اس نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا ۔۔۔ کپڑے بدلائے اور پھر گود میں بھر کر کمرے کے چکّر کاٹنے لگی۔

راحت سو چکا تھا ۔۔۔ اور کمرے میں اندھیرے کے سیاہ جنگل اُگ آئے تھے ۔۔۔ اور اس کے چاروں طرف چتا کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اور اندر ۔۔۔ اندر نہ جانے کتنے آتش فشاں پھٹے پڑے تھے ۔۔۔ اس کے شریانوں میں چنگاریاں بہہ رہی تھیں ۔۔۔ اندھیرا کتنا گہرا تھا ۔۔۔ اور فیصلہ کتنا غلط ۔۔۔ لیکن یہ فیصلہ قانون کا تھا ۔۔۔ سماج کا تھا ۔۔۔ اور مذہب کا بھی ۔۔۔ اسے انصاف کا نام دیا گیا تھا ۔۔۔

کروٹ بدلتے بدلتے تھک کر وہ اُٹھی ۔۔۔ اور اس نے سامنے والی کھڑکی کھول دی ۔۔۔ باہر بھی گہرے اور ہلکے اندھیرے دُور دُور تک قطار میں پھیلے ہُوئے تھے ۔۔۔ کہیں کہیں روشنی کی ایک آدھ سِسکتی ہُوئی لہران اندھیروں سے جُوجھ رہی تھی ۔۔۔ اس کے پیر خود بخود ہوا میں معلق تھے ۔۔۔ انھوں نے اس کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا ۔۔۔ اور وہ اندر ہی اندر کہیں گہری کھائی میں اُترتی جا رہی تھی ۔۔۔ وہ اُبھرنا چاہ رہی تھی ۔۔۔ پلٹنا چاہ رہی تھی۔ پیچھے کی طرف ۔۔۔ وہ پیار کرنا چاہ رہی تھی ۔۔۔ راحت کو ۔۔۔ زندگی کے اُن لمحات کو جو آہستہ آہستہ اُس سے دور ہوتے گئے تھے ۔۔۔ اس کا ماتھا نم ہو گیا ۔۔۔ اور ننھے ننھے قطرے چھلک پڑے ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔ وہ سَردی محسوس کر رہی تھی ۔۔۔ اسے ایک جھرجھری سی آئی ۔۔۔ ارادے کا ایک جھٹکا ۔۔۔ بس ۔۔۔ سب کچھ ختم ۔۔۔ نیچے سڑک کافی دُور پر تھی ۔۔۔ ایک ۔۔۔ دو ۔۔۔ تین ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ کئی زینے ۔۔۔ کئی کھڑکیاں ۔۔۔ اس کی کھڑکی کے عین نیچے دبی پڑی تھیں ۔۔۔ اور آزادی سڑک پر کروٹیں لے رہی تھی ۔۔۔

سارے دکھوں ــــ سارے اندھیروں کو نگل جانے والی آزادی ــــ سڑک کی باہیں دیوانہ وار دائیں بائیں پھیلی اُسے پیار سے تک رہی تھیں ــــ اس نے ان باہوں میں سما جانے کا لمس بھی محسوس کیا ــــ لیکن اُس کا پچھلا دامن کہیں اٹک رہا تھا ــــ اور پھول مسکرا رہا تھا ــــ

اس نے مڑ کر دیکھا ــــ راحت بستر پر بے خبر پڑا سو رہا تھا ــــ اُس کا ننھا سا ہاتھ انجانے میں صاف شفاف چادر پر بار بار رینگ رہا تھا ــــ شاید ممتا کی تلاش تھی ــــ

وہ تڑپ کر پلٹی ــــ اور ننھا سا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا ــــ اُسکی دونوں کہنیاں بستر کے سینہ میں دھنس گئیں ــــ پھر اس کا ماتھا ــــ صاف شفاف نرم تکیہ پر مچلنے لگا ــــ جیسے اچانک بھونچال آ گیا ہو ــــ اور زمین کے سینہ میں مچلتا ہوا لاوا اُبل پڑا ہو ــــ

اس کا ٹھنڈا بے جان سا ہاتھ ننھے سے اُبھرے ہوئے کولھے ــــ اور پیٹھ پر سرکنے لگا ــــ پھر بالوں کے گھنے جنگل میں اس کی اُنگلیاں کچھ تلاش کرنے لگیں ــــ شاید ماضی ــــ جو بہت دُور نہیں کھو یا تھا ــــ اُس کی خوشبو ــــ اس کا لمس ــــ سب آس پاس ہی بکھرا بکھرا لگ رہا تھا ــــ

کلاس رُوم کی خوشبو ــــ ڈرامے ــــ آرٹس کمپٹیشن ــــ اور پھر لمبی چوڑی عاشقوں اور دوستوں کی قطار ــــ وہ کبھی کبھی تو اپنے ساتھ کام کرنے والے ہیرو کو ذہن میں چرا بھی لاتی ــــ یادوں میں بند کر لیتی ــــ اور اپنا ہیروئن کا رُوپ اُتارنا بھول جاتی ــــ اکثر ایسا ہوا تھا ــــ لیکن ایک بار ایک ہیرو سچ مچ اس کے اندر رچ بس گیا ــــ ہیروئن کا روپ بھی اُتر گیا ــــ لیکن ڈرامہ حقیقت بن چکا تھا ــــ

ٹریں ــــ ٹریں کرتی ہوئی ایک چڑیا کھڑکی کے عین نیچے سے گزر گئی، وہ چونک پڑی ــــ راحت بے خبر بڑلوں سے کھیل رہا تھا ــــ اس کے لبوں کے گوشے کھل گئے تھے ــــ اور گالوں میں ننھے ننھے گڑھے ــــ

مُسکرا رہے تھے ـــ

وہ اپنے گالوں کے خشک آنسوؤں پر انگلیاں پھیر رہی تھی ـــ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہُوئی تھیں ـــ اور حلق میں کانٹوں کا گچھا سا اٹک گیا تھا ـــ وہ آہستہ سے مُڑی ـــ اس کے قدم مُردہ ہو رہے تھے، لیکن اس کے دل میں کہیں دُور سے صدا آرہی تھی ـــ زندگی سے بھاگنے والے انسان، کیا انسان ہوتے ہیں ـــ ؟ نہیں ـــ نہیں ـــ یہ بُزدلی ہے ـــ بلکہ انسانیت کا مذاق ہے !ـــ

اس کی اپنی ہی آوازیں ماضی کے اسٹیج سے بکھر کر ادھر اُدھر منڈلا رہی تھیں ـــ اس نے فریج کھولا ـــ ٹھنڈے پانی کی بوتل ہونٹوں سے لگالی ـــ اس کے پُورے وجود میں چنگاریوں کی برچھیاں چُبھ رہی تھیں ـــ صبح ہونے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے ـــ جب روشنی اسکی ساری زندگی کو تاریک کر دے گی ـــ

وہ کمرے میں تنہا اندھیروں سے جنگ کر رہی تھی ـــ اور ہر طرح اندھیروں کو شکست دینا چاہتی تھی ـــ شکست محض کسی ہار کا ہی نام نہیں ہے ـــ بلکہ کسی حادثہ سے منھ پھیر لینا ـــ اس کے سامنے سینہ سپر ہو جانا بھی تو حادثہ کی شکست ہے ـــ حالات کو نظر انداز کر دینا بھی تو حالات کی شکست ہے ـــ پھر کیوں نہ وہ آنے والے لمحات کو شکست دیدے ـــ

وہ مسکرا کر دنیا کو بتا دے کہ ازل سے ابد تک پیدا ہُوئی تمام نام نہاد بہادریوں کو ایک ماں نے ایک گھونٹ میں پی لیا ہے ـــ ماں کتنا عظیم نام ہے ـــ ممتا ـــ کتنا پوتر رشتہ ہے ـــ اور ـــ اور ـــ یہ قانون ـــ یہ سماج ـــ کہاں ہے وہ دھرم ـــ کہاں ہے وہ مذہب ـــ جس نے ماں کو بھگوان کا نام دیا ہے ـــ جس نے اس کے قدموں کے نیچے جنّت تخلیق کر دی ہے ـــ جھُوٹ ـــ سب جھُوٹ ـــ

وہ پھر بستر پر گر پڑی ـــ اپنا منھ تکیئے میں چھپالیا ـــ وہ ایسے تڑپ رہی تھی جیسے برسوں بلکہ صدیوں پرانی قید سے اپنے آپ کو چھڑانا چاہتی

ہو ــــ جیسے دُنیا کے سَب سے زیادہ متبرّک، سب سے پائیدار، رشتہ سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہی ہو ــــ کتنی سیڑھیاں ہیں پیار کی۔ ــــ کتنے بندھن ہیں محبّت کے ــــ اور وہ سب کے سب کہیں نہ کہیں رشتوں میں بَدل جاتے ہیں ــــ کتنے اہم ہیں یہ رشتے ــــ اور ــــ کتنے متبرک ہیں ان کے نام ــــ

اس کے ذہن میں رشتے اور محبّتیں ایک ایک کر کے اُبھرنے لگیں، شوکت کا پیار اُس کو بہت اہم لگا تھا ــــ لیکن راحت نے سارے رنگوں کو پھیکا کر دیا تھا ــــ وہ سب کچھ بھُول گئی تھی ــــ بھوک ــــ پیاس ــــ نیند ــــ خوشی ــــ غم ــــ سب نے ممتا کے دامن میں سر چھپا لیا تھا ــــ

راحت کے آ جانے سے ــــ اس نے محسوس کیا تھا کہ شاید شوکت کے ساتھ اکثر ڈولتی زندگی ٹھہر جائے ــــ آنے والا شاید ہم دونوں کے دَرمیان بندھن بن جائے ــــ کچھ دن تو یہ سچ بھی لگا تھا ــــ لیکن جلد ہی تیز و تُند ہوائیں اس کی زندگی میں اُتھل پتھل مچانے لگی تھیں ــــ دونوں ہی تعلیم یافتہ ــــ اور روشن خیال تھے ــــ دونوں ہی کہیں نہ کہیں ٹکرا جاتے ــــ جس کی گونج سے گھر کا کونا کونا سنسان ہو جاتا ــــ سناٹے اس کی زندگی کا رس چوستے رہتے ــــ اس کی زندگی بنجر ہوتی چلی گئی ــــ ببول اور ناگ پھنی کے جھنڈ سر اُٹھاتے گئے ــــ اُٹھاتے گئے ــــ کانٹوں میں گھری وہ آگے بڑھ رہی تھی ــــ اور اس کا رُواں رُواں جنھیں محسوس کر رہا تھا ــــ

اس نے پھر کروٹ بدلی ــــ کتنا روشن تھا وہ دِن ــــ کتنا چمکیلا ــــ گلابی سا ــــ اس نے بہت تکلیف جھیلی تھی ــــ دوسرے دِن اسے ہوش آیا تھا ــــ اسے سَب دُھندلا دُھندلا نظر آ رہا تھا ــــ پھر امّی کا چہرہ آہستہ آہستہ اُبھرا تھا ــــ تحریر اس نے پڑھ لی تھی ــــ امّی مُسکرا رہی تھیں ــــ سب ٹھیک ہے ــــ بیٹا آیا ہے ــــ اسے محسوس ہُوا تھا جیسے توانائی اس کے اندر رینگ آئی تھی ــــ اس کے چہرے پر

اچانک سُرخی بھی آگئی تھی ــــ اور ــــ خشک ہونٹوں کے گوشے لرز کر کھل اُٹھے تھے ــــ اُسے شرم بھی آئی تھی ــــ اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس نے زندگی کو جنم دیا تھا ــــ وہ اپنے آپ کچھ اہم محسوس کر رہی تھیں ــــ پھر شوکت ــــ اور ــــ وہ دونوں ہی زندگی کے اس محور کے گرد یکجا ہو گئے تھے ــــ لیکن بس خواب کی طرح ــــ ایک جھونکا آیا ــــ اور گزر گیا ــــ ٹکراؤ کی ایکو بہت جلدی پھر گونجنے لگی تھی ــــ ہر چھوٹی سی بات نہ جانے کیسے نظریات کا لبادہ اوڑھ کر بے حد اہم بن جاتی ــــ اور اکثر جب قدیم فلسفوں اور مذہب کی روشنی میں بحث یہاں تک پہنچ جاتی کہ عورت تو ہے ہی کمتر ــــ یا پھر ــــ بات عورت کے کسی نہ کسی طرح بڑے ہونے تک پہنچتی تو ــــ اسے تمام مذہبی فلسفے ــــ فریب محسوس ہونے لگتے ــــ اور وہ اندر ہی اندر کھوکھلی سی ہو جاتی ــــ اس کی آواز کمزور ہو جاتی ــــ ــــ ماں کے قدموں کے نیچے جنّت کا تصوّر اسے دھندلا سا محسوس ہوتا۔ اور پھر فیصلہ کے بغیر ہی دونوں مختلف راہوں پر مڑ جاتے ــــ

اس نے کتنا غلط سوچا تھا ــــ کہ ننھا راحت شیو بن کر اس کی زندگی کا سارا زہر پی جائے گا ــــ اور پھر سمندر شانت ہو جائے گا ــــ لیکن ــــ لیکن ــــ ایسا نہیں ہو سکا تھا ــــ اور آخر کار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ــــ جڑتے جڑتے ان کے درمیان پہاڑ بن گئے تھے ــــ اُونچے ناقابلِ تسخیر ــــ اور پھر ــــ راہیں الگ ہو گئیں ــــ یہی فیصلہ کیا تھا دونوں نے ــــ غلط ــــ یا ــــ صحیح ــــ

وہ کالج میں پڑھانے لگی تھی ــــ زندگی کے اُفق پر ننھا سا ستارہ جگمگا رہا تھا ــــ جس کی مدھم روشنی میں شرابور ــــ وہ آگے بڑھ رہی تھی ــــ اس سفر میں کئی لہریں ــــ گرم گرم لہریں ــــ اس کے بہت نزدیک سے گزریں ــــ لیکن اس کے سینہ میں بل کھاتی ہوئی ممتا کی لہر نے سب کو نگل لیا تھا ــــ

ہاتھ راحت پر رینگ گیا ــــ میرا بچہ ــــ میرا راحت ــــ آج

پانچ سال کا ہو گیا ___ کاش ایسا نہ ہُوا ہوتا ___ راحت پانچ سال کا ہو گیا تو ___ حق اور انصاف نے یہ فیصلہ کیا ___؟ ازل سے لے کر آج تک کے سارے انصاف ___ پُرزہ پُرزہ کر کے بکھیر دیئے ___ اور ان میں آگ لگا دی ___ ممتا کا گلا گھونٹ دینے کا حکم سُنا دیا گیا ___

یہی قانون تھا ___ یہی انصاف تھا ___ راحت ___ ماں کی نہیں باپ کی امانت ہے ___ بلکہ باپ کی جائیداد ہے ___ اس باپ کی جس کو راحت نے ہوش سنبھالنے پر دیکھا بھی نہیں تھا ___ جس کو اس نے سوتے سوتے کبھی نہیں پُکارا تھا ___ جس کی بُھوک میں نے اپنے خُون سے مٹائی تھی ___ جس کے رونے کی آواز سے شوکت کی نیند خراب ہوتی ___ اور مجھے دُوسرے کمرے میں لے جانا پڑتا ___ اور ___ اور آج انصاف ہو گیا۔

شوکت ___ !تم کو انصاف مل گیا ہے ___ مجھے تُم سے کچھ نہیں کہنا ___ سوائے اس کے کہ درد کے جس طوفان سے گزر کر میں نے راحت کو پایا تھا ___ اس کی صرف ایک لہر ___ ایک بار بھی ___ اگر تمھارے قریب سے گزر جائے ___ تو ___ ایک کیا ___ تم کئی راحت سمندر میں پھینک دو گے شوکت ___ ! میں جانتی ہوں ___ بلکہ ہر ماں جانتی ہے ___ بس ___ مجھے کچھ نہیں کہنا ___ کچھ نہیں کہنا ___

۱۹۷۴ء

آموختہ

میں بہت تھک چکی ___ یادوں کو کہاں دفن کر دوں ___ ایک ایک سطر ___ چمکتی پیشانیاں ___ حرفوں کے دائروں میں کھوئی کھوئی آنکھیں۔ مجھے سب ازبر یاد ہے ___ پھر بھی میں ان بند کتابوں میں بھٹکتی رہتی ہوں ___ میں ان کو کھولنا چاہتی ہوں ___ کتابوں کے انبار ریکوں میں سجے ہیں ___ میری آنکھیں ترس رہی ہیں ___ میری اُنگلیاں ان کے صفحوں کے لمس کے پیاس سے تڑپ رہی ہیں ___ قطار در قطار کتابوں کے اژدھم لگے ہیں ___ اور ریک پر ریک ___ جن میں بہت سی میرے حافظ پر یوں نمایاں ہیں ___ جیسے آنکھوں کی روشنی ___ ان روشنی کی کرنوں نے جال بن رکھا ہے ___ اور میرا ذہن مشین کے پہیے میں اٹکا ہوا چکر کاٹ رہا ہے ___ میں کتاب پکڑنے کو ہاتھ بڑھاتی ہوں ___ میں کتاب کھولنا چاہتی ہوں ___ لیکن ہاتھ ہوا میں لہرا لہرا کر تھک چکے ہیں ___ شانے شل ہو کر نیچے لٹکنے لگے ہیں ___ اور اپنی ناکامی کا جھنڈا سرنگوں کئے میرے سامنے شرمندہ ہیں ___ میرے ہاتھ میرے تابع ضرور ہیں، لیکن میرا حکم بجا لانے کی طاقت نہیں رکھتے ___

میرے حکم کے احترام میں، کتابوں پر سرکتا ہوا ہاتھ کسی کتاب کو دبوچ بھی لیتا ___ لیکن ___ کوشش کے باوجود ___ کتاب کھل نہ سکتی۔

ـــــ اور شانے جھول کرنا کامیوں کے کنوئیں میں غرق ہو جاتے ـــــ اور کتابیں اپنی جگہ ریک میں بلا کسی جنبش کے سجی رہتیں ـــــ

اُف ـــــ کتنی کتابیں سجی ہیں ـــــ اور کتنے تلخ و شیریں تجربوں سے مرصّع ہیں ـــــ میں رازدار ہوں ـــــ مجھے سب معلوم ہے ـــــ ان میں سے بعض کی سطر سطر مجھے یاد ہے ـــــ اس کا لمس یاد ہے ـــــ اس کی محبّت میں بسی بھینی بھینی مہک یاد ہے ـــــ تب اسے زندگی کا نام دیا گیا تھا ـــــ گرم گرم گوشت پوست کا ہیولا۔ رشتوں کے تانے بانے ـــــ خواہشوں کے رنگ سے سجی ـــــ اور پیار کی شعاعوں سے منوّر ـــــ لیکن ـــــ کس نے اچانک بند کر دیا تھا۔ اِن کو ـــــ ایکؔ ـــــ دُوؔ ـــــ تینّ ـــــ کتنی بے دَردی سے اور کتنی مجلّد کتابیں بند ریک میں جڑی ہوئی تھیں ـــــ کاش ان جانی پہچانی کتابوں میں سے ایک میں اپنے ہاتھوں میں تھام کر آنکھوں سے مس کرتی اور پھر ـــــ کھول کر ایک ایک ورق ـــــ جو مجھے حفظ تھا ـــــ پھر سے انگلی رکھ رکھ کر آموختہ دوہراتی ـــــ لیکن ـــــ لیکن ان موٹی موٹی ـــــ کتابوں میں ـــــ کتنی ہی محبوبائیں ـــــ کتنی ہی ممتائیں ـــــ کتنے ہی سہاگ ـــــ اور کتنے ہی متبرک رشتے بند تھے ـــــ کہیں تاریخ کا سکشن منظر آجائے تو ـــــ تو میں جلدی جلدی ـــــ بدھ ـــــ موریہ ـــــ قاسم ـــــ مغل ـــــ پلاسی ـــــ لکھنؤ ـــــ بہادر شاہ ظفر ـــــ رضیہ سلطان ـــــ رانی جھانسی ـــــ جواہر لال ـــــ اُف ـــــ سب گڑبڑ ہو گیا ـــــ ذہن کہیں ٹھہرتا ہی نہیں ـــــ

ہاں تو مجھے ان اونچی اونچی ریک میں چنی کتابوں میں سے دو تین، چار یا صرف ایک پالینی ہے ـــــ سیدھی سادی ـــــ صوفیوں جیسی زندگی کی کتاب ـــــ میری انگلیاں بے تاب ـــــ تڑپ تڑپ کر جلدوں پر پھسل رہی ہیں ـــــ میرے بازو شل ہوتے محسوس ہو رہے ہیں ـــــ اور ـــــ انگلیاں بھی بے جان سی لگ رہی ہیں ـــــ وہ سوکھ کر کھپچیاں سی لگنے لگی ہیں ـــــ متعدد بار ناکامی کی چوٹ سہہ سہہ کر ان کے ناخن بھی جھڑ چکے ہیں ـــــ کئی بار تو کتابیں ہاتھ میں آ بھی گئیں ـــــ لیکن سنبھل نہ سکیں۔

___ بڑی آسانی سے تڑپتی ہُوئی مچھلی کے مانند پھسل کر پھر ریک میں جڑ گئی تھیں ___ بھلا ان کے کھولنے کا کیا سوال پیدا ہوتا۔

ویسے بھی میں کچھ اُونچی باتیں سوچنے لگی تھی ___ اب میں نے عہدِ موریہ ___ گپتا کال ___ مغلیہ عہد ___ رانی جھانسی ___ سب جھمیلوں سے آزاد ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے ___ مجھے تو بس دو ہی تین کتابیں چاہئیں، جنھیں میں اپنے ماتھے سے لگا کر، آنسوؤں سے نہلا کر خوب پیار کر سکوں، لیکن اب مجھے اپنی ہار کا شدید احساس ہو رہا تھا ___ اور میں کھسیا کھسیا کر سوچنے لگی ___ میں ہاری نہیں ___ میں ہاری نہیں ___ بس ذرا تھک گئی ہوں۔ تازہ دم ہو کر پھر اپنے کام میں لگ جاؤں گی ___ میں نے تا حدِ نظر پھیلے ہُوئے ریک کے پشتوں پر نظر ڈالی ___ میری جانی پہچانی کتابیں صاف نظر آ رہی تھیں ___ پھر انگلیاں کتابوں پر سرکنے لگیں ___ ذہن پر ایک گلابی سی لہر اُبھری۔ اور پھر یادوں کی بہت سی سُرخ سُرخ کونپلیں پھُوٹ پڑیں ___ میرے وجود میں جھرجھری سی دوڑ گئی ___ کتابیں جن کو میں کھولنا چاہتی تھی ___ میرے ہاتھوں کی زد میں تھیں ___ اور شانوں میں کافی طاقت تھی ___ لیکن ___ لیکن ___ خوف زدہ بے آواز چیخوں کی طرح ___ ان کا وجود بھی مبہم سا محسوس ہونے لگا ___ اور میرا وجود برف کی سِل میں مُنتقل ہو گیا ___ جن کے اندر یادوں کے چند بُلبُلے جم چکے تھے ___ بے جان سے بُلبُلے۔

اف ___! یہ کتابیں کس نے بند کر کے یُوں سجا دی ہیں ___ بالکل آنکھوں کے سامنے ___ میں نے پھر اپنے وجود کے دھوئیں کو شکل دینا چاہی تاکہ میں ان کتابوں کو کھول سکوں ___ آخر یہ کتابیں ایسے کیوں سجی ہیں ___ اور اگر سجی ہی تھیں ___ تو آخر اور لوگ بھی تو ہیں ___ کسی نے ان کو چھیڑنے کو ہاتھ کیوں نہیں بڑھائے ___ کیا لوگوں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے ___ سچ ہے سوچنے کا وقت ہی کہاں رہا ___ موٹریں تو تیز رفتار تھیں ہی ___ ہوائی جہاز آ گئے ___ پھر جیٹ آ گئے ___ اور پھر ___ اِسپتنک کے دھماکے ___ سب آوازوں کے جنگل میں بھٹکنے لگے۔

اور میں ـــــ میں ان چیخوں سے بُرے پھر انھیں ریک کے قریب آ گئی ـــــ جو حدِ نظر تک قطار در قطار سجے تھے ـــــ اور ـــــ وقتاً فوقتاً موٹی پتلی ـــــ چھوٹی بڑی کتابوں کے اضافے دہلا دہلا دیتے تھے ـــــ یہ خوب صورت بند کتابیں جب کھلی تھیں تو نہ جانے کتنی تلخ و شیریں کہانیوں کا وجود بنتا اور مٹتا رہا تھا ـــــ

میری انگلیاں ایک سنہری پشتے والی کتاب پر سَرکنے لگیں ـــــ انگلیاں سنبھل سنبھل کر مضبوطی سے اسے پکڑنا چاہتی تھیں ـــــ اور سوچوں کے سمندر میں طوفان ہچکولے لے رہا تھا ـــــ لیکن دماغ ساکن تھا ـــــ شاید مسلسل ناکامیوں نے ـــــ ناکامی کی اُمید کو اٹوٹ کر دیا تھا ـــــ پھر بھی میں ان لامحدود تا حدِ نظر پھیلے ہوئے کتابوں کے ریک میں سے کم سے کم دو ایک کتابیں تو ضرور دیکھنا چاہتی تھی ـــــ چاہے وہ سنہری جلد والی نہ ہو کر کالی، کھردری جلد والی ہی کتاب کیوں نہ ہو ـــــ بہت پرانی خستہ سہی ہی سہی ـــــ اب یقین پھر پختہ ہونے لگا تھا کہ میں کتاب ضرور کھول سکتی ہوں ـــــ یہ میری اپنی بالکل اپنی کتابیں تھیں ـــــ پھر اس بے دردی سے جدا کر دی گئیں کہ ہاتھ آ کر بھی ـــــ کھولنے سے مجبور ہُوں ـــــ میں نے ایک کتاب جلدی سے دبوچ لی ـــــ لیکن ورق پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر جلدی جلدی اُڑنے لگے ـــــ نظریں ان کی جنبش پر ناچ رہی تھیں ـــــ یا خدا ذرا ورق ٹھہریں تو ایک صفحہ ـــــ یا صرف ایک سطر ہی میں نظر بھر کر دیکھ تو لوں۔ لیکن ہوا کو کیا کہوں ـــــ پھڑ پھڑ کی آواز کانوں کے پردوں سے ٹکراتی رہی ـــــ اور سُوکھی ہُوئی کھپچی جیسی انگلیاں جن میں کافی پھُرتی تھی ـــــ بار بار پھڑ پھڑاتے پنّوں کے بیچ جلدی جلدی اِدھر اُدھر دوڑتی رہیں ـــــ اور ساری رات گزر گئی ـــــ میں ایک سطر بھی نظر بھر کر نہ دیکھ سکی ـــــ شکست کی کربناک حقیقت کے سامنے سر جھکا چکا تھا ـــــ کاندھے شل ہو ہو کر جھُولنے لگے تھے ـــــ اور بندر جیسی پتلی، پھُرتیلی انگلیاں بے جان ہو کر آہنوں کی کھپچیاں بن چکی تھیں ـــــ

میری نظریں اب بھی ریک پر سجی خوب صورت کتابوں پر جمی تھیں۔
وقت کا لامتناہی سلسلہ صدیوں سے سجے اس ریک میں آج تک اضافہ ہی کرتا آیا ہے ـــــ کبھی کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ایک کتاب ہی اس میں سے نکال کر کھولتا ـــــ دیکھتا ـــــ پڑھتا ـــــ پڑھی ہوئی کہانی ـــــ دیکھی ہوئی سطریں ـــــ اُف مجھے کیا ہو گیا ہے ـــــ سوتے جاگتے ـــــ یہ ریک مجھے ATRACT کرتے ہیں ـــــ اور میں خلاؤں میں اپنے بے طاقت بازوؤں کو لہرا کر بار بار ہار جاتی ہوں ـــــ اور پھر اس مالک کے بارے میں سوچنے لگتی ہوں ـــــ جو مطلق العنان ہے ـــــ کیسا ظالم ہے ـــــ کتنی راتیں جاگی ہیں ـــــ کتنے تکیے بھگوئے ہیں ـــــ اور کتنے دن گزارے ہیں میں نے ان کی تلاش میں ـــــ ان میں بہت سی میری اپنی ہیں ـــــ بالکل میری ـــــ مجھ سے قسم لے لو ـــــ لیکن اب یہ کس کے جارحانہ قبضہ میں ہیں کہ ایک صفحہ کھول کر دیکھنا بھی محال ہے ـــــ

میں تھک چکی ہوں ـــــ بہت تھک چکی ہوں ـــــ میرے قدم بے جان ہو چکے ہیں ـــــ میرے بازو شل ہو کر نیچے لٹک گئے ہیں ـــــ کاش ـــــ کاش ان میں سے کچھ کتابیں ـــــ یا صرف ایک ہی کتاب میرے ہاتھ لگ جاتی ـــــ میں اس کی سطر سطر کا آموختہ پڑھتی ـــــ آنکھوں سے لگاتی ـــــ چومتی چاٹتی ـــــ اور پھر میرے بازو مفلوج ہو جاتے ـــــ ناکامی کے احساس نے اور شکست کی ٹھوکروں نے میرے حلق کو تیروں سے چھید کر رکھ دیا تھا ـــــ میرے ہونٹوں کو بانجھ چٹانوں کی طرح خشک کر دیا تھا ـــــ اور سامنے تا حدِ نظر پھیلے ہوئے ریک پر گرد آلود کتابیں چھپاں تھیں ـــــ ان کے پشتے بھی دھندلے نظر آ رہے تھے ـــــ کئی زندگیوں کی طاقت صرف کر کے بھی شکست ہی میرے ہاتھ لگی تھی ـــــ ایک صفحہ بھی کھول سکنا ناممکن تھا ـــــ جن میں کتنے ہی تلخ و شیریں رشتوں کے اُلجھے اُلجھے ریشمی دھاگے سمٹے ہوئے تھے ـــــ میں نے پہلے سے کسی کتاب کو نام سے اُٹھانا نہیں چاہا تھا ـــــ نام تو میں خود ہی دے دیتی ـــــ شکایت تو یہ ہے کہ بتدریج ہو گئی اپنی ہی کتابوں سے میں کتنی دور تھی ـــــ مجھے ایک

ایک سطر یاد ہے ___ لیکن میں آموختہ نہیں دوہرا سکی ___ اور اب ___ میرا وجود پگھلنے لگا ہے ___ میں ہار چکی ہُوں ___ ہار چکی ہُوں ___ میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں ___ اور ___ جسم اکڑ رہا ہے ___ اور ___ اور ___ شاید ریک میں ایک کتاب کا اضافہ ہونے والا ہے ___ کبھی نہ کھلنے کے لئے ___

جون ۱۹۸۳ء

ممتا کا کرب

آج کے اس حادثہ نے سارے محلے کو ہلا کر رکھ دیا تھا ــــ اور اُسے ــــ اسے تو بالکل مفلوج بلکہ بے جان کر دیا تھا ــــ اس کی شوخی ــــ اس کی چنچلتا ــــ ناز نخرے، سب اس سے اتنی دُور ہو گئے تھے ــــ جیسے اِس سے ان کا کوئی رشتہ ہی نہ ہو ــــ وہ پتّھر کی مورتی کی طرح بے حِس تھی ــــ اس کی موٹی موٹی سفید آنکھیں جیسے ساکت ہو گئی تھیں ــــ گوتم بُدھ جیسے ترشے ہُوئے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے ایسے چپکے تھے جیسے بُت تراش کی ایک آدھ چھینی لگنی رہ گئی ہو ــــ اور وہ دونوں ہونٹوں کے دَرمیان گہری لائن ڈالنا بُھول گیا ہو ــــ ویسے تو وہ ہمیشہ گلابی گلابی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن آج وہ سنگ مرمر کی ایسی مورتی دکھائی دے رہی تھی جسے دودھ سے نہلا دیا گیا ہو ــــ

بہت سی چھوٹی چھوٹی سفید برجیوں کے درمیان بڑی مشکل سے وہ دکھائی دی تھی ــــ سیکڑوں جوتے اور سینڈل گیٹ سے لے سیڑھیوں سے ہوتے ہُوئے برآمدے تک بکھرے پڑے تھے ــــ کچھ اُلٹے پُلٹے ــــ کچھ مَسلے مَسلے ــــ کچھ باقاعدہ جوڑے کے ساتھ کنارے دیوار سے لگے ــــ اور کوئی اپنے جوڑے سے بچھڑ کر ایک برآمدے کے زینہ پر اور دوسرا پانی کے ہیٹر والے لوہے کے ڈبّے کے نیچے ــــ

میرے قدم سو سو من کے ہو رہے تھے ___ لیکن کسی نہ کسی طرح ___ مجھے گیٹ پار کر کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر پھر اندر لمبے چوڑے والے ڈرائنگ رُوم میں تو پہنچنا ہی تھا ___ جہاں وہ ___ چیخیں مار رہی ہوگی ___ میں نے کچھ سسکیاں سُنیں ___ پھر پتہ نہیں کیسے اپنے بوجھ کو ڈھو کر ڈرائنگ روم کے دروازے کے کنارے کھڑی ہو گئی ___ سفید برجیوں کے جنگل میں کئی طرف سے سسکیاں سُنائی دیں ___ لیکن دھاڑیں مارتی ہُوئی وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی ___ آنسو ان تمام برجیوں کو بار بار دھندلا کر دیتے اور میں جلدی سے ان کو صاف کر لیتی ___ پھر ایک لرزتا ہُوا سفید ہیولا ایک نازک سی برجی سے ٹکرا گیا ___ اور چاروں طرف سسکیوں کی آواز تیز ہو گئی ___ میں نے دیکھا ___ سفید جالی کا دوپٹہ اس کے چاروں طرف لپٹا ہُوا تھا ___ مَیں بھی ایک کونے میں بیٹھ گئی ___ سب ہی سر جھکائے آنسو پوچھ رہی تھیں۔ ___ اور ___ وہ ___ اس نے تو شاید اپنے جسم کی ساری نمی ___ لُٹا دی تھی ___ اور ___ اب ___ اب چٹان کی طرح ساکت تھی ___ یا پھر کہیں کچھ کھو جنے ___ دُور ___ بہت دُور بھٹک رہی تھیں ___ اور تمام آنے والے اس ساکت پتھر کی چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے غموں کا اظہار کر رہے تھے ___ ایکسیڈنٹ ___ ایکسیڈنٹ کی بہت مدھم آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں ___ لیکن یہ آوازیں دُور سے آ رہی تھیں ___ بہت دُور سے ___ اسے کیا معلوم کہ اسے کب اور کس نے سفید دوپٹہ میں لپیٹ دیا تھا ___

اور میں نے محسوس کیا کہ ایک خوب صُورت نازک سی لڑکی کالا غرارہ ___ سفید قمیص ___ اور سفید دوپٹہ کندھوں سے لٹکائے جھپک جھپک سامنے سے آ رہی تھی ___ میرے قدم برآمدے میں ہی رُک گئے ___ پھر میں جلدی سے لان میں نکل آئی ___ شاید یہ لوگ لکھنؤ کے ہیں ___ وہ میرے لان کے برابر والی سڑک سے اُڑتی ہُوئی آگے نکل گئی ___ میری آنکھیں اس کا تعاقب اب پُشت سے کر رہی تھیں ___ پُوری پیٹھ پر پھیلے ہوئے کمر تک لٹکتے بال اور دونوں طرف لٹکتے ہُوئے دوپٹے کے سفید سرے ___

میں مبہوت سی کھڑی تھی ___ تین چار کوٹھیاں چھوڑ کر وہ ایک کوٹھی میں داخل ہو گئی ___ یہ سوچ کر کہ یہ خوب صورت لڑکی لکھنؤ کی ہو سکتی ہے ___ اور میرے مکان سے اتنے قریب رہتی ہے، میں بہت خوش ہوئی ___ ہو سکتا ہے کوئی جاننے والا ہی خاندان نکل آئے ___ اگر نہ بھی نکلے جاننے والا تو کیا ہوا۔ اتنے قریب رہتے ہیں ___ ملیں گے تو کم سے کم حضرت گنج، یونیورسٹی، اور .... امین آباد کا ذکر ہی ہو گا ___ یہ سوچ کر میں مسکرا دی۔

"بھابی جی ___! ایک بات بتاؤں ___" میں نے ہنستے ہوئے مسز گرد یال سے کہا ___ "یہ ہلوگوں کی دوستی کی جڑ جو ہے ___ اسے میں نوشابہ کہوں۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں ___ ہم لوگ جاڑوں کی نرم دھوپ میں چائے کی پیالیاں تھامے گپیں مار رہے تھے ___ میں نے منی کی طرف اشارہ کیا۔ اُس کی سب اَدائیں پتہ نہیں کیوں مجھے پنجابی سے زیادہ لکھنوی لگتی ہیں۔ بالکل بیگموں والی نزاکت ہے، اس میں۔" پاس کھڑی منی بھی ہنس دی ___ اور گہری گہری آنکھوں سے میری طرف دیکھا ___ نیلی جھیلوں میں دُور دُور تک پاکیزگی کا سایہ تھا ___

مسز گردیال قہقہہ مار کر ہنس دیں ___ "ادائیں کیا ___ بڑی بگڑی ہوئی ہے ___ سب سے چھوٹی ہے نا ___ اس لئے خوب نخرے اٹھواتی ہے ___ ڈیڈی کی بھی بہت لاڈلی ہے ___ اور بھیا کی بھی ___"

میں نے ٹکڑا جوڑ دیا ___ "اور آج سے آنٹی کی بھی۔"

یہ لوگ پہاڑ پر کہیں تجارت کرتے تھے ___ اس لئے صرف سردیاں گزارنے اپنی کوٹھی میں آتے تھے ___ یوں زیادہ تر کوٹھی کا اگلا حصہ خالی ہی رہتا تھا ___ جاڑوں میں خاص چہل پہل ہو جاتی تھی ___ کئی برس گزر گئے ___ لیکن، منی اب بھی بھولی بھالی معصوم بچہ سی ہی نظر آتی تھی ___

میں نے کارڈ میز سے اُٹھا کر پڑھا ___ منجیت کور ___ کون ___؟ دماغ پر زور ڈالا ___ منجیت کور کی شادی ___ کوٹھی کا نمبر بھی دھیان میں نہیں

تھا ___ نوکر نے بتایا کوٹھی والی بی بی جی دے گئی تھیں ___ اوہ ___ منی کی شادی ___

مسز گردیال کو میں نے شام کو زوردار مبارکباد دی ___ "مسز گردیال دولھا آپ نے جوڑ کا ڈھونڈا ہے؟ ___ بڑی مشکل پڑی ہو گی ___" مسز گردیال ہمیشہ کی طرح ہنس دیں ___ "دیکھ لینا ___ پسند آئے گا مُنڈا!"

اور میں واقعی حیرت میں رہ گئی ___ خدا نے یہ جوڑا اپنے ہاتھ سے بنایا تھا ___ گردوارے کی مقدس زمین اور پاک فضا میں شبد بولے جا رہے تھے ___

نور کی بارش ہو رہی تھی ___ سنہری شیروانی ___ دمکتے ماتھے پر سُنہری پگڑی، اس پر قیمتی کلغی ___ چوڑی دار پاجامہ ___ اور کمر سے لٹکتی ہوئی تلوار ___ جیسے کسی مصوّر نے کوئی شاہکار مکمّل کیا ہو ___ منی بھی سنہرے گھاگھرے چولی اور سنہرے دوپٹہ کے ساتھ دلھن بنی جیسے سچ مچ سنہری پری گردوارے ماتھا ٹیکنے آ گئی ہو ___ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل رہی تھی ___ اس کی گھبرائی گھبرائی آنکھیں ہرنی کی طرح بھٹک رہی تھیں ___ سب نے ہی اس نئے جوڑے کو آشیرواد دی، اور مسٹر اور مسز گردیال نے یہ آخری فرض بڑے دھوم دھام سے پُورا کیا۔

اب منی بہت کم نظر آتی ___ لیکن جب بھی آتی ایک آدھ بار مُلاقات ہو جاتی ___ پھر اچانک اطلاع ملی کہ گردیال سنگھ اور مسز گردیال ایک حادثہ میں ختم ہو گئے ___ بڑی تکلیف دہ خبر تھی ___ پھر پریتم نے منی اور اسکے شوہر کو کوٹھی میں ہی رہنے کو کہا ___ کوٹھی آباد ہو گئی ___ اب جاڑے اور گرمی کا فرق اس کوٹھی پر زیادہ اثر انداز نہ ہوتا ___ آٹھ مہینے بند رہنے والے دروازے اب ہر وقت کھُلے رہتے ___ گھر سے باہر تک نوکر چاکر، رشتہ دار اور دوستوں کے جمگھٹے لگے رہتے ___ پہلے ایک ___ پھر دُوسری ___ دو گڑیاں بھی لان میں کھیلنے لگیں ___ کبھی راستے میں مل جاتی ___ تو ___ منی کو

ممّی نے دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ـــــ اور وہ بھی کوئی نہ کوئی سوال ضرور کرتی ـــــ "آنٹی کون سا اسکول اچھا رہے گا ـــــ آنٹی بڑی ناٹی ہیں دونوں ـــــ" وہ دونوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ـــــ جو کبھی بغیر آیا کے ـــــ پوری نہ ہوتی ـ اور میں سوچتی کہ اتنی بھولی ہے کہ خود کو تو سنبھال نہیں پاتی ـــــ ہر وقت لڑکیوں کے پڑھنے اور داخلہ کی ہی بات کرتی ہے ـــــ بڑی فکر سے کہتی ـــــ "داخلہ کا کیا کروں گی ـــــ آنٹی پیسے دے کر کرا دوگی داخلہ ـــــ" اور میں تسلی دیتی "وقت آنے دو ـــــ سب ہو جائے گا ـــــ ابھی تو یہی نرسری اسکول ٹھیک ہے ـ"

پھر ـــــ اس کی موٹی موٹی آنکھیں دہی کی دو کٹوریاں بن گئی تھیں ـــــ جمی جمی سی ـــــ بے جان ـــــ کبھی کبھی اِدھر اُدھر لڑھک جانے والی ـــــ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم گئیں ـــــ

بھیا گزبجن اس کو بڑے پیار سے تھپک کر سمجھا رہے تھے ـــــ "لڑکا ہوتا تب بھی کٹ جاتی ـــــ تو کیسے پالے گی ـــــ منی تو تو خود ـــــ" اور وہ ویرا میرا ویرا کہہ کر رو دی تھی ـــــ

اس نے کاغذ کے دو ٹکڑوں پر دستخط کر دیئے تھے ـــــ ایک کاغذ اس کے جیٹھ نے لے لیا ـــــ دوسرا اس کے بھیا نے ـــــ اس کے کلیجے کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے ـــــ اس کے اندر سے کچھ اچک کر اس کے حلق میں اٹک گیا تھا ـــــ اس کی آنکھیں باہر کو آنے لگی تھیں ـــــ اس کے کانوں میں طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا ـــــ اور اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے ـــــ اس کے بھیا نے اس کے دونوں ہاتھ خالی کر دیئے تھے ـــــ تاکہ ہتھیلیوں پر مہندی رکھنے میں آسانی ہو جائے ـــــ لیکن اس کی ہتھیلیوں پر انگارے سُلگ رہے تھے لوگوں نے اس کے بھلے کے لئے اس کی ممتا کا گلا گھونٹ دیا تھا ـــــ وہ آنچل میں ممتا سنبھالے ہوئے ماں تھی ـــــ لیکن ـــــ اب ـــــ اب اس نے ماں کے لفظ کو دان کر دیا تھا ـــــ اف ـــــ ! یہ کتنا بڑا مذاق تھا ـــــ دان کرنے والا خود محتاج ہو گیا تھا ـــــ

پہلی بار جب رنجنا نے اسے آنٹی کہا تو اس کے تالو سے زبان چپک

گئی ـــــ اور اس کے کانوں سے شعلے اُبل پڑے تھے ـــــ وہ کانپ گئی ـــــ
اس کی ممتا نے اس کا گلا دبوچ لیا ـــــ اتنی بڑی گالی ـــــ یہ تو نے کیا کیا ـــــ
یہ تو نے کیا کیا ـــــ پھر بیتا نے بھی توتلی زبان سے ماں کو ممی اور اس کو
بوا کہہ دیا ـــــ وہ اور گہرے کنوئیں میں اُترتی چلی گئی ـــــ اس کے چاروں
طرف کانٹے دار جھاڑیاں اگ آئیں ـــــ اور حصار تنگ ہونے لگا ـــــ اس کا
سارا جسم لہولہان ہو گیا ـــــ وہ پاگلوں کی طرح بھٹکنے لگی ـــــ اسے لوگوں
نے ایب نارمل کہنا شروع کر دیا ـــــ پھر اس نے اپنے آپ کو ادھر اُدھر لگایا۔
لیکن تنہائی کے ناگ ڈسنے لگے ـــــ بھیا نے گھر بسانے کی کوشش کی ـــــ لیکن
وہ بھی ناکام ـــــ اس کے سامنے مختلف شکلوں میں ممتا بار بار ایک سوال دُہراتی.
یہ تو نے کیا کیا ـــــ ؟ یہ تو نے کیا کیا ـــــ ؟ وہ اکثر تنہائیوں میں رو پڑتی ـــــ
میں نے ـــــ میں نے کچھ نہیں کیا ـــــ میری رنجنا ـــــ میری بیتا ـــــ کوئی
واپس کر دے ـــــ وہ تو سب ویرا نے کیا تھا ـــــ کوئی مجھ سے کہہ دے وہ سب
جھوٹ تھا ـــــ میں کبھی نہیں گئی تھی کورٹ ـــــ میں نے کوئی دستخط نہیں
کئے تھے ـــــ کاش میں لکھنا بھول گئی ہوتی ـــــ کاش ـــــ میں اپنا نام
بھول گئی ہوتی ـــــ

کاش ـــــ بھیا مجھ سے پیار نہ کرتے ـــــ میں اپنی بیٹیوں کی ماں بنی
رہتی ـــــ ماں تو رہتی ـــــ بھابی کبھی کبھی جھڑک دیتیں ـــــ تو بیتا کو خراب
کر دے گی ـــــ وہ خالی خالی آنکھوں سے بھابی کو دیکھتی ـــــ اور کلیجہ کی ٹیسوں
کو برداشت کر لیتی ـــــ بھیا کہتا ـــــ ہر وقت بیتا کو پاس نہ آنے دیا کر ـــــ ایک
ہاتھ سے پکڑ کر اس کے پاس سے گھسیٹ لے جاتا ـــــ اور اس کے پیٹ کے
اندر کا وہ حصہ جس میں بیتا پلی تھی ـــــ باہر آنے کو پھڑک اُٹھتا ـــــ اس کے
روئیں روئیں میں درد کے کانٹے اُبھر آتے ـــــ اور ـــــ وہ سارا زہر پی لیتی۔
لوگ کہتے ـــــ اسے کوئی احساس نہیں ـــــ خوش ہے لڑکیاں
بانٹ کر ـــــ کوئی کہتا ـــــ بے وقوف جو ہے ـــــ کوئی کہتا ـــــ دولت سے
کیا ہوتا، بچوں کا پالنا بہت مشکل ہے ـــــ لڑکا ہوتا تب بھی ٹھیک تھا ـــــ

لڑکیوں کا پالنا ـــــ بڑا کلیجہ ہونا چاہیئے ـــــ اور وہ سب کا منھ تکتی ـــــ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں ـــــ کیا میں ماں نہیں ہوں ـــــ ماں نہیں ہوں۔

آج وہ بستر پر تڑپ رہی تھی ـــــ اس کے پاس بے پناہ دولت تھی ـــــ زیور تھے ـــــ کپڑے تھے ـــــ لیکن رنجنا کی درد بھری آواز اُسے چین نہیں لینے دے رہی تھی ـــــ آج ـــــ آج شام کو جب وہ اپنے جیٹھ کے گھر سے آئی تھی۔ رنجنا اس کے ساتھ آنا چاہ رہی تھی ـــــ آنٹی ـــــ مجھے اپنے ساتھ لیتی چلو ـــــ آج کے لئے ـــــ ممی سے پوچھ لو آنٹی ـــــ میں تمھارے ساتھ چلوں گی ـــــ تمھارے گھر ـــــ وہی والے ڈیڈی کے گھر ـــــ آنٹی، میں وہاں تم کو ممی کہوں گی ـــــ ماسی سے ببیتا کو مانگوں گی ـــــ وہ میری بہن ہے نا۔ ممی ـــــ اور دور سے آتی نئی ممی کی آواز نے رنجنا کا جیسے گلا گھونٹ دیا ـــــ "رنجنا بٹیا ـــــ بڑی بات ـــــ آنٹی سے دھیرے دھیرے بات نہیں کرتے ـــــ" منی ڈبل بیڈ پر کروٹیں بدل رہی تھی ایک طرف ببیتا اور دوسری طرف رنجنا کو پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ـــــ اس کا سر بار بار تکیہ پر اِدھر اُدھر بے چینی سے لڑھک رہا تھا ـــــ

۱۹۸۲ء

دو آدھے

میرے راکھے ایکو آپ ــــ مانُو کے کچھ ناہیں ہاتھ

پانچویں گرو ارجن جی کی یہ بانی بے بے جی نے اس کے کیس سلجھاتے ہوئے بہت بار دُہرائی تھی ــــ اور سُنتے سُنتے وہ بھی ایسا ہی سوچنے لگا تھا ــــ کہ سب کچھ بھگوان کی مرضی سے ہوتا ہے ــــ جب بھی کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو وہ بڑی معصومیت سے اپنی گردن اونچی کر کے اوپر کو دیکھنے لگتا ــ کیوں کہ بھگوان اُوپر رہتا ہے ــــ اور پھر نیلے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جب کوئی کالی سی ٹکلی ڈولتی نظر آتی تو وہ سمجھ لیتا ــــ ہو نہ ہو بھگوان کی مرضی یہی ننھی سی ٹکلی ہے ــــ دُور سے آتی ہُوئی کہیں بھی چپک جائے گی ــــ اور وہ ڈر جاتا ــــ اس نے بہت بار رنبیر سے اس بات پر جھگڑا بھی کر لیا تھا ــــ رنبیر کہتا ــــ "چال ــــ یہ تو چیل ہے چیل ــــ بھگوان کی مرضی کہیں ایسی ہوتی ہے ــــ؟ بابا تو کہتا ہے ......" اور سکھبیر بابا کی بات اَن سُنی کر کے لٹّو کی ڈوری کھینچ لیتا اور لٹّو زمین پر گھومنے لگتا ــــ لٹّو کو گھومتے دیکھ رنبیر بھی ــــ بابا کی بات بتائے بنا ــــ جلدی جلدی اپنے لٹّو پر ڈوری لپیٹنے لگتا ــــ

اور پھر دونوں ہی اپنے ہاتھوں کے بل بوتے ہر بار جیت کا فیصلہ کرنے لگتے ــــ اکثر کھیلتے کھیلتے جھگڑ پڑتے ــــ ایک بار تو ایسے گتھم گتھا ہُوئے کہ قمیص کے دو الگ الگ حصّے کندھوں پر لٹک پڑے تھے ــــ اور سکھبیر کے کیس کھُل کر بکھر

گئے تھے ـــــ رنبیر کے گالوں اور کانوں پر سُرخ کھرونچے اُبھر آئے تھے ـــــ دونوں کی ماؤں نے ایک دُوسرے کو برچھیوں جیسی تیز نظروں سے چھید ڈالا ـــــ لیکن کیا مجال جو منھ سے آواز نکل جاتی ـــــ ابھی بے بے جی زندہ تھیں ـــــ دونوں گھروں کی مالکن ـــــ

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ دو ننھے ننھے بچّوں کی نازک سی نوجوان بیوہ ماں وقت کی آگ پر تپ کر کندن بن جائے گی ـــــ پر، ہُوا ایسا ہی تھا ـــــ اور اسی کندن کو سارے گاؤں والے بے بے جی کے نام سے پکارتے تھے۔

جب پہلی باران کی گود بھری تو بُزرگوں کی بنی ریت پر انھوں نے بچّے کے کیس رکھائے تھے ـــــ اس خاندان میں یہی ہوتا آیا تھا کہ پہلا بیٹا ـــــ گرودُوں کے نام پر پانچوں ککّار دھارن کرتا ـــــ اور وہی خوشی بے بے جی نے بھی کیا تھا ـــــ اور چوں کہ شبھبیر بڑے کا بیٹا تھا۔ سو اس کے بھی کیس تھے۔

پَر، رنبیر اور شبھبیر میں فرق کوئی نہیں تھا ـــــ اکثر لوگوں کو شک ہوتا کہ دونوں جڑواں کے تو نہیں ہیں ـــــ اگر رنبیر کے کیس بڑھا دیئے جاتے یا شبھبیر کے کیس نہ ہوتے تو دونوں میں تل برابر فرق نہ رہتا ـــــ مزاج بھی دونوں کا یکساں تھا ـــــ اور پسندیں بھی ایک جیسی ـــــ دونوں سدا ہی ساتھ دیکھے جاتے تھے ـــــ

دن بھر خاک دھول اُڑا کر رات میں جب زبردستی الگ ہونا پڑتا ـــــ تو دونوں ہی اپنی اپنی کھیس میں منھ کر کے ـــــ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے اور پریوں کے دیس میں سیر کو نکل جاتے ـــــ اور دن نکلتے ہی دونوں پھر جڑ جاتے ـــــ

دونوں ساتھ ہی دیوی ماں کے درشن کو گئے تھے ـــــ اور گپھا کی مدھم روشنی میں جھل جھل کرتے موتی جیسے پانی کو ماتھے سے لگایا تھا ـــــ کہ پانی زندگی کی علامت ہے اور تمام کثافتوں کو دھو دینے کا واحد ذریعہ بھی ـــــ

سو امرتسر میں بھی دونوں نے سدا، امرت پان اکٹھا ہی کیا تھا ـــــ دونوں ایک ہی جو تھے ـــــ

دونوں کے باپ تو خیر سگے بھائی تھے ___ پر ماؤں میں بھی کبھی ایسی کھٹا پٹی نہیں ہوئی کہ آواز باہر جاتی ___ البتہ بے بے جی نے دونوں کے گھر اپنی مرضی سے الگ کر دیئے تھے ___ ایک گھر میں گیتا کا پاٹھ ہوتا ___ تو دوسرے میں شبد گو نجتے ___ لیکن نہ سکھبیر نے ان باتوں پر کان دھرے اور نہ زبیر نے ___ دونوں کو پرساد سے مطلب تھا ___ سو دونوں ___ ننھی ننھی ہتھیلیاں ایک دوسرے پر رکھ کر پرساد لے لیتے ___ ماتھے سے چھواتے اور منھ میں رکھ کر نو دو گیارہ ہو جاتے ___

آمنے سامنے بنے گھروں سے انھیں کوئی مطلب نہیں تھا ___ لیکن دونوں کے بیچ کھڑی پرانی نیم کے نیچے کی ساری زمین ان کی اپنی ملکیت تھی۔ اور دونوں ہی اس کے ساجھی تھے ___ ایسے ساجھی جیسے روح اور جسم ہو ___ سمندر اور لہریں ہوں ___ برف اور ٹھنڈک ہو ___ ان کا وجود ایک دوسرے کے بغیر مکمّل نہیں تھا ___ اسی لئے ایک دوسرے کے بغیر آدھا رہتا ___ بڑے مثال دیتے ___ جوان ہنستے ___ اور برابر والے اس جوڑی کو دیکھ کر جلتے ___

دھیرے دھیرے دونوں گبرو اونچے ہو رہے تھے ___ اور، ان کی دوستی بھی اونچی ہوتی جا رہی تھی ___ اس کی ابتدا تو اس وقت ہوئی تھی جب کپڑوں سے بے نیاز ___ ننھے ننھے ہاتھوں میں چمکیلے کڑے پہنے چوپایوں کی طرح رینگ کر دونوں ہی نیم تلے پہنچ جاتے تھے ___ اور پھر دونوں ہاتھوں سے مٹی اچھال اچھال کر کلکاریاں بھرتے ___ اور ننھی ننھی کنکریاں اور کڑوی کسیلی نمکولیاں منھ میں ڈال لیتے ___ مائیں دوڑی آتیں۔ ___ اور جلدی جلدی منھ میں انگلی ڈال کر بہتی ہوئی رال کے ساتھ نمکولیاں اور کنکریاں گھسیٹ لیتیں ___

پھر دونوں ہاتھ زمین سے اٹھ گئے تھے ___ کمر پر کچھے لٹکنے لگے تھے ___ اور ___ دو چھوٹے چھوٹے پاؤں آنگن سے باہر ___ اور ___ باہر سے نیم تلے دوڑنے لگے تھے ___ اور دونوں نیم کی جھکتی ڈالیں چھونے کو اونچے

ہوتے لگے تھے ــــ رنبیر ذرا موٹا ــــ اور سکھبیر ذرا دُبلا پتلا تھا ــــ پر، اُونچائی میں دونوں نے شرط لگا رکھی تھی ــــ دونوں اسکول بھی ساتھ جاتے تھے ــــ لیکن پڑھنے سے زیادہ پہلوانی میں جی لگتا ــــ آتی جوانی نے سب سے پہلے چوڑے چکلے سینوں کو چوما تھا ــــ اور ــــ باہوں کی مچھلیاں اُچھل پڑی تھیں ــــ گاؤں کی کنواریاں کوٹھے کی منڈیروں اور دیواروں کی آڑ سے تاک جھانک کرتیں ــــ اور ــــ دونوں کا نام لے لے کر ایک دوسرے کو چھیڑتیں ــــ تو ان کی کنپٹیاں دہک اٹھتیں ــــ ایک دوسرے کو چکوٹے نوچ کر اپنی بے تابیوں کا اظہار کرتیں ــــ اور ــــ جب کبھی آتے جاتے آمنا سامنا ہو جاتا تو موم کی طرح پگھل جاتیں ــــ ان کی ٹانگوں کا دم نکل جاتا ــــ اور وہ سُن سُن کرنے لگتیں۔ اور بلّیوں اُچھلتا دِل حلق میں اٹک جاتا۔

پھر رنبیر کی موسی شہر سے آئی ــــ اور ــــ سب کچھ تتر بتر ہو گیا ــــ وہ رنبیر کو اپنے ساتھ لے جا رہی تھی ــــ جوڑی ٹوٹنے کا غم بچھڑنے والوں کو جو ہوا سو ہوا ــــ پر، گاؤں میں جیسے سناٹا چھا گیا ــــ جوان دل دھڑک اٹھے تھے ــــ اور چنّیوں کے آنچل بھیگ گئے تھے ــــ اور ــــ اور ــــ کھیتوں کی مینڈیں، گلیارے، جوہڑ، سب نے اُداسیوں کی دھول اوڑھ لی تھی۔

سکھبیر رو پڑا تھا ــــ رنبیر کو نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑ رہا تھا ــــ اس نے سکھبیر کی طرف کھوکھلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے یار! کیا تو لونڈیا ہے جو ٹسوے بہا رہا ہے ــــ میں جلد ہی تجھے بھی کھینچ لوں گا۔" اور پھر اس نے اپنی باہوں کی طرف اشارہ بھی کیا تھا ــــ اسے یقین تھا کہ موسی کی فیکٹری میں لگتے ہی وہ اپنے آدھے کو جلدی سے بلا لے گا۔ پڑوس کے ٹیلی ویژن پر دونوں نے بہت سی فلمیں ساتھ ساتھ دیکھی تھیں ــــ اور شہر کے بارے میں اچھی خاصی جانکاری ہو چکی تھی۔

ماسی کا تانگہ تیار ہو چکا تھا ــــ اس میں چھوٹی بڑی گٹھریوں کا انبار بھرا ہوا تھا ــــ یہ چھوٹی بڑی گٹھریاں اور تھیلے اصل میں عزیزوں اور ملنے والوں کے تحفے تھے ــــ یا یوں سمجھئے کہ مان محبّت کے سرٹیفکیٹ تھے ــــ انسان

بھی کیسا بے اعتبارہ ہے ۔ وہ اپنے اُوپر ـــ اپنی محبت پر ـــ اپنے خلوص پر خود اعتبار نہیں کرتا ـــ اور جب اعتبار کمزور ہو تو ثبوت کے لئے سند تو چاہیئے ہی ـــ تو یہ سب چھوٹے بڑے ثبوت تھے ـــ اور سب کو معلوم تھا کہ ماسی کی شہر میں نیکٹری بھی ہے، تو کوئی پیچھے کیسے رہ جاتا ـــ

ماسی کو بڑی مشکل سے بیچ میں فٹ کر کے جب رنبیر نے جھک کر سارے بڑوں کے پیر چھوئے تو دھرتی سرسر پیچھے کھسکتی لگی تھی ـــ اور ـــ اور ـــ سکھبیر تو اسے صاف دکھائی بھی نہیں دیا تھا ـــ اور سکھبیر بے یقینی کے دلدل میں دھنسا ـــ اَن ہونی ہوتے دیکھ رہا تھا ـــ رنبیر نے تانگہ کا ڈنڈا پکڑ کر جب دھرتی سے پاؤں اُونچا کیا ـــ تو ایک بار تانگہ بھی لرز سا گیا ـــ گھوڑے کی تنی ہوئی گردن میں بھی کئی جھٹکے لگے اور بہت سے گھنگھرو ایک ساتھ بج اٹھے تھے ـــ سکھبیر اور رنبیر کے ہاتھ ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے ـــ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ تانگہ آگے بڑھ گیا اور دونوں طرف کے پھیلے ہاتھ ہوا میں معلق رہ گئے تھے ـــ سکھبیر کا آدھا دور ہوتا جا رہا تھا ـــ اور اس کے خشک ہونٹوں پر پیاس کی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں ـــ اور وہ جیسے زندگی کے لق و دق صحرا میں بالکل تنہا کھڑا تھا ـــ یا پھر کسی ظالم نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایسی بھول بھلیا میں چھوڑ دیا تھا، جہاں ہزاروں سوچوں کے سمندر جم کر پہاڑ بن جاتے ہیں ـــ اور زمین سے تلووں کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے ـــ آواز چیخوں کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے ـــ اور آنسو سینہ کے اندر پلٹ جاتے ہیں ـــ جہاں لاوا کھولنے لگتا ہے ـــ اور دیکھنے والا صرف پھیلی پھیلی دو آنکھیں اور پتھر سا ترشا ہوا چہرہ دیکھ سکتا ہے ـــ سو سکھبیر پر بھی لوگوں کو ترس آ رہا تھا ـــ بے چارہ!

سکھبیر جیسے چونک پڑا ـــ اس نے جلدی سے اپنا ایک شانہ اُچکایا ـــ پھر دُوسرا ـــ جیسے وہ یقین کر لینا چاہتا ہو کہ اس کے دونوں بازو اس کے پاس ہیں ـــ یا نہیں ـــ اسے اپنے وجود پر بے یقینی کا احساس ہو رہا تھا ـــ وہ آدھا کیسے بچا رہ گیا ـــ اور اس کا آدھا کیسے اس سے چھن گیا تھا ـــ اس نے تو سدا اسے یہ ہی سُنا تھا ـــ دونوں ایک ہیں ـــ یا پھر مل کر گیارہ بن جاتے ہیں۔

اس نے اپنے اور رنبیر کے بارے میں کبھی دو کا تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ پھر بچھڑتے وقت وہ آدھا کیوں رہ گیا ـــــ؟

ان دونوں کا ایک ہونا تو اتنا پکّا تھا کہ گاؤں کی لڑکیاں بھی رنبیر اور سُکھ بیر کو اَدل بَدل کرنے پر کبھی اعتراض نہ کرتیں ـــــ خوشی خوشی ـــــ ایک ایک گبرو بانٹ لیتیں ـــــ اور ـــــ ہوائیں، ہنسی کی پھلجھڑیوں سے رنگین ہو جاتیں ـــــ

یہ بات! ـــــ یہ دونوں بھی جان گئے تھے، اسی لئے مسکراہٹیں بکھیرے ـــــ سینہ تانے ـــــ انجانے بنے سامنے سے گزر جاتے ـــــ

تانگہ اب بس اسٹاپ پر پہنچنے والا ہو گا ـــــ زمین میں کچھ موتی اور سما گئے ـــــ اور سناٹا چاروں طرف بکھر گیا تھا ـــــ گاؤں کی دھرتی بھی جیسے ایک کے بنا اُداس ہو گئی تھی ـــــ اس کا ایک لال اُس طرف کو چل پڑا تھا جسے لوگ شہر کہتے ہیں ـــــ شہر کے گرجتے، ٹھاٹھیں مارتے انسانی سمندر میں اس کا وجود ایک ننھی سی کنکری یا معمولی سے تنکے کا سا تھا ـــــ اُس کی کیا گنتی ـــــ؟ وہاں تو چاروں طرف سے رینگتی ہُوئی قطاروں کا ایک، نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا ـــــ اور قطرہ قطرہ سمندر بوجھل ہو رہا تھا ـــــ یہ قطاریں انسانوں کی تھیں، جو سانس لئے بنا، اُوپر کو مُنھ اُٹھائے، ایک دُوسرے سے بے نیاز، رینگتی چلی آ رہی تھیں ـــــ کاش ـــــ اس عظیم انسان نے سُوجھ بُوجھ اور ایکتا کا سبق ننھی سی چیونٹی سے سیکھا ہوتا کہ انکی قطاریں قدم قدم پر تجربوں کا سبق ایک دُوسرے کے کانوں میں پھُونکتی ـــــ آگے بڑھتی ہیں ـــــ

رنبیر کا تانگہ کب کا بس اسٹاپ پر پہنچ چکا تھا ـــــ اور بس اپنے پیچھے سیاہی کی لائن چھوڑتی ہُوئی ـــــ آگے جا چکی تھی ـــــ لیکن سُکھبیرا اب تک نیم کی جڑ پر تنہا بیٹھا ـــــ ایک سُوکھی سی ٹہنی سے زمین پر لمبی لمبی لکیریں بنا بنا کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹتا جا رہا تھا ـــــ اور زمین پر لکیروں کا ایک جال سا اُبھر آیا تھا ـــــ

گلیارے جانوروں کی واپسی کے بعد سنسان ہو گئے تھے ___ اور نیم کے نیچے سیاہی گہری ہوتی جارہی تھی ___ سیکڑوں چڑیاں آس پاس کے درختوں پر چیخ رہی تھیں ___ اور ان کی باریک سوئی جیسی آوازیں اس کے دماغ میں پیوست ہوتی جارہی تھیں ___
"سکھبیرا ___!" آواز دُور سے آتی لگی تھی ___ اس نے گردن اونچی کی ___ سامنے والے باغ کی کاہی کگر پر سورج کی تھالی سُرخ ہو چکی تھی ___ اور بادل کے آوارہ ٹکڑے اس کے گرد منڈلا رہے تھے ___
"سکھبیرا ___!" اسے آواز پھر سُنائی دی ___ ماں دروازے پر کھڑی تھی ___ شاید سکھبیر کی بے چینی ماں کے احساس پر کانٹے اُگا رہی تھی ___ وہ پہلے بھی کئی بار دہلیز پر آ کر جھانک گئی تھی ___ پر اب تو خاصا اندھیرا ہونے لگا تھا ___ سکھبیر کھڑا ہو گیا ___ سُوکھی شاخ ایک طرف اُچھال کر، رنبیر کے دروازے پر نظر ڈالی ___ کوئی سایہ اندر کھسک گیا تھا ___ اس کے قدم رُک سے گئے ___ اسے لگا رنبیر دوڑ کر باہر آجائے گا ___ دُوسرے ہی لمحہ وہ جاگ پڑا تھا ___ "دھات تیرے کی ___ وہ تو دُور ___ بس میں اُڑا چلا جارہا ہوگا ___" اسے جھٹکا سا لگا ___ وہ چلا کیسے گیا ___ اپنے آدھے کو لے کر ___ وہ بھی آدھا ہی رہ گیا ہوگا ___ سب ہی کہہ رہے تھے ___ اور سچ بھی یہی تھا ___ اس کی سوچوں میں پُرانی مشین کی طرح جھٹکے آنے لگے تھے ___ سوچنے کی اِن دونوں کو ہی عادت نہیں تھی ___ کبھی کچھ سوچنے کو تھا ہی نہیں ___ جب کسی نے کچھ کہا، سُن لیا ___ جو جی میں آیا کہہ دیا ___ پھر بھی اسے آج ایک انجانی سی ___ عجیب سی لذت کا احساس ہو رہا تھا ___ تنہائی کا نیا بن تھا ___ اور وہ پل پل ڈول رہا تھا ___
رات چارپائی پر جیسے ہی پڑا ___ مانو آنکھوں سے جوالا مکھی اُبل پڑا ہو ___ پھر بہت دن تک ایسا ہی ہوتا رہا ___ دن بھر جگو جگو کر رکھتا ___ اور رات میں قطرہ قطرہ لُٹا دیتا ___ پھر آہستہ آہستہ صبر کے پتھروں نے یادوں کے غار ڈھکنا شروع کر دیئے تھے ___ لیکن یہ غار کبھی پٹے ہیں ___؟ جب سائیں سائیں کرتا طوفان آتا ___ سارا جمع جتھا ___ تتر بتر ہو جاتا ___

بات پُرانی ہو چکی تھی ___ پھر بھی رنبیر کے جانے کے بعد سکھبیر کا داہنا کوئی نہ بن سکا تھا ___ وہ سارے کام کاج معمول کے مطابق کرتا ___ صُبح اندھیرے میں وہ گھر سے نکلتا ___ رنبیر کے دروازے سے اس کی یاد اٹھا کر کندھے پر بٹھاتا اور سارے دن کھیتوں اور بازاروں کے چکّر لگاتا ___ پھر رات کو چارپائی پر جاتے ہی شہر سے آئی تازہ چٹھی، مٹھیوں میں بھینچ بھینچ لیتا ___ جس میں رنبیر کی بے چینی سطر سطر چسپاں ہوتی ___ اگر بابا یوں نہ چل بستا تو سکھبیر بھی کب کا شہر پہنچ چکا ہوتا ___ اپنے آدھے کے پاس ___ رنبیر بھی یہی لکھتا کہ وہ شہر میں اب تک آدھا ہی ہے اور یہ بھی کہ شہر میں وہ اپنے کو پُورا کر بھی نہیں پائے گا ___ وہاں دوست نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ___ وہاں لوگ سانپ کی طرح کینچل بدلتے ہیں ___ اور یہ بھی کہ سانپ بیچارہ تو سال میں ایک بار کینچل بدل کر نیا بن جاتا ہے ___ پر، وہاں تو اس نے دن میں کئی کئی بار لوگوں کو کینچل بدلتے دیکھا تھا ___ اس نے بڑے افسوس سے لکھا تھا ___ یار ___ کوشش کے باوجود شہر میں اب تک کسی انسان سے نہیں مل سکا ہُوں ___ اور یہ کہ آدمی کی شکل شہر میں عنقا ہے ___ سب طرح طرح کے مکھوٹے اپنے چہروں پر لگائے رہتے ہیں ___ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس پر بھی اکتفا نہیں کرتے، چند مزید مکھوٹے جیبوں میں بھی رکھتے ہیں ___ جو وقت ضرورت کام آتے ہیں ___ یہی مکھوٹے اُوپر چڑھنے کی سیڑھیاں ہیں ___

اور وہاں آدمی ناپنے کے فیتے کا نام کرسی ہے ___ اس کی اُونچائی سے آدمی اُونچا ___ یا ___ نیچا مان لیا جاتا ہے ___ اور اس نے بہت سے بَونوں کو اونچی کرسی پر سوار دیکھا تھا ___

رنبیر یہ سب کچھ تو بڑی تفصیل سے لکھتا لیکن اپنی واپسی کے بارے میں کبھی کوئی اشارہ بھی نہ کرتا ___ اور سکھبیر کے صحرا جیسے ذہن میں شک کے کانٹے سر اٹھاتے ___ اس نے بھی ضرور کوئی مکھوٹا لگا لیا ہو گا ___ تب ہی تو گاؤں آتے سے کتراتا ہے ___

وقت گزرتا رہا ___ لیکن جب کبھی یادوں کی بَرف پگھلتی ___ تو ماضی پر جمی خاک نہ جانے کہاں بہالے جاتی ___

پھر اس کے قدم خود بخود شہر کی طرف دوڑ پڑے تھے ___ دونوں بالکل بچوں کی طرح بغلگیر ہو کر خوب ہنسے تھے ___ بہت اونچی آواز سے ___ اور لوگ ٹھہر کر دیکھنے لگے تھے ___ کہ یوں ملنا بدتہذیبی تھی ___ اس نے گاؤں کی اور رنبیر نے شہر کی بہت ساری باتیں بے صبری سے ایک دوسرے پر انڈیل دی تھیں ___ اور پھر رنبیر نے یقین دلایا تھا کہ وہ اب تک اپنے لئے کوئی بھی مکھوٹا نہیں خرید سکا سستا ہونے کے باوجود وہ حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے ___ اور اس کے پاس وہی گاؤں والا پرانا چہرہ ہے ___ جس کی وجہ سے وہ بار بار نقصان اٹھاتا ہے ___

واپس آکر سکھبیر پھر آتے جاتے ڈاکیہ کو ست سری اکال کرنے لگا تھا ___ کبھی کبھار ___ ہوا کے دوش پر سوار کوئی چٹھی آجاتی ___ تو ماضی کے سمندر میں یادوں کی سیپیاں چمک اٹھتیں ___ پھر پل بھر میں ہی سب کی سب گہرائیوں کے دلدل میں منہ چھپا لیتیں ___ اور وہ اپنے ادھورے پن کے سناٹوں میں پھر ڈولنے لگتا ___

اب تو ماں بھی روٹھی رہتی ___ ماں کو اس کا آدھا پن کھائے جا رہا تھا ___ اور رنبیر کا خط پاکر اس نے ہاں کر دی تھی ___ پھر آج ہی ___ ماں نے سرخ، ستاروں والی چنری خریدی تھی ___ ہاتھی دانت والے چوڑے کی فرمائش وہ رنبیر کو لکھا چکی تھی ___ اور بھی بہت کچھ ___ نہ جانے کیا کیا ___ اس نے اپنے سارے زیوروں کی گٹھری نکالی اور بیچ آنگن میں بازار لگا کر بیٹھ گئی ___ پھر پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا ___ پتہ نہیں اسے اپنا دلہنا پا یاد آیا تھا ___ یا بہو کا چہرہ ___ جو اس نے پاس والے گاؤں میں پسند کر رکھا تھا ___

پر سکھبیر کی یادوں کی ڈوری ___ دور تک کھنچتی چلی گئی تھی ___ جس کے دوسرے سرے پر دھندلا دھندلا رنبیر ڈول رہا تھا ___ اس نے رنبیر کے آنے کے وعدے پر ہی حامی بھری تھی ___ وہ رنبیر کو بھی راضی کر لے گا ___ ہو سکتا ہے اس نے کوئی پسند بھی کر لی ہو ___ اور سینما کے کئی سین اس کی نظروں میں گھوم گئے ___

زبیر صبح آئے گا ـــــ وہ اندھیرے میں ہی بس اسٹاپ پہنچ جائے گا ـــــ کبھی بس پہلے ہی آگئی تو ـــــ اور وہ بے چین ہو اُٹھا تھا ـــــ کیسے شام ہو ـ پھر رات آئے ـــــ اور پھر صبح ـــــ ہو جائے ـــــ اس نے وقت کے پہیئے کو تیزی سے گھمانا چاہا ـــــ لیکن وہ خود تنہا گھوم کر رہ گیا ـــــ وقت بڑی سنگدلی سے اپنی رفتار پر ڈول رہا تھا ـــــ وہ رات کو سو بھی نہیں سکا تھا ـــــ ہر لمحہ گردن اُٹھا کر کبھی گھڑی کی سوئیاں دیکھتا ـــــ اور کبھی کھڑکی سے باہر پھیلے ہُوئے سُرمئی تاروں بھرے آسمان کو ـــــ

وہ لمحے بھر کو سویا تھا کہ اسے کچھ شور سنائی دیا ـــــ جیسے جنم اشٹمی کی رات مندر کے دوار پر ڈھول تاشے بج رہے ہوں ـــــ اور سارے گاؤں کے ہندو مُسلمان اور سردار اکٹھے ہو کر جشن منا رہے ہوں ـــــ یا ـــــ یا ـــــ گردپورو پر گاؤں کا پھیرا لگاتی ہوئی پربھات پھیری ـــــ باجے گاجے کے ساتھ واہِ گرد ـــــ واہِ گرد کا نعرہ لگاتی ہوئی قریب ہوتی جا رہی ہو ـــــ

اس نے اپنی آنکھیں ملیں ـــــ شور کا انداز بھیانک سا لگا ـــــ اس کے ذہن میں ایک دھماکا ہوا ـــــ اور وہ ایک ہی چھلانگ میں دروازے سے باہر نیم کے نیچے پہنچ چکا تھا ـــــ ماں کی آواز نے پیچھا کیا ـــــ سکھبیرا ـــــ سکھبیرا رک جا ـــــ کچھ گڑ بڑ لگتی ہے ـــــ اور ـــــ سکھبیرا آنکھیں پھاڑے گلیاروں میں بھاگتے خوفزدہ کتوں کو گھور رہا تھا ـــــ اور دُور انسان بھونک رہے تھے ـــــ جانے پہچانے چہرے ـــــ انجانے بنے بھاگ رہے تھے ـــــ عورتیں اور بچے مُنھ چھپائے تھر تھر کانپ رہے تھے ـــــ

مردوں نے اپنی آن رکھنے کی ٹھان لی تھی ـــــ کرپانیں ـــــ چھُرے ـــــ برچھیاں ـــــ اور انسانیت کو زخمی کر دینے والے سارے آلات بکسوں سے اُبل کر باہر آچکے تھے ـــــ فضائیں انسانی خون کی ناگوار بو بس چکی تھی ـــــ اور ہر طرف ویرانیوں کے خیمے پھڑ پھڑا رہے تھے ـــــ تعصب کے گدھ انسانوں کے جسم کے ملائم گوشت کو اپنی خونخوار نکیلی چونچوں سے نوچنے کی لذت محسوس کر رہے تھے ـــــ حملہ کس نے کس پر کیا تھا ـــــ کسی کو نہیں معلوم تھا ـــــ

کل تک تو — گرودوارہ — مندر — اور — مسجد — سب ہی عبادت گاہیں تھیں — سب کے لئے متبرک اور پاک — پھر آج کیا ہو گیا تھا — جو سڑک اور پگڈنڈیوں پر موت چنگھاڑ رہی تھی — اور — لپ لپ کرتی خون آلودہ زبان نکالے انسانوں کو گھور رہی تھی —

سکھبیر بھی سڑک کی طرف بھاگا — کہ زیادہ لوگ اسی طرف کو بھاگ رہے تھے — اور پھر اس نے دیکھا — لٹی بھنکی ایک بس کھڑی تھی — لاشیں بکھری پڑی تھیں — کہیں کہیں آگ کے سُرخ دیدے چمک رہے تھے — اور — کہیں خون سے بجھی آگ سُلگ سُلگ کر انسانیت کے اس روپ پر ماتم کر رہی تھی — سڑک کے کنارے گڑھوں میں — بے شناخت خون بھرا تھا — صرف خون —

انجانا سا خوف سکھبیر کے مساموں سے گھس کر اس کے سارے جسم کے خون کو منجمد کرتا جا رہا تھا — آدھ جلے چمکیلے کپڑوں کے پاس ہی — ایک دُوسرا ڈھیر — دھندلا دھندلا — غیر اہم سا — خون میں لت پت۔

سکھبیر کے پیر خود بخود رک گئے — ہلکی سی روشنی میں اس نے جھک کر دیکھا — دُور — جاتے ہُوئے تانگے کے جھٹکے نے — دو مضبوط پکڑے ہوئے ننھے ہاتھوں کو جُدا کر دیا تھا — محبّتوں اور یادوں کے اس ڈھیر پر نفرت قہقہے لگا رہی تھی — اور درندگی اپنا سفاک جبڑا پھیلائے — انسانی خون چاٹ رہی تھی —

رنبیر — اور رنبیرا — وہ بہت آہستہ سے بڑبڑایا — اس کا وہ احساس مَر چکا تھا — جس کے ذریعہ غم آنسوؤں کی شکل اختیار کر لیتا ہے — وہ تو بس — بہت سی بکھری ہوئی — خون میں لت پت ڈھیریوں میں خود بھی بکھر چکا تھا —

چاروں طرف خون کی بُو — دھواں بن کر انسانیت کے چہرے کو مسخ کر رہی تھی — وہ آہستہ آہستہ رنبیر کی لاش کے پاس بیٹھ گیا۔

"رنبیرا — او رنبیرا — میرا دیر — تُو تو میرا بیاہ کرانے آیا تھا۔

___ اتنے دنوں بعد گاؤں لوٹا تھا ___ پُورا ہونے کو ___ لے ___ لے۔ اب یہ پگڑی تو باندھ لے ___ کہ سب جان لیں ___ تو میرا ہی بھائی ہے ___ میرا دیر ___ میرا خُون ___" اور یہ کہتے ہُوئے اس نے اپنی پگڑی اُتار کر رنبیر کے سر پر رکھ دی ___

ستمبر ۱۹۸۴ء

بھولے بسرے

آج ــــ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا ــــ چاہے یہ بھول جانا لمحوں میں ہی قید کیوں نہ ہو جائے ــــ اس کے ذہن پر چھوٹے چھوٹے رُوئی کے گالوں جیسی سیکڑوں یادوں نے پہاڑ بن دیئے تھے ــــ وہ ان دبیز پہاڑوں سے دُور ــــ کسی بھیانک جنگل ــــ یا ــــ گہرے سمندر میں پھاندنا تو نہیں چاہتا تھا ــــ لیکن اس نے بار بار سوچا ضرور تھا کہ وہ اِن موٹی موٹی تہوں کو ذہن سے نوچ پھینکے ــــ لیکن کس تہہ کو ــــ ؟

اس کے اندر ــــ چاروں طرف ــــ دُور دُور گہرائیوں میں نہ جانے کتنے قمقمے اور ستارے جھلملا رہے تھے ــــ وہ ان جھلملاہٹوں سے نہ جانے کتنی بار ــــ اپنے دھندلے سے وجود کو روشن کر چکا تھا ــــ نیلا ــــ پیلا ــــ ہرا ــــ یا ــــ پھر لال ستارہ. لیکن وہ کبھی فیصلہ نہیں کر سکا تھا ــــ کہ کون سی روشنی تیز ہے ــــ اور کون سی مدھم مدھم سُلگتی ہُوئی ــــ بس ــــ اس نے تو جب بھی دھندلا پن دیکھا تو کوئی بھی روشنی اپنے قریب جلا لی ــــ لیکن ان روشنیوں سے اس نے کبھی اپنا ہاتھ نہیں جلایا ــــ ان کی گرمی میں اس کے کپکپاتے ہاتھ تو ضرور گرم ہُوئے تھے ــــ کنپٹیوں پر تپش بھی محسوس کی تھی ــــ اور ــــ اکثر روشنی اور گرمی کی لہریں اُسے دُور تک بہالے جاتیں. وہ کھویا کھویا سا بہتا رہتا ــــ

گردن پر بکھرے بالوں کی لٹیں ___ کندھوں سے جھولتے ہوئے لمبے کوٹ ___ چمکتی ہوئی سُرخ پنیٹ ___ اور ___ اُونچی ایڑی کا جوتا ہی اُس کا وجود نہیں تھا ___ بلکہ اس کے پھیلے ہوئے چوڑے سینہ پر چمکتے ہوئے مختلف سنہرے بٹن ___ اس کی پتلی کمر اور خوب صورت بلٹ ___ اور ___ اس کی متوالی چال ___ ایسی ہی تھی کہ اس کے قریب کئی روشنیاں چوراہے کی ہری ___ پیلی ___ لال ___ روشنیوں کی طرح جلنے بجھنے لگتیں ___ کئی کندھوں پر لٹکتے ہوئے رنگ برنگے پرس اور بیگ اس کے چاروں طرف ناچنے لگتے ___ اور ___
___ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑنے اور پھیلنے لگتیں ___ لیکن وہ ___ چوندھیایا کبھی نہیں تھا ___

شاردا ___ مینا ___ رشما ___ فریدہ ___ پیلی ___ لال ___ نیلی ___ اور ___ سنہری روشنیاں پھر سے جل اُٹھتیں ___ لیکن آج وہ چھٹی چاہتا تھا ___ اور ___ اِن پہاڑ جیسی تلے اُوپر لدی تمام پرتوں کو کھرچ دینا چاہتا تھا ___

آج ہی تو اس کو ہیرے کی ایک انگوٹھی پہننا ہے ___ شام کو ___ ہیرے کی انگوٹھی ___ جس میں خود ہی کئی رنگ جھمکنے لگیں گے ___ کئی روز سے اس کے چاروں طرف کچھ دُودھیا سا دھندلکا ہوتا جا رہا تھا ___ اور اب وہی دودھیا سا دھندلکا کچھ جمتا سا لگ رہا تھا ___ اور ___ وہ اِس دھند کو جلدی سے جلدی نوچ ڈالنا چاہتا تھا ___ کہیں یہی بے وجود ___ دُودھیا سا رنگ جمتے جمتے پتّھر نہ بن جائے ___ اور سب کچھ تو چھپایا جا سکتا ہے ___ لیکن پتھر ___ پتّھر تو ساری پرتوں کو چاٹ جائے گا ___ اور پھر ___ پھر وہ کہیں ننگا نہ ہو جائے ___

اس نے اِدھر اُدھر چپکے سے جھانکا ___ دُور ___ بس کچھ چنگاریاں سی ٹمٹمائیں ___ اور ___ وہ جھنجھلا سا گیا ___ اس نے ایک ساتھ کتنی ہی روئی کے گالوں جیسی نرم نرم پرتوں کو اپنے ذہن سے نوچ ڈالا ___ لیکن پھر بھی وہ

گھبرا گیا تھا ___ اس کے ذہن پر بڑا سا سُرخ دھبہ چمک رہا تھا ___ وہ ڈر گیا ___ اس میں سے کچھ بہنے نہ لگے ___ دَرد کو تو وہ چھپا لے گا ___ لیکن ___ بہتی اور رِستی ہُوئی حقیقت کو وہ کہاں چھپائے گا ___؟

سینہ کی گہرائی سے کُچھ ایک دم باہر آ گیا ___ شاید ___ آہ ___ لیکن وہاں کوئی آواز نہیں تھی ___ بس ہوا کے چھوٹے چھوٹے کئی گولے لہرائے ___ اور گھل گئے ___

اس کے سامنے کئی مَدھر مَدھر سُر کھنکے ___ شراب کے کئی پیالے اس کے ہونٹوں کے قریب چھلک گئے ___ اور اس نے غٹا غٹ ختم کر دئیے ___ اور اپنے ہونٹ رُومال سے صاف کر لئے ___ لیکن ہونٹوں کو جتنا پونچھو ___ جتنا صاف کرو ___ وہاں خشکی بڑھتی جائے گی ___ اس نے جلدی جلدی زبان پھیر کر اپنے ہونٹوں کو تر کر لیا ___

ممّی اور ڈیڈی دونوں کے قہقہے ___ اور پھر ان کے کئی اور دوستوں کے کے قہقہے ___ اور ___ اور پھر اس کے اپنے ساتھیوں کے قہقہے ___ گھر قہقہوں کا جنگل سا بن گیا تھا ___ گھنا جنگل ___ جس میں وہ ہَولے ہَولے رینگ رہا تھا ___ اور چنچل مسکراہٹیں اس کے اندر کوندے کی طرح لپک لپک کر ___ سیاہی پھیلا رہی تھیں ___

جہاں بجلی گرتی ہے ___ وہاں کچھ نہ کچھ تو جل ہی جاتا ہے ___ اور ایسی ہی تیزی سے کچھ جلنا بجھنا اس کے اندر ہو رہا تھا ___ آشا ___ اُوشا ___ نرمل ___ سب کے جسم غائب تھے ___ سب کے ڈریسز نہ جانے کون نوچ لے گیا تھا ___ لیکن ___ چہروں پر پڑے لمبے لمبے بالوں کے دَرمیان اُن کی ستواں ناکیں چمک رہی تھیں ___ آنکھوں کے گرد روپہلی اور نیلی کھنچی ہوئی لائنوں سے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی ___ اور ___ اس وقت وہ اس سہانی بارش سے گھبرا رہا تھا ___ اس میں تو وہی مہک تھی ___ وہی پرفیوم بس رہا تھا ___ جنھیں اکثر اس نے خود کناٹ پلیس کی بڑی بڑی دکانوں سے خریدا تھا ___ لیکن ___ یہ قیمتی پرفیوم ___ یہ چمکتی ہُوئی ___

امپورٹڈ لپ اسٹک ـــــ اس کو کیوں پگھلا رہی ہیں ـــــ میٹھی میٹھی خوشبو اس کے نتھنوں میں رینگ گئی ـــــ اس کا ماتھا کچھ نم نم سا ہو رہا تھا ـــــ وہ گھبرا کیوں رہا ہے ـــــ

اس کی موٹر سائیکل تو کبھی ساٹھ سے کم رفتار میں نہیں بھاگی تھی ـــــ اس نے اپنی پیٹھ پر نرم نرم لمس محسوس کیا ـــــ جو آہستہ آہستہ گرمی میں بدل رہا تھا ـــــ اور پھر ـــــ کمر کے گرد ایک بندھن سا بھی ـــــ لیکن وہ گھبراتا کیوں ـــــ ؟ وہ تو مسکرا رہا تھا ـــــ اور انگلیوں کے درمیان دبی ہوئی چنگاری اب اُس نے ہونٹوں سے لگالی تھی ـــــ

ایک ہاتھ سے وہ موٹر سائیکل کی لگام اچھی طرح سے کس لیتا تھا ـــــ وہ سڑک سے کچھ اُوپر ہی اُڑ رہا تھا ـــــ اور اُسے گرمی لگ رہی تھی ـــــ اس نے آہستہ سے پکارا ـــــ

"ریکھا ـــــ!" اور اس کا دل دھک سے ہو گیا تھا ـــــ کہیں اس نے زور سے تو نہیں کہہ دیا تھا ـــــ یہ تو شاردا ہے ـــــ پھر وہ ریکھا اور شاردا کی پرفیوم یاد کرتا ـــــ اکثر اس کی آنکھیں بند ہوتیں ـــــ اور وہ بھول جاتا کہ وہ کیا کرے ـــــ

آشا ـــــ اوشا ـــــ نیلم ـــــ ریکھا ـــــ شاردا ـــــ اکثر ان میں امتیاز کرنا کس قدر مشکل ہو جاتا تھا ـــــ ویسے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی ـــــ لیکن نہ جانے کیوں جب لہروں پر بہتا وہ دُور نکل جاتا ـــــ اور ـــــ شاردا کو ریکھا پکار لیتا ـــــ تو ـــــ خود ہی ڈر سا جاتا ـــــ لیکن کیوں ـــــ ؟ ہم سب تو بڑے اچھے دوست ہیں ـــــ پھر بھی ـــــ کچھ چیزیں ایک دوسرے سے چھپا کر رکھنا کتنا ضروری ہوتا ہے ـــــ کتنے نشے ـــــ کتنی مہکیں ـــــ اور کتنی جسم میں پھیلتی ہوئی لہریں ـــــ سب کو کہاں تک الگ الگ رکھے۔

وہ شام کے دھندلکوں کو ٹٹول رہا تھا ـــــ جس میں ہیروں کی جگمگاہٹ تھی ـــــ اس نے اپنی لمبی سی سفید انگلی پر نظر ڈالی جو اس وقت خالی تھی ـــــ اپنے کاندھے پر رکھے ہوئے شاردا کے خوب صورت سر کو ہٹانا چاہا۔

لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کے گرم ہونٹوں کا لمس ـــــ وہ آہستہ آہستہ پگھلنے لگا ـــــ

وہ لوگ آ گئے ـــــ ممّی نے اس کے منھ سے لگی ہوئی اُس میٹھی شراب کو نوچ کر دُور پھینک دیا ـــــ اس نے مسکرا کر اپنے چاروں طرف بکھرے ہُوئے رنگوں کو دیکھا ـــــ جو چھوٹی چھوٹی ٹکلیوں کی شکل میں اس کے چاروں طرف رینگ رہے تھے ـــــ اُس نے اُٹھ کر اپنی نئی ٹائی کی ناٹ درست کی ـــــ اور غرور سے کندھے اُچکائے ـــــ

پارو کتنی معصوم ہے ـــــ بالکل بھولی ـــــ سیدھی سادی ـــــ خیر، میں نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا ہے ـــــ بس یہی نا ـــــ کہ ہم لوگوں کی پرورش ذرا ماڈرن ہے ـــــ اور ـــــ وہ لوگ ـــــ خیر، یہاں آ کر سوسائٹی ملے گی تو وہ بھی ماڈرن ہو جائے گی ـــــ

اس نے محسوس کیا ـــــ کیلاش پربت سے اُترتی ہوئی اس کی پارو کے ہاتھ میں ایک تھالی ہے ـــــ پوجا کی سامگری سے بھری ہُوئی ـــــ گھی کا جلتا ہوا دیا ـــــ پارو کے چہرے پر تیج بکھیر رہا تھا ـــــ اس کا سینہ اندر سے پھول سا گیا ـــــ شاید وہ شیٹو ہے ـــــ اس نے ایسا ہی سوچا تھا ـــــ

انگوٹھی اس کی انگلی میں چمک رہی تھی ـــــ اور قہقہوں کے سمندر اُمنڈ اُمنڈ کر مسرت سے اسے شرابور کر رہے تھے ـــــ پھر اس کی گاڑی پارو کے دروازے پر رُکی تھی ـــــ

بڑا شور و غل تھا ـــــ

آج سے پہلے اس نے پارو کو ایک بار دیکھا تھا ـــــ صرف ایکبار ـــــ اور اس نے سفید شفان کی ساری میں لپٹی ہُوئی اس سادی اور لجائی لجائی سی لڑکی کو پسند کر لیا تھا ـــــ اور آج وہ سجی سجائی اُسی پارو کے ساتھ صوفے پر بیٹھا تھا ـــــ اس کے ذہن میں کرنیں پھُوٹ پڑیں لیکن سفید سفید ٹیوب کی لائٹ میں سب نے دم توڑ دیا ـــــ

جھلمل جھلمل زیوروں اور کپڑوں میں سجی اُس کے برابر دُرگا کی مورتی رکھی

ہے ـــــ اُس نے محسوس کیا ـــــ اس نے انگوٹھی سے اُبھرتی کئی روشنیوں کو اندھیرے دل کے پردے پہنانا چاہے ـــــ لیکن ـــــ سچے رنگ اُبھرتے رہے۔

اس نے پاروتی کی جھکی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں دیکھیں ـــــ اور دور، کئی بجلیاں کوند گئیں ـــــ شرمیلی ـــــ سجاوٹ سے دور ـــــ کئی ترنگیں اسے بہائے لئے جارہی تھیں ـــــ

آشا ـــــ اوشا ـــــ مینا ـــــ شاردا ـــــ اور اس کی پیٹھ پر نرم نرم گرمی اُبھرنے لگی ـــــ پھر کمر کے گرد ہالہ تنگ ہونے لگا ـــــ پرفیوم کی جانی پہچانی بہت سی لہریں اس کے نتھنوں میں پگھلنے لگیں ـــــ وہ سنبھلا ـــــ چونکا ـــــ کھنکارا ـــــ

"پارو ـــــ!" اس نے پکار ہی لیا ـــــ لیکن پارو ـــــ وہ جھکی ہوئی آنکھوں سے دور ـــــ بہت دور ـــــ موٹر کی تیز سن سن کرتی رفتار میں اُڑی جارہی تھی ـــــ اور اس کا سر روی کے چوڑے چکلے کالر ٹرائے سے ڈھکے سینے پر ٹکا ہوا تھا ـــــ اور وہ اس کی دھڑکنیں گن رہی تھی ـــــ

۱۹۷۶ء

وہ!

"بی بی جی! ایک بات پوچھوں۔" اور میں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا' وہ کچھ بدلی بدلی سی لگی، لیکن نظریں اٹھانے کے مطلب کو فوراً تاڑ گئی۔

"بی بی جی، کیا دُوسری شادی بنانا ٹھیک ہے۔"

میں نے ایک نظر میں اُس کے وجود کو سمیٹتے ہُوئے اس کی بڑی بڑی گہری کالی آنکھوں میں گھورا، وہ ٹپٹا گئی، کھسیانی سی ہنسی ہنس کر اس نے جملہ پھر دُہرایا۔ "بی بی جی، بولو، کیا دُوسری شادی بنانا ٹھیک ہے۔"

وہ دبلی پتلی، سانولی سی لڑکی اپنے سوال کا جواب یوں چاہ رہی تھی جیسے اسے کوئی اہم فیصلہ کرنا ہو، اس کا نام شاید دھرمنتی ہو لیکن میں نے اُسے ہمیشہ دمنتی کہا تھا۔ شروع شروع میں اُس نے کئی بار احتجاج بھی کیا۔

"بی بی جی، دمنتی کیوں کہو؟ میں تو دھرمنتی ہوں!" لیکن میں نے اس کے وجود میں نہ معلوم کیوں دھرمنتی سے زیادہ دمنتی کو ہی محسوس کیا تھا۔ چودہ سال کی عمر میں کوئی بھی اسے گیارہ سے زیادہ ماننے کو تیار نہ ہوتا۔ سانولا سلونا ستواں چہرہ، موزوں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، جن میں بڑائی سے زیادہ تجربہ سماں تھا۔ اُوپر کو اُبھرا ہوا ماتھا اور منہ جوڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہُوئے دو ننھے ننھے سنپولیے، جنھیں وہ ضرورت سے زیادہ اُوپر نیچے کرتی رہتی۔

تقریباً چھ سال پہلے ہمارے یہاں کام کرنے والی لڑکی کے ساتھ ایک ننھی سی لڑکی آئی اور

گیٹ پر کھڑی رہی۔ دُوسرے دن پھر وہ گیٹ سے اندر کو جھانک رہی تھی، اس کی عجیب سی نظروں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا، اور میں گیٹ پر جاکر پوچھنے لگی۔

"کون ہو تم۔؟"

اُس نے مائی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بتایا۔

"اس کے سنگ ــــ"

"اچھا تو اندر آجا!"

گیٹ کھول کر وہ ننھی سی عورت نُما لڑکی اندر آگئی، موٹی اور مَیلی سی چادر میں سر سے پیر تک لپٹی، چاند پر ایک سخت سی چوٹی اُبھری جو شاید دس پندرہ روز پہلے کسی نے باندھ دی تھی، ننگے پیر جن پر مٹی کی تہوں نے جوتے بنا دیئے تھے، وہ مائی کے پاس جانے کے بجائے میری کرسی کے قریب آکر کھڑی ہوگئی، سِمٹی سِمٹی گُن ہی سی لڑکی لیکن چہرہ بے انتہا معصوم۔

میں خود سے بول اُٹھی" کیا نام ہے۔؟"

وہ شرما کر بولی"دَھرمتی!"

اتنا ہی کہہ سکی تھی کہ مائی کام سے فارغ ہو کر ہمارے پاس آگئی اور دھرمتی کو دیکھتے ہُوئے کہنے لگی۔

"اس کی ماں اسے کام پر لگانا چاہتی ہے، بی بی جی!

"یہ کام کرلے گی۔؟" اور میں نے جیسے اس کے وجود کا مذاق اُڑا دیا ہو۔ وہ تڑپ کر بولی۔

"بی بی جی، میں دَد کوٹھی کرتی ہوں!"

"دد کوٹھی۔؟"

"ہاں جی! کرا کے دیکھو کام ــــ"

میں ہنسنے لگی۔

"کیا لے گی۔؟" میں نے سوچا کچھ نہیں، بس کہہ دیا۔ مجھے نوکر کی ضرورت بھی نہیں تھی، ایک لڑکا تھا جو کھانا وغیرہ پکا لیتا تھا، اور اوپر کا کام مائی کرتی ہی تھی۔

"جو دوگی بی بی، ہم لے لیں گے!"

دہلی میں اس طرح اوپر کے کام کرنے والی عورتوں کے لئے ایک خاص ٹرم استعمال ہوتا ہے 'مائی'، جس میں ہر عمر کی عورتیں اور لڑکیاں ہوتی ہیں

میں نے پوچھا۔ "کیا مائی بنے گی؟"

"ہاں بی بی جی! میں تو ہوں مائی ـــــ" وہ بغیر کچھ سوچے ہوئے مجھ سے اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ "یہ جو ودیا ہے نا بی بی جی ـــــ میری ماسی کی لڑکی ہے۔ ہم دونوں ہی کام کریں گے تمھارے ہاں!"

مجھے تعجب تھا، دیکھنے میں ایسی بے وقوف، بھولی بھالی، چھوٹی سی لڑکی ـــ اس قدر معاملہ فہم اور تیز۔ وہ بھولے پن سے میری طرف دیکھ رہی تھی، بالکل سوالیہ نشان بنی، میں ہنسنے لگی۔

"اچھا، آجانا کل سے لیکن یہ چادر وادر اُتار کر آنا اور نہا کر کام کرنا، ودیا برتن کرے گی اور تم صفائی کرنا۔"

"ہاں ہاں بی بی جی!" اور جیسے وہ کھِل اُٹھی، پھر بولی۔ "بی بی جی، صابن دے دو، میں ابھی نہا لوں۔"

"اور کپڑے؟" میں نے پوچھا اور اس کے معصوم سے سانولے چہرے پر کئی لہریں گزر گئیں،

"تم کپڑے نہیں دو گی؟" اور مجھے احساس ہوا، میری فرمائش اُس کے لئے کتنی مہنگی تھی، اور وہ پوری کرنے کی خواہش کے باوجود مجبور تھی، اور میں نے اس سے کہدیا۔

"تم کل آجانا، کپڑے بھی دوں گی!"

چند ہی روز میں جیسے وہ بالکل بدل گئی ہو، کوٹھی تو اب بھی اس کے پاس تین تھیں، لیکن وہ صاف ستھری، بالوں میں کنگھا کئے ہوئے، فراک پہنے، جیسے لگتا کہ ہر طرف چمک رہی ہو۔ وہ دن کا زیادہ وقت ہمارے ہی گھر میں گزارنے لگی، اور پھر دھیرے دھیرے نصیر کی شکایت کرنا اپنا حق سمجھنے لگی

"بی بی جی، نصیر نے روٹی جلادی!"

"بی بی جی، نصیر بڑا سُست ہے، دیکھو آپ اپنی ورزش سے آئیں اور وہ ابھی تک چائے نہیں لایا!"

وہ دوڑ دوڑ کر کام کرتی اور ہمیشہ ہنستی رہتی۔

"لاؤ بی بی سر میں تیل ڈال دوں!"

"بی بی جی، پیر پھیلا دو، میں تیل مالش کر دوں، کام کرنے جاتی ہو تو تھک جاتی ہوگی،

ہیں بی بی جی۔" اور میں اس کے لاتنا ہی سوالوں کا جواب ہُوں ہاں کر کے دیتی رہتی۔ کبھی پیچھے سے کرسی کے پیچھے سے سر دبانے کے لئے پکڑ بھی لیتی۔

"بی بی جی مجھے یہاں بہت اچھا لگتا ہے۔" اور پھر وہ اپنے حساب سے بہت اہم سوال کرتی "کیا میں اب بھی ویسی ہی ہُوں جیسے آئی تھی۔"

"تمھیں کیسا لگتا ہے۔"

اور وہ منھ کے اندر زبان گھما کر ایک عجیب سی آواز نکالتی۔ "ٹخ" جس کا مطلب ہوتا نہیں اور واقعی اب وہ ننھی سی بے وقوف گڑیا نہیں لگتی تھی، وہ موٹی سی گندی سی چادر جب سے اس نے اُتار پھینکی تھی۔ وہ باتیں چاہے کتنی بے ربط کرتی لیکن ہوتیں بہت گہری۔

اُس نے بتایا تھا کہ اُس کا کوئی بھائی نہیں ہے، باپ کو تو جب وہ سال بھر کی تھی تب ہی بھگوان نے بلا لیا تھا، دو بڑی بہنیں تھیں جن کی شادی ہو چکی تھی، اور اب صرف وہ ہے جسے اپنی ماں کو کھلانا پڑتا ہے،

"ماں کو کھلانا ....."

"ہاں بی بی جی، میری ماں ڈول نہیں سکتی، دکھائی بھی نہیں دیتا، بی بی جی، اس کے ہاتھ بھی نہیں ڈولتے، وہ کور بھی نہیں لے سکتی۔" اور میرا سر چکرانے لگا۔

اُف یہ ننھی سی لڑکی کتنی ذمہ دار ہے، کتنی گہری، میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

"بی بی جی، ابھی آئی، بس کھانا کھلا آؤں ماں کو۔" اور ہر شام پھر یہی جملہ گونجتا۔ کیا کروں ماں بھوکی ہوگی، جلدی پہنچوں۔"

میں نے کبھی ان ننھے ننھے جملوں پر غور نہیں کیا تھا، سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا مطلب یہ ہوگا، ماں بھوکی ہوگی، اس لئے نہیں کہ بیٹی کے ساتھ کھانا کھائے گی بلکہ اس لئے کہ وہ کھانا کھانے سے مجبور ہے۔

میری آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں، وہ ہنسنے لگی۔

"بی بی جی میں سبجی بنا لیتی ہُوں، صبح بنا کر سب رکھ آتی ہُوں!"

اَب مجھے وہ ننھی کچھ اور بڑی بلکہ پورے قد کی عورت لگنے لگی، معصوم گڑیا جس کے اندر ذمہ دار مرد اور ذمہ دار عورت دونوں چھپے ہُوئے تھے، وہ کماتی تھی اور ماں کو کھلاتی تھی۔

"بی بی جی!" وہ چنچناتی آئی۔ "بی بی جی نصیرے سے کہو بیگن میں بناؤں گی۔" میں ہنسنے لگی۔

"کیسے بناؤ گی۔؟ گیس تک پہنچ جاؤ گی۔؟"

"پٹری رکھ لوں گی بی بی جی!"

میری اجازت پا کر وہ اعتماد کے ساتھ باورچی خانہ جا کر سبزی بناتی اور پھر کھانے کی میز پر اس انتظار میں کھڑی رہتی کہ بابو جی یا میں کہوں کہ سبزی بہت اچھی بنی ہے"!

کچھ دنوں سے اس کی، نصیر اور ودّیا دونوں سے بنتی نہیں تھی، دونوں ہی عمر میں اس سے بڑے تھے لیکن وہ دونوں سے اپنے کو برتر سمجھتی! اور ہر بات میں وہ دونوں سے سبقت لیجانا چاہتی تھی' کچھ ہی دنوں بعد اس نے فرمائش کی۔

"بی بی جی دُوسری کوٹھی میں چھوڑ دوں گی!

"کیوں ___؟ ذرا دیر کا تو کام ہوتا ہے!"

"نہیں بی بی جی ___ وہ ___ بابو جی......"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"ہاں بی بی جی! مجھے بابو جی نہیں اچھے لگتے دِن کے ___!"

میں نے دیکھا اس کے چہرے پر بجائے خوف یا نفرت کے اعتماد تھا، اور وہ دونوں بھوئیں کو چڑھائے خاموش تھی۔

"ٹھیک ہے چھوڑ دو، دن رات یہاں رہا کرو، پیسے بڑھا دوں گی:"

تو بی بی جی دُوسری بھی چھوڑ دوں۔؟ جیسے اس کی مُراد پُوری ہو گئی ہو۔

"ہاں چھوڑ دو!"

اور پھر دوسرے ہی دن وہ صبح ودّیا کے ساتھ ہمارے پاس آئی۔

"بی بی جی ___ آپ ودّیا کو اب چھٹی دے دو، وہ ہماری دُوسری کوٹھی لے لے گی۔!"

میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں بی بی جی ___ اتنے پیسے بے کار کیوں دو ___؟ میں جو ہُوں، سب کام میں ہی اٹھا لوں گی۔"

اور کچھ دنوں بعد تو وہ باقاعدہ رہنے ہی لگی ___ اپنی ماں کو جائے بلانے جاتی۔ کھانا کھلانے جاتی اور پُورے وقت خوش خوش سارے گھر میں چہکتی رہتی۔ لیکن نصیر سے اس کی لڑائی ہر وقت رہنے لگی، اور دونوں میں یہ کھینچا تانی ہوتی رہتی کہ زیادہ مالک کون ہے۔؟

مہینے گزر گئے۔

اور پھر ایک دن اچانک دمینتی نے بتایا۔

"بی بی جی، اس مہینے کے بعد نہیں آؤں گی۔"

میں تعجب میں رہ گئی، مجھے خاموش پا کر فوراً بولی

"آپ کو دوّیا بھر لگا دوں گی!"

"لیکن تو کیوں جا رہی ہے۔؟"

"بس ماں نہیں مانتی بی بی جی ـــــ ٹھیک ہے بی بی جی ـــــ مجھے جانے دو ـــــ اور

پھر وہ چلی گئی۔

چھ سال گزر گئے! ان چھ برسوں میں بھی کبھی وہ اس گھر سے رشتہ توڑ نہ سکی، کوٹھیوں میں کام کرتی، کوٹھیوں سے ملے ہوئے خوب صورت شلوار سوٹ پہنتی اور دھیرے دھیرے وہ بڑی ہو گئی۔ کبھی کبھی وہ گیٹ پر آ کر شمارئے کے ساتھ کھیلتی، کبھی چھیڑتی ـــــ اور پھر اچانک ایک دن وہ گیٹ پر سے ہی بول پڑی۔

"بی بی جی، کام کرواؤ گی۔؟" میں چونک پڑی۔

"کتنی کوٹھی کرتی ہے۔؟"

"پانچ!"

"ارے ـــــ کام بہت نہیں ہو جائے گا۔؟"

"نہیں بی بی جی ـــــ مجھے کام تو چاہیئے!"

"کیوں، ماں ٹھیک ہے۔؟"

"ہاں بی بی جی!" کہتی ہوئی اندر آ گئی۔ "اس کو ٹی بی ہے بی بی جی!"

"کس کو ـــــ؟"

"کس کو بتاؤں ـــــ؟" اور لجا کر سمٹ سی گئی۔ "وہ ..... میرے ......"

"ارے ـــــ کیا تیری شادی ہو گئی۔؟"

"ہاں بی بی جی!"

وہ میرے سامنے کھڑی تھی، اب بھی وہ دس بارہ برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ دبلی پتلی سانولی سی لڑکی ـــــ میں چونکی۔

"ارے ___ کس سے ہوئی شادی۔؟"

"وہی بی بی جی ___ جب میں آپ کے یہاں رہتی تھی، میری بہن کا دیور، وہ جو موٹا سا تھا ___ میری ماں کو سائیکل پر ڈال کر لایا تھا ایک بار ....." اور میری یادوں میں ایک دھندلا سا خاکہ اُبھرا۔ بھرپور، جوان، گٹھے بدن کا، میانہ قد۔

"ارے ___ وہ تو تم سے بہت بڑا ہوگا ___؟"

"ہاں بی بی جی ___ کہتے ہیں اٹھارہ سال بڑا ہے!"

"پھر اس سے شادی کیوں کرلی ___؟" میں نے بے خیالی میں سوال کیا۔

"بی بی جی، ماں نے کردی ___ وہ میری ماں کے پاس ہی رہے گا۔!"

"اور تم.....؟"

"ہاں بی بی جی ___ میں یہیں رہوں گی ___ کوٹھیوں میں کام کروں گی ___ پر بی بی جی سب کہتے ہیں، اس کو ٹی بی ہے ___ بالکل پیلا پیلا ہو رہا ہے ___!" اور یہ آوازیں میرے کانوں سے ایسے ٹکرائیں جیسے دُور، رات کی گہری تاریکیوں میں کتے رو رہے ہوں۔

"تم سسرال گئی تھیں۔؟"

"ایک بار گئی تھی بی بی جی!" اور وہ قہقہے کے ساتھ ہنس پڑی۔ "اب گونے کے لئے آیا تھا تب ہی تو پوچھ رہی تھی کہ دُوسری شادی بنانا ٹھیک ہے کیا ___؟ میری گلی والی کہتی ہیں چلی جا ___ کیا دُوسرا کرے گی ___ میری بہن کہتی ہے، نہ جا ___ کسی دُوسری جگہ بٹھا دُوں گی ___!"

"اب بولو، میں کیا کروں بی بی جی ___؟"

میں خاموش رہی۔

اور پھر اُس نے زور سے کندھے جھٹک دیئے۔ جیسے سارا بوجھ دُور اُتار پھینکا ہو اور گیٹ کی طرف چل دی۔

"بی بی جی ___ گونے میں بس دو تین دن کی چھٹی لوں گی ___!" وہ آہستہ آہستہ گیٹ سے دُور جا رہی تھی۔

اس کے تمام جملے آپس میں گڈمڈ ہو کر میرے ذہن میں اُتھل پتھل مچا رہے تھے ___ اور دُور خلاؤں میں نیلے آسمان کی طرف ایک چھوٹی سی ارتھی اُڑ رہی تھی ___ رام نام

ستیہ ہے کی سیڑھیاں اسے پرلوک لئے جا رہی تھیں۔ وہ چیخ رہی تھی۔

"بی بی جی ــــ میری بہن کہتی ہے، اسے چھوڑ دے ــــ دُوسری جگہ بٹھا دو گی"

رام نام ستیہ ہے .....

"گلی والیاں کہتی ہیں ــــ دُوسری جگہ بیٹھنا اچھا نہیں" ستیہ بولو ستیہ ہے

"بدنامی ہوتی ہے نا بی بی جی ــــ!"

اور رام نام ستیہ ہے کی آواز دُور ہوتی جا رہی تھی۔

۱۹۶۸ء

پرچھائیاں

اس نے کئی بار بچپن میں بھی چلتے چلتے ٹھوکر کھائی تھی ـــــ اور اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا ـــــ دیکھ کے چلا کرو ـــــ اور تب اس کی لمبی لمبی پلکیں انجانے میں ہی جھپک گئی تھیں ـــــ اور انجانے پن کا دھندلکا چند لمحوں کے لئے لال. پیلے. ہرے. رنگ کے گولوں میں بٹ گیا تھا ـــــ اسے کبھی کسی نے ایسا نہیں کہا تھا ـــــ جیسا اکثر وہ سوچا تھا ـــــ اس کی زندگی میں کتنی ایسی غلطی ہوئی تھی ـــــ کالی، چکنی سڑک پر اکثر "ژوں" کی آواز سے وہ چونک پڑتا ـــــ اور اسٹیرنگ کا کالا مخمل میں لپٹا ـــــ گدگداسا ـــــ چکر ـــــ اس کی ہتھیلیوں کے بیچ اپنے آپ داہنے ـــــ بائیں۔ مڑجاتا ـــــ ہڈلائٹ کی روشنی میں سیکڑوں دھندلے گولے اُوپر نیچے تیر جاتے ـــــ اور ـــــ وہ ـــــ سڑک کے اندھیروں کو دھوپ سے ڈھکتا ـــــ آگے بڑھ جاتا ـــــ جیسے سارے اندھیروں کو روشنی میں بدل دے گا ـــــ لیکن اس کی گاڑی کے پہئے ـــــ اس کی ساری کوشش کو خوب باریک پیس ڈالتے ـــــ اور اپنے پیچھے پھر وہی دھندلے اندھیرے بکھیر دیتے۔ اس نے کبھی مڑکر نہیں دیکھا تھا ـــــ کہ اس کے کئے پر لمحے کتنی جلدی سیاہی پھیلا دیتے ہیں ـــــ

چھوٹا سا کالا بُوٹ ـــــ نیلی نیکر ـــــ سفید قمیص ـــــ سفید موزہ ـــــ

اور نیلی ٹائی ـــــ اس نے یہ سب محسوس کیا تھا ـــــ یادوں کے پردوں پر سارے رنگ جھلملائے تھے ـــــ لیکن یہ سب کچھ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا ـــــ اماں کی آنکھوں سے برسنے والے سفید فواروں میں وہ نہایا تھا ـــــ اس نے ٹفن کا ڈبہ سنبھالا تھا ـــــ اور پھر گرم گرم گود سے اچک کر رکشہ میں دوسرے بچوں کے ساتھ بیٹھ گیا تھا ـــــ خدا حافظ کی آواز اس نے سُنی تھی اور ہاتھ بھی ہلایا تھا ـــــ شاید ایسا روزانہ اس نے محسوس کیا تھا۔ اپنے چاروں طرف موٹی موٹی دعاؤں کی چادر ـــــ وہ سنبھال سنبھال کر اوڑھتا تھا ـــــ اس میں سنہری آرزوؤں کی بوٹیاں بھی چمکتی تھیں ـــــ دودھ جیسی سفید ـــــ اور ـــــ پاک ممتا ـــــ اس نے کچھ محسوس تو کیا تھا ـــــ لیکن اس نے کچھ دیکھا نہیں تھا ـــــ بس اماں کے سینے سے اُبلتا ہوا میٹھا رس ـــــ شاید اب پائن ایپل جوس کے ڈبوں میں بند ہو گیا تھا۔ اس کی گہری کٹورا جیسی بھیلی ہوئی آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ نہ سکی تھیں ـــــ اور نہ ہی وہ بات اماں نے بتائی ـــــ اسے اماں کی خوشبو پسند تھی ـــــ بھینی بھینی ـــــ اور اسی لئے اُسے اماں سے دُور کچھ دھندلا سا لگتا تھا ـــــ اور اس دھندلکے میں اس نے بہت بار اماں کو ٹٹولا تھا ـــــ لیکن ہاتھ میں صرف خلاء کا لمس محسوس ہوا تھا ـــــ

ایک بار وہ گر پڑا تھا ـــــ اسکول میں ـــــ شاید ہاکی کھیل رہا تھا۔ اور خاکی نیکر کے نیچے ـــــ سانولے پیروں کے بیچوں بیچ گول گول چکر میں سے سُرخی ابل پڑی تھی ـــــ اور آپا کی آنکھوں میں بھی نہ جانے کیا ہو گیا تھا ـــــ وہاں بھی وہی سُرخی گھل گئی تھی ـــــ اور پانی ٹھوڑی تک لڑھکنے لگا تھا ـــــ اس کا دل کچھ گھبرا رہا تھا ـــــ اندر سینے میں گرمی کچھ بڑھ گئی تھی اس نے پوچھا تھا ـــــ آپا تم کو کیا ہوا ـــــ اس نے اماں سے بھی پوچھا تھا۔ اماں ـــــ کیا آپا کے چوٹ لگ گئی ہے ـــــ اس نے اپنے اندر دور کہیں درد بھی محسوس کیا تھا ـــــ اور پھر اس نے آپا کو دیکھا تھا ـــــ وہ بھی پتہ نہیں کیوں دھندلے دھندلے کھڑے تھے ـــــ اور اِدھر اُدھر اس کے چاروں

طرف چھوٹی چھوٹی فراکیں پھڑپھڑا رہی تھیں ــــ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ــــ وہ کچھ نہیں جان سکا ــــ یہ سب گورکھ دھندا ہے یا کوئی تماشہ ــــ لیکن وہ اپنے آپ کو بہت اہم لگا تھا ــــ اسے گرمی ضرور لگ رہی تھی ــــ میٹھی میٹھی گرمی ــــ اس نے دیکھا کچھ نہیں تھا ــــ لیکن اس نے محسوس ضرور کیا تھا۔ شاید ہلکا گلابی سا ــــ

نہ جانے کیوں چاروں طرف خاموشی تھی ــــ فضا خود سے بوجھل سی بن گئی تھی ــــ اس نے تو خود ہاسٹل جانا طے کیا تھا ــــ اتنی بڑی ڈگری کے لئے اسے دکن تو دکن شاید سمندر پار بھی جانا پڑ سکتا تھا ــــ دُوریاں کتنی لمبی ہو سکتی ہیں ــــ اسے نہیں معلوم تھا ــــ دُور بہت دُور ــــ راس کماری ہے اور پھر ــــ لنکا ــــ لیکن لنکا کا چھوٹا سا لٹکتا ہوا ٹکڑا اکئی بار ــــ اس نے نگلنا چاہا ــــ نگل بھی لیا ــــ حلق صاف ہو گیا ــــ لیکن آپا کا رنگ سُرمئی لگ رہا تھا ــــ اماں سفید ــــ اور ابا چٹان بن گئے تھے ــــ چھوٹی چھوٹی فراکیں جو ہمیشہ ناچتی رہتی تھیں ــــ پتنگوں کی طرح ــــ اس کے چاروں طرف ــــ سب جیسے ہینگر میں لٹکا دی گئی ہوں ــــ یہی سب کچھ تھا ــــ گھر میں اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے ــــ وہ جا رہا تھا ــــ آپا نے بے شمار گرم گرم موتی کپڑوں کی تہوں میں سجا کر سوٹ کیس میں بند کر دیا تھا ــــ ہولڈال ــــ سوٹ کیس ــــ باسکٹ ــــ سب کو اماں نے ٹھنڈی سفیدی میں لپیٹ دیا تھا ــــ اور مجھے شاید سر سے پیر تک برقعہ پہنا دیا تھا۔ پورا پورا اس کے اندر اچھی طرح سے چھپا دیا گیا ــــ اور پھر اماں ــــ آپا ــــ اور کئی محبتوں نے قرآن شریف کے نیچے سے ہمیں گزار کر سکون کا سانس لیا تھا ــــ چاروں طرف سناٹا تھا ــــ جیسے کچھ ہونے والا ہو ــــ یا کچھ بہت اہم ہو چکا ہو ــــ

اور میں درختوں، کھیتوں اور مکانوں کو جلدی جلدی پیچھے چھوڑ رہا تھا یا وہ سب بڑی تیزی سے مجھے کچھ بتانے ــــ کچھ دکھانے ــــ کھڑکی کے سامنے آتے ــــ اور لمحے انھیں جھٹکے کے ساتھ پیچھے دھکیل دیتے ــــ آآں۔ اور

آپا نے کھانا نہیں کھایا تھا شاید — مجھے ہلکا سا محسوس ہوا — اور گلے میں لنکا پھر اٹک گئی — ماتھے پر ٹھنڈی سی نمی ابھر آئی تھی — میں نے زور سے کھنکارا — گلا صاف کیا — اور اخبار کو پھیلا لیا — شاید پڑھنا چاہتا تھا — لیکن وہاں صرف زرد پیلے رنگ پھیلے تھے — اور پھر — اب سُرمئی رنگ میں ڈھک گیا تھا — میں نے یہ سب شاید صرف محسوس کیا تھا — میری گہری چمکتی آنکھوں کے پیچھے دور یہ سب کچھ ہوا تھا — یا ہو رہا تھا — اور میں —

میں پالم کے رن وے پر دوڑتے ہوئے ایرانڈیا کے اس پلین کا انتظار کر رہا تھا جو مجھے لندن ایرپورٹ پر اتارے گا — اور پھر — میں وہاں سے چیمسفورڈ جاؤں گا — وہاں میرا کالج ہے — ایک بار پھر اس کے سَر میں پیچھے کی طرف — ساں — ساں — کی آواز گونجی — ابا کے لاکھوں روپے کی آواز — جھن جھن کرتی اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی — لیکن ابا — وہ تو بس بالکل خاموش تھے — جھن جھن کی آواز — اس کے بیر دل پر لوٹتی رہی — لیکن اسے کچھ دکھائی نہیں دیا — چاروں طرف نیلگوں اندھیرا اڑ رہا تھا — ابا کے سانولے چمکدار چہرے پر گہری خاموشی تھی۔ ترشے ہوئے خوب صورت ہونٹ — اُداس اُمڈی آنکھیں — اور تھکے ہوئے بے بس ہاتھ پیر جو اپنے اکلوتے کو روک نہ سکتے تھے — پھڑپھڑاتے رہے — اور جہاز نیلے بلند سمندر میں گھستا چلا گیا —

اس نے یہ سب کچھ دیکھا نہیں تھا — وہ سامنے تھا — محسوس تو کر سکتا تھا — لیکن اُسے یہ سب کچھ صاف صاف دکھائی نہیں دیا تھا — اور نہ ہی کسی نے یہ بتایا تھا کہ تم یہ سب کچھ دیکھو — دیکھ سکتے ہو — جو وہ نہیں دیکھ پاتا تھا —

پھر — کبھی کبھی — وہ دیکھنے کی کوشش کرتا تھا — دیکھنا چاہتا تھا — اور دیکھنے کے لئے ہزاروں میل کی اڑان بھر کر آتا تھا —

لیکن پھر بھی وہ صاف صاف کچھ نہیں دیکھ سکا تھا ـــــ پگھلتی ہوئی۔ امّاں ـــــ رتّی ـــــ رتّی ـــــ جھکتے ہوئے ابّا ـــــ سُرخ لباس کی منتظر مہکتی ہوئی فراکیں ـــــ اور نیلی پیلی برچھیوں سے اندھی آپا ـــــ وہ سب کے لئے ہے اسے اتنا ضرور معلوم تھا ـــــ اس نے اپنے چاروں طرف مہک محسوس کی تھی ـــــ لیکن اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے اندھیروں کو اس نے کبھی نہیں دیکھا ـــــ کیوں کہ اندھیرا پیچھے تھا ـــــ اور وہ سامنے دیکھنا چاہتا تھا ـــــ وہ سب کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ ہے ـــــ روشنیاں جلادو ـــــ رشتہ دار ـــــ دوست احباب ـــــ سب کے لئے ہے ـــــ اسے اس کا بڑا خوف تھا ـــــ سب کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے ـــــ اس نے بکھوری اینٹوں سے بھی بڑے بڑے تحفوں کی بارش کر دی ـــــ سروں پر پٹیاں بندھ گئیں ـــــ لیکن یہ بھولنا مشکل ہو گیا کہ وہ ہے ـــــ بلکہ ناممکن ہی تھا ـــــ اس نے یہی کیا ـــــ ابّا ـــــ امّاں ـــــ آپا ـــــ اور مہکتی جھومتی ہوئی چمپا کی ڈالیاں ـــــ سب پر اپنے ہونے کا یقین لاد دیا ـــــ اور جہاز گہرے سمندر میں اونچی نیچی لہروں پر جھک جھک کرتا آگے بڑھ رہا تھا ـــــ اسے یہ معلوم تھا ـــــ اس کا سب کچھ ہے ـــــ جہاں تک اس کا ہاتھ بڑھ سکتا ہے ـــــ سب کچھ اس کا ہے ـــــ اس کے سنہرے روپہلے ـــــ ریشمی نرم تحفے اس کے ہونے کا احساس جگاتے ـــــ جن میں خون کی گرمی ہوتی ـــــ سُرخی ہوتی ـــــ اس کی واپسی پر کئی خوب صورت رنگ اس کے ساتھ چلے جاتے ـــــ اور گہرا سرمئی رنگ بہت دنوں میں ہلکا پڑتا ـــــ اسے شاید یہ سب معلوم تھا ـــــ لیکن یقین نہیں تھا ـــــ اس نے جو یہ سب دیکھا نہیں تھا ـــــ کسی نے دکھانے کی کوشش بھی تو نہیں کی ـــــ کہ اس کے بعد اس بڑی سی پینٹنگ کے خوب صورت رنگ گہرے گہرے موٹے پیچیز سارے کے سارے سُرمئی لبادہ اوڑھ لیتے ہیں ـــــ جن میں کبھی کبھی کوئی ہلکے رنگ شاید ہی ابھرتے ہوں ـــــ

اور اب تو اس کے گھر میں رنگین چراغ جل چکے تھے ـــــ ان چراغوں

کے لئے ابّا اور امّاں نے کتنا خون دیا تھا ــــ کتنے رنگ اپنی زندگی کے مٹا کر ان پر چپکا دیئے تھے ــ چنبیلی اور چمپا کی ساری مہک دھواں دھواں چراغوں کے آس پاس منڈلا رہی تھی ــــ لیکن وہ تو ایک طرح سے خدا ہی تھا ــــ نا ــــ اور پھر ــــ دھیرے دھیرے وہ دیوتا بنتا گیا ــــ اس پر دودھ بھی ڈالا گیا تو بغیر کوئی دھبہ ڈالے لڑھکتا ہوا نیچے گہرائیوں میں جذب ہو گیا ــــ شاید زمین کا سینہ کچھ نرم پڑ گیا ہو ــــ

اس نے یہ بھی سنا تھا کہ ابّا نے دنیا چھوڑتے ہوئے اس کی تصویر سے بے خبری میں کتنی ہی باتیں کی تھیں ــــ ان کا یہ خوف کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے ــــ کتنی آسانی سے پورا ہو گیا تھا ــــ جس لمحہ کا انھوں نے پتھر بن بن کر انتظار کیا تھا ــــ وہ لمحہ ٹوٹتے کتنی آسانی سے نگل لیا تھا ــــ اور ــ چھوٹی بڑی چیخوں نے دور تک ابّا کا ساتھ دیا تھا ــــ شاید جنّت کے دروازے تک ــ ابّا کے ہونٹوں سے ابھرتی ہوئی آخری آوازیں ــــ اماں. آپا اور بہنوں کے سینوں میں محفوظ ہو گئیں ــــ سب کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتے ہوئے ابّا نے ایک سب سے مضبوط ہاتھ کی کمی محسوس کی تھی ــــ اور ان کی گہری گہری آنکھیں نم ہو کر ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

یہ سب میں نے سُنا تھا ــــ میں نے محسوس کیا تھا ــــ میرا دل نہ جانے کیوں اوپر نیچے بھی ہوا تھا ــــ اور میری آنکھوں کے سامنے سرخ ــ نیلے پیلے گولے ناچتے ناچتے سرمئی ہونے لگے تھے ــــ میں کچھ دیکھ نہ سکا ــ میں نے کبھی کچھ دیکھا نہیں ــــ میں عینک نہیں لگاتا ــــ ڈاکٹر کہتے ہیں میری نظر بالکل ٹھیک ہے ــــ لیکن ــــ مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ میں اندھا تھا ــــ سیکڑوں اندھوں میں سے ایک تھا ــــ بچپن سے اب تک میں کچھ نہ دیکھ سکا ــــ اور اب ــــ اب اندھیرا بہت گہرا اور بھیانک ہو چکا ہے ــــ

۱۹۷۳ء

سَودا

اس نے کھڑکی کھولی اور چھلانگ لگا دی ___ کہ زندگی نے اسے موت کی آغوش میں سو جانے کو مجبور کر دیا تھا ___ لیکن بھلا ہو اس سرسبز و شاداب درخت کا کہ جس کی شاخوں نے اسے زمین پر آنے سے پہلے ہی گود میں روک لیا تھا ___ تھوڑا سا شور تو ہوا ___ لیکن جب آشا رانی درخت کے نیچے کھڑی دبی دبی آوازیں دہائی دے رہی تھی ___ اور درخت کی شاخوں میں ایک رنگین سی گٹھری الجھی ہوئی تھی ___ تو پہلے تو ایک دو لوگ ٹھہرے پھر تھوڑا سا مجمع اکٹھا ہو گیا ___ قریب کے گھروں کی کھڑکیاں کھل گئیں ___ ان میں سے کچھ عورتیں لٹک کر نیچے دیکھنے لگیں ___

اور جب وہ رنگین کپڑوں کی گٹھری نتھو اور گوبند سنبھال کر درخت سے اتار لائے تو آشا رانی جلدی جلدی گھر کے اندر لے چلنے کو کہہ رہی تھی ___ اسکی گوری گوری چربی سے لدی باہیں لوگوں کو دور رکھنے کے لئے اِدھر اُدھر بڑی پھرتی سے اُچھل رہی تھیں ___

"خود کشی کا کیس ہے ___ " کسی طرف سے آواز آئی ___

"کون کہتا ہے ___ ؟" وہ مڑ کر غرّائی ___ "ارے کھڑکی سے پیر کھسل گیا اور گر گئی ___ بس ___ خوب آتا ہے بات کا بتنگڑ بنانا ___ "

رنگین سی گٹھری جب زمین پر پھیلائی گئی تو سانولی سلونی سی ایک

لڑکی بے ہوش پڑی تھی ــــ جس کے جسم سے جگہ جگہ خون رس رہا تھا ــــ سارا جسم خراشوں سے زخمی تھا ــــ

"ارے منہ کیا دیکھ رہا ہے ــــ جلدی کر ــــ" وہ گوبندا سے کہہ رہی تھی ــــ اور بار بار ــــ ہائے میری بچّی ــــ ہائے میری کلا ــــ کہہ کر چیخ رہی تھی ــــ گوبندا نے جلدی سے بے ہوش لڑکی کو نتھو کی مدد سے اُٹھایا اور گھر کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ پولیس والے کی آواز نے جیسے اس کے قدم باندھ دیئے ــــ آشا رانی خوشامد کرنے لگی ــــ

"ارے انسپکٹر صاحب ــــ! کیا لفڑا کر رہے ہو ــــ میری بچّی کی جان چلی جائے گی ــــ"

"نہیں ــــ آپ ان کو لے کر اسپتال چلیئے!" کہتے ہوئے وہ مجمع کو ہٹانے لگا ــــ اب تک مجمع میں کافی خاکی وردیاں چمکنے لگی تھیں ــــ

اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں کلا کو ہوش میں لانے کی کوشش ہو رہی تھی ــــ اور آشا رانی کا منہ فق تھا ــــ گداز بدن ــــ چھوٹے قد کی آشا رانی، واقعی کبھی رانی لگتی ہو گی ــــ

"آپ باہر ٹھہریئے ــــ!" ڈاکٹر نے کئی بار کہا ــــ اور آشا رانی اَن سُنی کرتی گئی ــــ پھر ایک سپاہی اس کو بلا لے گیا ــــ رپورٹ لکھوانا تھی ــــ اور وہ بغیر آشا رانی کے بیان کے مکمل کیسے ہوتی ــــ وہ جلدی جلدی بول رہی تھی

"ہزار بار منع کیا کھڑکی پر چڑھ کر کچھ نہ کیا کر ــــ پر اس کی مَت ماری گئی ــــ ہمیشہ وہیں کھڑی ہو کر گھڑی میں چابی دیتی ہے ــــ مُوا کلاک کھڑکی کے اُوپر لٹکا رکھا ہے ــــ چڑھی ہو گی اور پھسل گئی ــــ" وہ روہانسی ہو گئی ــــ اور ساری کے پلّو کو آنکھوں پر ملنے لگی ــــ پھر اس نے سُنا ــــ ہوش آ گیا ہے ــــ خطرے سے باہر ہے ــــ اور اسے لگا اس کے چاروں طرف خطروں کا جنگل اُگ آیا ہے ــــ اس نے ہمّت کر کے برآمدے سے اندر کی طرف جھانکا ــــ کلا کے بڈ کے پاس اب بھی کئی ڈاکٹر جھکے ہوئے تھے ــــ

آج سے پہلے بھی کئی بار اُس کا سامنا پولیس سے ہُوا تھا ــــ پر نہ جانے کیوں آج آشارانی کچھ زیادہ ہی گھبرا رہی تھی ــــ

"تو آشارانی صاحبہ ...... یہ آپ کی بیٹی ہیں ــــ!" اور آشارانی پُوچھنے والے کی طرف جھٹ سے مڑ گئی ــــ

"تو بھلا ــــ میں جھُوٹ کیوں بولنے لگی ــــ" اور پھر ذرا ٹھہر کر اس کی طرف دیکھتے ہُوئے بولی ــــ "آپ کا علاقہ کون سا ہے انسپکٹر صاحب ــــ جو کچھ کہئے گا سب منظور ــــ"

"بک بک بند کرو ــــ!" ایک کرخت آواز گونجی اور وہ سہم گئی ــــ اس نے پھر وارڈ میں نظر ڈالی ــــ اب کلا کے پاس سے ڈاکٹر جا چکے تھے. اور وہ بڈ پر سیدھی مُردہ جیسی پڑی تھی ــــ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا ــــ باہر آتی ہُوئی نرس سے اس نے پُوچھا ــــ

"کیا ختم ......؟"

"نہیں جی ــــ وہ ہوش میں آ چکی ہے ــــ!" یہ سُنتے ہی آشارانی کا سارا جسم کانپ گیا ــــ زمین اس کے پیروں تلے سے یوں سرکنے لگی جیسے مٹھی میں بھری بالو ــــ

کلاوتی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں ــــ پھر اس کی ٹھہری ہُوئی پتلیاں اُوپر نیچے ڈولیں ــــ اور آنکھیں پھر بند ــــ

اس کے کانوں میں آواز آئی ــــ خطرے سے باہر ہے ــــ وہ آہستہ سے بڑبڑائی ــــ "نہیں ــــ مجھے بچاؤ نہیں ــــ مجھے مر جانے دو ــــ مر جانے دو مجھے ــــ"

"تم اب ٹھیک ہو ــــ آنکھیں کھولو ــــ" سسٹر کی شفیق آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ــــ

اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں ــــ جن میں ہزاروں کرب اُگے ہُوئے تھے ــــ سفید براق بردوں والی سسٹر کے پیچھے اسے خاکی

رنگ ڈولتا نظر آیا ـــــ اور اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں ـــــ وہ بڑبڑائی۔
"میں زندہ ہوں ـــــ سچ مچ میں زندہ ہوں ـــــ پر کیوں ـــــ؟ بھگوان ـــــ
تو نے بھی ٹھکرا دیا ـــــ" سسٹر کا نرم ریشم جیسا ہاتھ اس کے ماتھے پر رینگا
"ایسے مت بولو ـــــ بھگوان کو دوش مت دو ـــــ شکر ادا کرو۔
تم بالکل ٹھیک ہو ـــــ زندگی تو وردان ہے ـــــ اس سے منھ موڑنا۔
بزدلی ہے ـــــ زندگی کی توہین ہے ـــــ" اس نے پھر آنکھیں کھول دیں ـــــ
"تمھاری ماں باہر ہے کلا ـــــ کیا بلا دوں؟"
"نہیں ـــــ نہیں ـــــ میری کوئی ماں نہیں ہے ـــــ میرا اس دنیا
میں کوئی نہیں ہے!" اور پھر وہ رک گئی ـــــ قریب بیٹھے اور قلم چلاتے ہوئے
کانسٹبل پر اس کی نظر جم گئی ـــــ
"یہ تمھارا بیان لکھ رہے ہیں ـــــ!" سسٹر نے نرمی سے بتایا ـــــ
"تو لکھ لو ـــــ میں مرنا چاہتی ہوں ـــــ میں مرنا چاہتی ہوں۔
میرا اس دنیا میں اب کوئی نہیں ہے ـــــ!" اور پھر اس نے آنکھیں بند
کر لیں ـــــ سسٹر نے اس کا ہاتھ تھام لیا ـــــ اور ہمدردی کی نمی اس کی
انگلیوں سے گزر کر اس کے سارے جسم میں سرائیت کر گئی ـــــ سسٹر نے
دھیرے سے پکارا ـــــ
"کلا ....." اور اس نے سسٹر کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے کہا
"سسٹر ـــــ میرا نام کلا نہیں ہے ـــــ میں تو پارو ہوں ـــــ
اس نے مجھے کلا کیوں بنا دیا ـــــ؟ سسٹر ـــــ! میں تو اس کی گھر والی تھی۔
پھر اس نے ایسا کیوں کیا ـــــ؟ اس نے تو مندر میں میرا ہاتھ تھاما تھا۔
مجھے دھرم پتنی کہا تھا ـــــ میری مانگ سیندور سے لال ہو گئی تھی ـــــ"
وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی ـــــ "سسٹر! میں کلکتہ سے آنا نہیں چاہتی تھی
پر ....." اور پھر وہ خاموش ہو گئی ـــــ
سسٹر نے پھر کہا ـــــ ہاں ہاں بولو ـــــ! تمھارا بیان لکھا جا رہا ہے"
اور ـــــ پارو ـــــ کلکتہ کی گھنی آبادی والے علاقہ کی ایک گلی میں

اسٹیپو کھیل رہی تھی ــــ ایک ننھی سی کنکری پشت کی طرف سے پھینک کر کوئلے سے زمین پر کھینچے ہُوئے خانوں میں ایک پیر سے اُچک اچک کر، گھر بنا رہی تھی ــــ اس کے گھر کئی خانوں میں بن چکے تھے ــــ جن میں وہ دونوں پیروں کو ٹکا سکتی تھی ــــ اس کی سہیلی شیلا ــــ اس سے جلنے لگی تھی ــــ اور چھریرے بدن والی سانولی سی پارو ــــ اپنی بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھوں کو نچا نچا کر چڑھا رہی تھی ــــ میرے تو تین گھر بن گئے ــ اور پھر معاملہ بگڑتے دیکھ وہ فوراً شیلا سے بولی۔

"اچھا ــــ تو بس جا میرے ایک گھر میں ــــ!"

"میری جوتی بسے تیرے گھر میں ــــ" کہتی ہوئی شیلا نے کوئلے سے بنی ہُوئی ساری لکیریں زمین سے مٹا دیں اور پھر انگوٹھا دکھاتے ہُوئے بولی تھی ــــ "جا بس جا تینوں گھروں میں ــــ میں نے سب مٹا دیں ــــ" اور پارو کا دل درد میں ڈوب گیا تھا ــــ جیسے سچ مچ اس کے گھر اُجڑ گئے ہوں۔ وہ روہانسی ہو کر قریب ہی بنے دروازے کے زینہ پر بیٹھ گئی تھی ــــ اور اس کی پھیلی پھیلی آنکھیں چھلک آئی تھیں ــــ اس نے سوچا تھا اب وہ کبھی نہیں کھیلے گی ــــ ان بے منٹیوں سے ــــ لیکن جیسے ہی زمین پر کوئلے سے خانے اُبھرتے ــــ وہ پھر لنگڑی ٹانگ سے کود کود کر گھر بنانے لگتی۔

پھر اچانک ایک رات اس کا بابو گھر نہیں لوٹا تھا ــــ سارے آس پاس والے اُمنڈ آئے تھے اس کے گھر میں ــــ اور ماں زمین پر بیٹھی چیخ چیخ کر رو رہی تھی

بابو اس کو بہت پیار کرتا تھا ــــ پر وہ آیا کیوں نہیں ــــ؟ یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا ــــ وہ روتے روتے سو گئی تھی ــــ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی کوٹھری میں صرف ماں اور راجو ہی باقی ہے ــــ

شیلا نے اسے بتایا تھا ــــ اس کا بابو مر گیا ہے ــ اس نے ماں سے پوچھا بھی تھا ــــ "بابو کیوں مر گیا ماں ــــ یہ مرنا کیا ہوتا ہے؟" اور ماں نے بتایا تھا ــ "سنسار کے جھگڑوں سے دُور ــــ بھگوان کے پاس

چلا جانا ہوتا ہے۔"

"تو ماں ــــ ہم لوگ بھی چلیں بھگوان کے پاس ــــ وہاں باپو مل جائے گا ــــ" اور ماں نے اسے جھڑک دیا تھا ــــ "ایسے نہیں بولتے۔"

پھر اس کی ماں ــــ باپو کی جگہ فیکٹری میں جانے لگی تھی ــــ اور وہ ــــ اور راجو پاس والے اسکول میں ــــ ماں کا پیار جیسے امنڈ آیا تھا۔ وہ فیکٹری سے آتے ہی جلدی جلدی روٹی بناتی ــــ دونوں کو باری باری گلے لگاتی ــــ پیار کرتی ــــ اور کہتی ــــ

"راجو کو میں بابو بناؤں گی ــــ اور ــــ اور رُوپا تو پڑھ لکھ کر ٹیچر بن جائیو ــــ پھر تیرا بیاہ بھی کسی بابو سے ہی کروں گی ــــ" اور ــــ دھیرے دھیرے باپو کا سایہ دھندلا ہونے لگا تھا ــــ اور دنوں کی کڑیاں گھومتی رہیں ــــ

پھر ایک دن پتہ نہیں کہاں سے بہتا ہوا ــــ چاچا آکر اس کے دروازے سے ٹک گیا تھا ــــ اس کو اچھا نہیں لگا تھا ــــ راجو نے بھی اس کی طرف گھور کر دیکھا تھا ــــ اور اس نے چاچا کی پیٹھ مڑتے ہی زبان بھی دکھائی تھی ــــ پھر چاچا روز ماں کے ساتھ ہی آنے جانے لگا ــــ وہ ہمیشہ ان دونوں کو بڑی اجنبی نظروں سے دیکھتا ــــ گھورتا۔ اور یہ دونوں جلدی سے اِدھر اُدھر کھسک جاتے۔

پھر دھیرے دھیرے پتہ نہیں کیسے اس نے ماں کی ساری ممتا چوس لی تھی ــــ اور وہ اور راجو دونوں ہی بھٹکنے لگے تھے ــــ گھر پر چاچا کا حکم چلنے لگا تھا ــــ ماں کے ماتھے پر چمکنے والی بندیا میں اسے ہر دم چاچا نظر آتا ــــ اور وہ تنہائی میں بھی کبھی ماں سے کچھ نہ کہہ پاتی ــــ اسکا دل اُداس ہو گیا تھا ــــ اسے اب باپو بہت یاد آنے لگا تھا ــــ اور راجو بھی کچھ نہ بولتے ہوئے گھر کے برتن کھڑے کھڑے پھینکنے لگا تھا۔ گھر میں ماں اور چاچا کے آتے ہی جیسے ہمارا گھر چھن جاتا ــــ سر سے چھت اُڑ جاتی اور میدانوں کی سائیں سائیں کرتی ہوائیں کانوں سے

ٹکرانے لگتیں ـــــ راجو چھوٹا تھا ـــــ وہ بہانے بہانے ماں کے ارد گرد۔
چکّر کاٹ آتا ـــــ کبھی کبھی ماں لاڈ بھی کرتی ـــــ اس کو بابو بنانے کی
بات بھی دہراتی ـــــ لیکن بس ایسے ـــــ جیسے پت جھڑ سے گرا ہوا ایک پتّہ
ہوا کے دوش پر اُڑتا ہوا آئے اور کندھوں سے چھوتا ہُوا دُور جا گرے ـــــ
چاچا اور ان دونوں کا رشتہ بس ڈانٹ ڈپٹ یا دو چار کام کرانے سے آگے
کبھی نہیں بڑھا ـــــ

اور اب تو اسے چاچا کا گھورنا بہت اکھرنے لگا تھا ـــــ پتہ نہیں ان
آنکھوں میں کیا تھا ـــــ کہ وہ خوف سے لرز جاتی ـــــ راجو بھی ـــــ اِدھر
اُدھر بھٹکنے لگتا ـــــ اس نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا ـــــ پھر ایک دِن
ماں کی شکایت پر رحیم چاچا نے اسے سمجھایا تھا ـــــ اور وہ پڑھائی چھوڑ
کر رحیم چاچا کے ساتھ کام پر جانے کو راضی ہو گیا تھا ـــــ باردو۔ اب
اور بھی اکیلی ہو گئی تھی ـــــ اس کے اندر نہ جانے کہاں سے اتنا
بھیانک خوف آکر سما گیا تھا ـــــ کہ اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے
ہونے لگا تھا ـــــ

پھر ایک دن ـــــ چاچا اور ماں میں پتہ نہیں کس بات پر جھگڑا ہوا
اور چاچا نے ماں کو خوب پیٹا ـــــ راجو بھی آچکا تھا ـــــ ہم دونوں خوف
سے کانپ رہے تھے ـــــ اور ماں ـــــ سسک سسک کر رو رہی تھی ـــــ
پھر راجو نے رات میں آنا بھی چھوڑ دیا ـــــ گھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور
وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی ـــــ

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ـــــ اور قریب کرسی پر بیٹھی
سسٹر کھڑی ہو گئی۔ "سو گئی تھیں باردو ـــــ؟"
"ہاں سسٹر ـــــ! میں سو گئی تھی ـــــ مجھے بھگوان کے واسطے سونے
دو ـــــ اس اسپتال کی گود میں مجھے اتنا سکون ملا ہے کہ میرا ماضی مجھ سے
لپٹ لپٹ کر رو رہا ہے ـــــ جیسے میں بہت دُور چھوڑ آئی تھی ـــــ

وہ تنہائیوں کے گھور اندھیرے میں پھر بھٹکنے لگی تھی ـــــ اَب

اس کی ماں بھی اس سے دُور ہوتی جا رہی تھی ـــــ چاہتے ہُوئے بھی وہ اپنی ماں کے قریب جاتے ہُوئے خوفزدہ ہو جاتی ـــــ

ماں صبح چاچا کے ساتھ ہی فیکٹری چلی جاتی ـــــ اور اسے محسوس ہوتا ـــــ ماں اس سے کچھ کہنے والی تھی ـــــ اور وہ بھی ماں سے کچھ کہنا چاہتی تھی ـــــ گلے لگ کر رونا چاہتی تھی ـــــ لیکن وہ بنا کچھ کہے ـــــ اس کی طرف بولتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی چاچا کے ساتھ دُور چلی جاتی۔ اور وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتی ـــــ وہ سوچتی ـــــ ماں کو کیا ڈر ہے ـــــ وہ کیوں اور کیسے بدل گئی ہے ـــــ کبھی تو تنہائی میں سینے سے لگا کر پوچھ لیتی ـــــ پارو، کہدے جو کہنا ہے جلدی سے ـــــ ورنہ چاچا آ جائے گا۔ اور وہ بنا کچھ کہے اس کی گود میں منھ چھپا کر خوب رو لیتی ـــــ اور یہ اجنبیت کا ریگستان اپنے آنسوؤں سے بہا دیتی ـــــ اور ممتا کا ہیرے جیسا چمکتا بیش بہا خزانہ اس کی ترستی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ـــــ اس نے بیچ بیچ بہت بار ماں کے چہرے پر ممتا کا عکس لہراتے دیکھا تھا ـــــ پر نہ جانے کون سا خوف تھا کہ وہ چور نظروں سے دیکھتی ہُوئی ـــــ دُور ہو جاتی ـــــ بہت دُور ـــــ اور ـــــ اس کے ماتھے پر چمکتی ہوئی بندیا میں اسے چاچا اُبھرتا نظر آتا ـــــ

پھر ایک دن ـــــ جب چاچا نے اس کو نہ جانے کیا کیا کہا تھا، گھنی ـــــ چپّی ـــــ مکّار ـــــ جیسے بہت سے نام اس کے وجود پر جڑ دیئے تھے ـــــ پھر بھی وہ خاموش رہی تھی ـــــ اس کی خاموشی سے چڑھ کر چاچا نے جب بھاری بھر کم چپّل اس کی طرف اچھال دی تو ماں نے اسے راستہ میں ہی روک لیا تھا ـــــ ماں کی آنکھوں میں اس نے چھلکتے ہُوئے آنسو دیکھ لئے تھے ـــــ پھر بھی دوڑ کر اس کی گود میں نہ پہنچ سکی ـــــ اُسکے قدم زمین سے چپک گئے تھے ـــــ تھوڑی دیر میں ماں نے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ کمرے کی ساری کڑواہٹ بھی پی لی تھی ـــــ وہ پارو کی جلدی شادی کی بات کرنے لگی ـــــ اور چاچا بھی دوسری باتوں میں لگ گیا

تھا ـــــ جیسے ابھی کچھ ہوا ہی نہ ہو ـــــ ماں روٹی پکانے بیٹھ جاتی اور چاچا کھانا کھانے ـــــ اور اسے چاروں طرف سے تنہائیوں کے سانپ ڈسنے لگتے ماں سے پھر اجنبیت کا رشتہ قائم ہو جاتا ـــــ وہ راجو کو آوازیں دے کر پکارتی ـــــ باپو کو پکارتی ـــــ اور ماں کو بھی ـــــ لیکن ساری آوازیں حلق تک آکر دم توڑ دیتیں ـــــ

پھر اچانک اسے رمیش مل گیا تھا ـــــ ایسے ہی آتے جاتے ـــــ اس نے کئی بار محسوس کیا تھا ـــــ رمیش کی نظریں بہت دور تک اس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں ـــــ پھر ایک دن رمیش نے اس کا نام پوچھ لیا ـــــ نہ جانے کون سی مقناطیسی طاقت تھی کہ انجانے ہی اس کا سارا جسم لہرا کر رہ گیا ـــــ وہ سرخ ہو گئی تھی ـــــ شاید اس کو بھی کئی دن سے اس کا انتظار تھا ـــــ اس کے جسم پر رینگتی ہوئی رمیش کی نظروں کی گرمی ـــــ کئی روز سے اسے بے چین کئے تھی ـــــ

اس نے اپنا نام بتایا ـــــ پارو ـــــ اور رمیش سورداس بن گیا تھا ـــــ پھر وہ روز ملنے لگے تھے ـــــ اور پارو کے اداس دل کی ساری تنہائیاں رمیش نے پی لی تھیں ـــــ

اس نے گھبرا کر پھر آنکھیں کھول دی تھیں ـــــ سسٹر کا چہرہ بالکل اس کے چہرے کے سامنے تھا ـــــ شاید سسٹر اس کے چہرے پر ابھرتے جذبات کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی ـــــ اس نے سسٹر کا ہاتھ تھام لیا تھا ـــــ

"سسٹر! ـــــ وہ سچ مچ مجھے چاہتا تھا ـــــ مجھ سے پیار کرتا تھا اس نے ایسا کیوں کیا سسٹر ـــــ ؟ میں اس کے بچّے کی ماں بننے والی ہوں ـــــ" وہ رونے لگی ـــــ "میرے بچّے کا خون کرنے کے لئے ان لوگوں نے مجھے زبردستی زہر پلا دیا تھا ـــــ لیکن میری ممتا نے اسے امرت میں بدل دیا ـــــ سسٹر! ـــــ رمیش بہت اچھا تھا ـــــ پر اس کو کیا ہو گیا میں تو اسکول سے ہی اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی ـــــ اُس کے

پیار پر مجھے بھروسہ تھا ـــــ اس نے ایک کمرے والے اپنے اکیلے گھر میں لیجا کر رکھا تھا ـــــ اور ـــــ اور ـــــ"

پھر وہ دُور بھٹک رہی تھی ـــــ رمیش اس کو گھر میں چھوڑ کر چلا گیا تھا ـــــ وہ اکیلے گھر میں خوف زدہ سی چپ چاپ پڑ گئی تھی ـــــ دُوسری صبح کے انتظار میں جب وہ رمیش کی دھرم پتنی بن جائے گی ـــــ وہ رات بڑی بھیانک تھی ـــــ اسے راجو بہت یاد آیا تھا ـــــ ماں کی آوازیں بار بار کانوں سے ٹکرائی تھیں ـــــ اس نے باپو کو بھی یاد کیا تھا ـــــ جو اپنی بار دکی دھوم دھام سے شادی کرنے والا تھا ـــــ اور آج وہ کیسے چھپتی چھپاتی اپنے نئے گھر میں چپکے سے آگئی تھی ـــــ اس نے اکیلے پن کے جنگل کو پار کر لیا تھا۔

دُوسری صبح رمیش نے گلابی ساری کے بنڈل کو اس کے ہاتھوں میں تھما کر جلدی سے تیار ہونے کو کہا ـــــ اور پھر دونوں مندر میں جا کر ایک دُوسرے کے جیون ساتھی بن گئے تھے ـــــ اس کی مانگ سیندور کی لالی سے چمک اٹھی تھی ـــــ وہ بے حد خوش تھی ـــــ رمیش اس سے بہت پیار کرتا تھا ـــــ اس نے کئی بار سوچا۔ ماں سے مل آئے ـــــ راجو کو بلوا لے ـــــ پر رمیش چاچا کی بات کرتا ـــــ تو وہ خوف زدہ ہو جاتی ـــــ اس نے خود بھی جب جب ماں کو یاد کیا ـــــ اس کی بندیا میں جڑا ہوا اُس کا چاچا پہلے دکھائی دیا ـــــ

رمیش کہیں نوکر تھا ـــــ بس اسے اتنا معلوم تھا ـــــ اور اس سے زیادہ وہ کچھ اور معلوم بھی نہیں کرنا چاہتی تھی ـــــ وہ ایسے نرک سے نکل کر آئی تھی جہاں رات دن تنہائیوں کے سانپ اسے ڈستے تھے اور بے یقینی کی آگ اسے جھلسا رہی تھی ـــــ

وہ خوش تھی ـــــ بہت خوش ـــــ رمیش اس کو اتنا چاہتا ہے کبھی کبھی اس کو یقین نہ آتا ـــــ تب رمیش اپنے پیار سے اُسے شرابور کر دیتا ـــــ اور اس کا دل ناچ اٹھتا ـــــ اور جب رمیش نے کلکتہ چھوڑنے کی بات کی تو پہلے تو وہ ڈر گئی ـــــ ماں اور راجو سے وہ اتنی دُور چلی جائیگی۔

دہلی ــــ لیکن رمیش کی نوکری کا معاملہ تھا ــــ اور وہ ــــ مجبوراً دہلی آ گئی تھی ــــ

دہلی آتے ہی اسے پتہ چل گیا تھا ــــ وہ ماں بننے والی ہے ــــ اسے لگا اس کی زندگی مکمّل ہو گئی ہے ــــ اس کے ذہن میں گھنگھرو بج اٹھے تھے ــــ کئی دن کی کوشش کے بعد وہ اپنی بے انتہا خوشی کی وجہ رمیش کو بتا سکی تھی ــــ لیکن اسے بہت عجیب سا لگا ــــ اس نے سوچا تھا ــــ رمیش سنتے ہی اچھل پڑے گا ــــ خوشی سے وہ بھی دیوانہ ہو جائے گا ــــ اور پھر آنے والے مہمان کے بارے میں خوب باتیں کرے گا ــــ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ــــ رمیش کچھ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا ــــ جیسے کہیں بھٹک رہا ہو،

"ارے ــــ اتنی جلدی ــــ" اس کے منہ سے اچانک نکلا ــــ اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی ــــ لیکن رمیش کی خاموشی سے وہ گھبرا گئی ــــ وہ کئی روز سے محسوس کر رہی تھی کہ رمیش کچھ سوچتا رہتا ہے ــــ خاموش سا ــــ لیکن وہ اتنی روشن جھلملاتی دُنیا میں جھول رہی تھی کہ اسے خیال بھی نہیں آیا کہ روشنیوں کے پرے اندھیرے بھی ہوتے ہیں ــــ اچانک اسے خیال آیا کہ شاید نوکری کا کچھ گڑبڑ ہے ــــ اس نے بڑی خوش دلی سے کہا ــــ

"رمیش ــــ تم پریشان نہ ہو ــــ کچھ نوکری ووکری کا گڑبڑ ہے تو بھی چلے گا ــــ کچھ دن بھر کا ہمارے پاس ہے ــــ نوکری کوئی بھی کر لو ــــ چاہے کم ہی پیسے ملیں ــــ میری پرواہ مت کرنا ــــ تم جتنا لاؤ گے اسی میں گزارہ کر لوں گی ــــ میری سب سے بڑی دولت تو تمہارا پیار ہے ــــ تم دیدی سے کیوں نہیں ملتے ــــ" کلکتہ میں کئی بار ذکر آ چکا تھا ــــ وہ دہلی میں رہتی ہیں، اور بڑی امیر ہیں ــــ

رمیش جیسے چونک گیا ــــ "اوں ــــ ہوں ــــ میں ملا تھا ــــ وہ آنے والی ہیں ــــ دو ایک دن میں تم کو لے جانے کو کہہ رہی تھیں" وہ ہنسنے لگی ــــ

"اچھا ــــ اس کا غم ہے ــــ ارے ایک دو دن وہاں بھی رہ لیں گے

اِدھر تم نوکری بھی ڈھونڈ لینا ــــ"

پھر دیدی آگئی تھی ـــــ اچانک ہی ـــــ اور رمیش خاموش سا ـــــ سفید سفید اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا ـــــ دیدی نے بڑے پیار سے اسے گلے لگایا ـــــ "یہ تو بڑی پیاری سلونی سانولی سی ہے ــ" وہ رمیش سے تعریف کر رہی تھی ـــــ چائے پی گئی ـــــ دیدی کے ساتھ کی آئی ہوئی مٹھائی کھائی گئی ـــ اور پھر دیدی نے رمیش سے کہا۔

"آج ہی لئے جاتی ہوں!" اور رمیش نے صرف گردن ہلا دی تھی۔ وہ دیدی کے ساتھ جانے کو تیار ہوئی ـــــ رمیش نے بعد میں آنے کو کہا۔ اور وہ وہاں سے چلی آئی۔

دیدی کے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے انجانے خوف نے جیسے جکڑ لیا ـــ اس کے جسم میں ایک جھرجھری آئی ـــــ اور اس نے اپنے کو سنبھال لیا ـــ "کوئی بات نہیں ـــــ دو چار دن ہی تو رہنا ہے ـــــ" یہاں اسکی ہم عمر اور بھی کئی لڑکیاں تھیں جو اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں ـــــ اسے محسوس ہوا یہ لڑکیاں، نہیں ـــــ گڑیا ہیں ـــــ یا پھر تصویریں ـــــ جو فریم میں جڑی ہوں ـــــ بے جان سی ـــــ

اس نے سب کو نمستے کیا ـــــ

"یہ سب تمہاری بہنیں ہیں ـــــ!" دیدی نے تعارف کرایا ـــــ پھر وہ اسے ساتھ لئے آگے بڑھیں ـــــ اور ایک کمرے میں پہنچا دیا۔

"یہ تمھارا کمرہ ہے!"

کمرہ سجا ہوا تھا ـــــ وہ ڈر سی گئی ـــــ

"میرا کمرہ ــ؟"

"ہاں ـــ تمھارا کمرہ ہے ـــــ آرام سے رہو ـــــ کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے ـــ یہاں جس چیز کی ضرورت ہو آیا سے کہہ دینا۔" اور اسے لگا دہلی میں امیر لوگ ایسے ہی رہتے ہیں ـــــ اس نے تو یہ سب کبھی سوچا بھی نہیں تھا ـــــ شاید یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر ہی وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس نے

اپنے کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیدی سے کہا۔ "ٹھیک ہے دیدی ۔۔۔ یہ کب آئیں گے؟" ۔۔۔ اور انھوں نے لاپروائی سے جواب دیا ۔۔۔ "آجائیں گے!"

کئی روز گزر گئے ۔۔۔ اس نے کئی بار دیدی سے بات کرنا چاہی لیکن دیدی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال گئیں ۔۔۔ وہ ایک ایک لمحہ کوفت میں گزار رہی تھی ۔۔۔ اسے ہر لمحہ رمیش کا انتظار تھا ۔۔۔ یہاں کا آرام ۔۔۔ یہاں کے اچھے اچھے کھانے ۔۔۔ بار بار آوازیں ۔۔۔ دیدی کی دی ہوئی ریشمی ساریاں ۔۔۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا ۔۔۔ بار بار دیدی سے رمیش کے بارے میں پوچھتی تو انھیں بہت ہی ناگوار گزرتا اور وہ خاموشی سے اُٹھ جاتیں ۔۔۔

ریتا جو اس کے برابر والے کمرے میں رہتی تھی۔ بار بار اس سے بات کرنا چاہتی تھی ۔۔۔ لیکن اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا ۔۔۔ انجانا سا خوف اسے ڈسے لیتا تھا ۔۔۔ پھر دیدی نے اسے بتا دیا ۔۔۔ "اَب رمیش کبھی نہیں آئے گا ۔۔۔ اب تم میری ہو ۔۔۔ رمیش دام لے کر کلکتہ جا چکا ہے ۔۔۔"

"دیدی ۔۔۔" وہ چیخ پڑی ۔۔۔ جھوٹ بالکل جھوٹ ۔۔۔ میں اُسکی پتنی ہُوں ۔۔۔ اس کے بچّے کی ماں ۔۔۔ وہ کہیں نہیں جائے گا ۔۔۔"

"بچّہ ۔۔۔؟" دیدی نے دہرایا ۔۔۔ "نہیں ۔۔۔ بچّہ وچّہ کچھ نہیں۔ اس کا علاج ہو جائے گا ۔۔۔!" پھر اسے زبردستی دوا پلائی گئی ۔۔۔ اور وہ کئی روز بستر پر پڑی رہی ۔۔۔ دیدی کی نظر میں اب وہ ٹھیک ہو چکی تھی ۔۔۔

ایک رات ۔۔۔ اس کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کسی نے کھولا ۔۔۔ اس نے دیکھا دروازے کے بیچوں بیچ ایک اژدہا منھ پھاڑے کھڑا ہے ۔۔۔ پیچھے سے دیدی کی آواز آئی ۔۔۔

"بارو ۔۔۔ بیٹا یہ میرے مہمان ہیں ۔۔۔ کوئی شکایت نہ ہو ۔۔۔"

اس نے بڑی بے بسی سے دَرواز ے کی طرف دیکھا لیکن وہ بند ہو چکا تھا ــــــــ اس نے بہت ہاتھ جوڑے ــــــ پیر پکڑے ــــــ لیکن ــــــ لیکن اژدہے نے اسے نگل لیا ــــــ پھر ــــــ اسے بار بار اژدہے نگلتے رہے ــــــ اور اس نے اپنے وجود کو سمیٹ کر اپنے جسم کے اندر بند کر لیا ــــــ اور ــــــ اور ــــــ اس صبح اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی تھی ــــــ

اس نے آنکھیں کھولدیں ــــــ "سسٹر ــــــ میں کہاں جاتی ــــــ کیسے بھاگتی ــــــ مجھے لگا، ہر دَرواز ے پر منھ پھاڑے اژدہے میرا انتظار کر رہے ہیں ــــــ ہاں سسٹر! میں نے اپنے کو بچایا تھا ــــــ اپنے کو موت کے گلے لگا کر ــــــ پَر ــــــ میں بچ نہ سکی ــــــ!

فروری ۱۹۸۷ء

ثروت آپا

مئی کی جلتی ہُوئی دوپہر میں جب ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ ثروت آپا آئی ہیں تو سب کو بے حد تعجب ہوا۔ بند کمرے سے ہم لوگ تاش کے پتّے ہاتھوں میں چھپائے ہوئے ویسے ہی باہر بھاگے ــــ دھوپ کی تیزی میں سب کی آنکھیں چوندھیا سی گئی تھیں ــــ میں نے دیکھا ــــ اُجڑی اُجڑی، نحیف ولاغر، ثروت آپا آہستہ آہستہ امّی کی طرف بڑھیں اور گلے سے لپٹ کر رونے لگیں اور جب انھیں امّی نے کندھے سے الگ کیا تو وہ بے ہوش ہو چکی تھیں ــــ راہول اور صوفی خاموش کھڑے تھے اور منّی بوا کی گود میں ہمک رہی تھی۔

یہی ثروت آپا آٹھ دس سال قبل کتنی خوش مزاج اور کتنی تندرست تھیں۔ سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی مگر زندگی سے بھرپور چمکتی ہوئی آنکھیں، گھونگھر والے خوب صورت لمبے لمبے بال، اور گدرایا ہوا دراز قد۔ ہمیشہ سفید کپڑوں میں لپٹا ہوا ثروت آپا کا دل کش سراپا، کیلاش پربت کی گپھاؤں میں چھپی ہوئی کسی دیوی کا سایہ معلوم ہوتا تھا ــــ رحم وکرم کی یہ دیوی سارے خاندان کے لئے عصائے پیری کا کام کرتی! کسی کے کپڑے سینا ہیں۔ کسی کے سوئیٹر بننا ہیں۔ کسی کا بچہ بیمار ہے تو رات بھر جاگنا ہے اور شادی بیاہ کے موقع پر ثروت آپا کے لئے رات اور دن میں کوئی امتیاز ہی نہ رہتا تھا ــــ سب ہی کاموں میں مشاق تھیں ــــ بس اسکول کی پڑھی ہی تو نہیں تھیں۔ اور اس میں ان بیچاری کی کیا غلطی تھی۔ خالہ کے انتقال کے بعد خالو جان

نے انھیں اتنے ناز اور لاڈ سے پالا کہ دسویں کے آگے گیارھواں پارہ مولوی صاحب نہ پڑھا سکے اور چوتھی سے آگے پانچویں کلاس اسکول میں نہ پڑھ سکیں۔ پڑ پتہ نہیں کیسے انھیں اتنے بہت سارے کام آ گئے تھے۔

میں عمر میں ان سے کافی چھوٹی تھی، مگر پھر بھی ہر دم ثروت آپا کی برابری کا چکّر میرے دماغ میں گھسا رہتا۔ خالہ کے انتقال کے بعد وہ زیادہ تر میرے ہی گھر میں رہتی تھیں اور میں انھیں اپنی ہم عمر دوست سمجھتی تھی۔ تُم کے علاوہ کبھی جو آپ سے خطاب کیا ہو۔

"اے ثروت آپا! ذرا یہاں آؤ۔" اور میرے اس تخاطب پر امّی مُجھ سے بے حد ناراض ہو جاتیں۔ حالاں کہ یہ بدتمیزی میں صرف ثروت آپا ہی سے کرتی تھی۔ ثروت آپا کی عمر کی دوسری بہنوں کو میں ہمیشہ آپا اور باجی کے ساتھ ساتھ آپ جناب ہی سے نوازتی، لیکن ثروت آپا تو میری دوست تھیں۔ کبھی کبھی رات کو مُجھ سے نہ معلوم کتنی دیر تک باتیں کرتی رہتیں ـــــ میرے اسکول کی باتیں ـــــ سنیما کی باتیں ـــــ افسانوں کی باتیں ـــــ اور پھر، کل کہاں کہاں جانا ہے۔ کیا کیا شاپنگ کرنا ہے ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ اور میں خوش ہو جاتی کہ سچ مچ ثروت آپا بھی مجھے اپنی دوست سمجھتی ہیں۔ تب ہی تو ہم لوگ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں ـــــ مگر یہ زاہدہ آپا سے نہ جانے چپکے چپکے کون سی باتیں کرتی ہیں کہ میرے آتے ہی ان کی محفل میں خاموشی چھا جاتی ـــــ اور بس فوراً منھ بناتے ہوئے واپس ہونے لگتی۔

"اچھا کئے جاؤ چپکے چپکے باتیں ـــــ میں نے سب سُن لیا ہے ـــــ ابھی امّی سے کہتی ہوں دیکھنا......" اور پھر واقعی ثروت آپا نہ جانے کیوں ڈر جاتیں اور میری خوشامد کرنے لگتیں۔

"سنو تو ـــــ وہ ـــــ وہ اس لئے چپکے چپکے باتیں کر رہی تھی کہ زاہدہ نہ سُن لے ـــــ بھلا تم سے چھپا کر کیا بات کروں گی۔" یہ خوشامد کارگر ہو جاتی اور پھر میں بھی انکی محفل میں شریک ہو کر ریڈیو اور سنیما کی باتیں کرنے لگتی۔

دن گزرتے رہے ـــــ اور پھر ثروت آپا کی شادی کی باتیں بھی شروع ہو گئیں

امّی اور خالو جان جانے چپکے چپکے کون سے مشورے کرتے رہتے، نہ جانے کیسی خفیہ باتیں ہوتیں اور پھر میں نے ایک دن سُنا خالو جان، امّی سے کہہ رہے تھے "لڑکا بہت خوب صُورت ہے اور ثروت تو......" اور میں یہ سُنتے ہی بھاگی ـــ ثروت آپا کو خوش خبری دینے۔

"سُنا ـــ سُنا تم نے ـــ جناب کا دولھا بڑا خوب صُورت ہے۔" اور یہ سُنتے ہی ان کی چمکتی ہوئی ننھی ننھی آنکھیں شرم سے بند ہو گئیں ـــ کئی دن بعد اچانک گھر میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ اور میں نے معلوم کر لیا کہ وہ لوگ شادی نہیں کریں گے ـــ ثروت آپا بدصُورت ہیں ـــ میرا دل دھڑکنے لگا۔ بھلا اس بات کی خبر میں کیسے دوڑ کر ثروت آپا تک پہنچاتی ـــ میں نے پہلی مرتبہ غور کیا، ثروت آپا کیسے بدصُورت ہو سکتی ہیں ـــ اتنی تو پیاری ہیں۔ سب ہی سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ ہر ایک کا کام اپنے سر لے لیتی ہیں۔ سارے نوکروں اور ان کے بچّوں تک کے کپڑے وہ خود سے مانگ مانگ کر سیتی ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہر طرف ثروت آپا کی تعریف ہی، سُننے میں آتی تھی۔ میں ان کی بدصُورتی کے بارے میں سوچ رہی تھی پھر میں نے بھی محسوس کیا۔ ان کا رنگ تو واقعی کالا ہے۔ آنکھیں بھی چھوٹی چھوٹی ہیں ـــ مگر لاکھ کوشش کے باوجود وہ مجھے بدصُورت نہ معلوم ہُوئیں ـــ شاید میری محبّت کی چمکتی ہوئی کرنوں نے ان کی بدصُورتی کو دھندلا کر دیا تھا۔

ایک بار پھر سرگوشیاں ہوئیں اور معلوم ہوا کہ ثروت آپا کی شادی ہو رہی ہے، مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کیوں کہ ایسی بہت سی خبریں کئی بار گھر میں گرم ہو کر ٹھنڈی پڑ چکی تھیں ـــ لیکن جب ثروت آپا پیلے کپڑے پہن کر مانجھے بیٹھ گئیں تو میں بھی خوش ہو کر ابٹن کی ہولی میں شریک ہو گئی۔ راشد بھائی دولھا بن کر آئے اور ثروت آپا پھولوں کی شہزادی بن کر چلی گئیں۔

دو ہی سال کے اندر نہ جانے کیا ہُوا کہ مع ایک عدد لڑکے راحول کے گھر آ گئیں ـــ اور پھر میں نے دیکھا ان کے مسکراتے ہُوئے ہونٹ کچھ بھنچے بھنچے رہنے لگے، اب میں بھی انھیں اپنے سے کچھ بڑا سمجھنے لگی تھی۔ لیکن پھر بھی دبی زبان میں، میں نے

کئی بار پوچھنے کی کوشش کی۔

"کیا راشد بھائی سے لڑائی ہو گئی ___ ؟ یا اور کچھ ہوا ؟ بتاؤ نا" اور کچھ بتانے کے بجائے ان کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ نکلتے ___ میں گھبرا جاتی، اور جلدی سے دوسری باتیں کرنے لگتی ___ مجھے رونے سے نفرت تھی ___ میں رونے والوں کو نہ جانے کیوں ہمیشہ سے بزدل سمجھتی رہی ہوں ___ میں کوشش کرتی۔ ثروت آپا بھی رونے والوں کی لائن میں نہ رہیں ___ باتوں کا رُخ پلٹ جاتا اور تھوڑی ہی دیر میں ان کی سہمی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر میں کچھ مطمئن ہو جاتی مگر ذہنی خلش مجھے بے چین رکھتی۔ تفصیل کیسے معلوم کروں کہ کیا ہوا جو ثروت آپا یوں آ گئیں اور اب کیا ہو گا ___ مگر امّی کا ڈر اس معاملے میں بولنے ہی نہ دیتا۔ کیوں کہ ان کے خیال میں کنواری لڑکیاں کسی بھی شادی بیاہ کے معاملے میں بول کر سب سے پہلے اپنے چہرے کا نور کھو دیتی ہیں ___ اب میرے چہرے کا نور کھوتا یا باقی رہتا مگر میں اس بارے میں جاننے کے لئے سخت بے چین تھی ___ دن، راتوں کی سیاہی میں چھپتے گئے اور میں نے جان لیا کہ اب ثروت آپا ہمیشہ کے لئے چلی آئی ہیں۔

مگر تقریباً چار سال بعد اچانک نہ جانے کیا طے ہو گیا کہ ثروت آپا پھر مع بڑے بڑے بکسوں کے راشد بھائی کے یہاں چلی گئیں، اور جب ایک ماہ بعد واپس آئیں تو اُن کے چہرے پر مسکراہٹ کی قوسِ قزح پھوٹی پڑتی تھی ___ وہ سارے گھر میں چہکتی پھر رہی تھیں ___ آتے ہی انھوں نے گھر کے سارے کاموں کی ذمہ داری لے لی اور پھر ہر کمرے میں ان کی گنگناہٹ گونج اٹھی۔ ثروت آپا صرف چند روز کے لئے آئی تھیں۔ مگر میں انکی تبدیلی دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اس وقت تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب انھوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ راشد بھائی کے بارے میں کچھ باتیں کیں۔

"بھئی رفو ..... اس بار تو راشد بالکل ہی بدلے نظر آئے ہیں۔ جانتی ہو چلتے وقت کتنے بور تھے۔ بس منھ بنائے کھڑے رہے۔ کہہ رہے تھے۔ 'ثروت! تمھارے اور راہول کے بنا میں اس گھر میں کیسے رہ سکوں گا ___' میں نے بھی تو اس بار وہ خدمت کی ہے کہ قدم قدم پر سارے گھر کو یاد آؤں گی ___ پورے گھر کا کھانا میں پکاتی ہوں، سب کے کپڑے سینا، دھونا، استری کرنا میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے ___ گھر کے

اور دوسرے کام بھی بغیر میرے نامکمل ہی رہتے ہیں ـــــ امی کے سر میں تیل دابنا ـــــ زاہدہ کی چوٹی باندھنا ـــــ بس یہ سمجھو کہ رات کے گیارہ بجے میں آخری ڈیوٹی یعنی امی کے پیر دبا کر اٹھتی ہوں۔"

اور مجھے لگا میرا دماغ جھنا گیا۔ "واہ ری ثروت آپا ـــــ اتنے کام کے بعد بھی اگر راشد بھائی محبت کے دو چار الفاظ کہہ کر تم کو بے وقوف نہ بنائیں تو ان سے بڑھ کر کوئی بے وقوف نہیں۔"

"بے وقوف ـــــ؟" وہ مسکرا اٹھیں ـــــ "اگر میری جان بھی لے کر وہ خوش رہیں تو جانتی ہو مجھے کتنی مسرت ہوگی۔"

"خاک ـــــ!" کہتی ہوئی میں وہاں سے اُٹھ آئی ـــــ یہ باتیں میری سمجھ سے بالکل باہر تھیں ـــــ کیوں کہ میرے خیال میں شوہر دیوتا نہ ہو کر صرف جیون ساتھی تھا۔ اور میں آنکھ بند کر کے شوہر کو سجدہ کرنے والی جنتی عورت کو فرشتہ تو جان سکتی تھی مگر عورت ہرگز نہیں ـــــ محبت ہو یا خدمت، کوئی بھی چیز ہیں مسلسل یکطرفہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

ثروت آپا کی صحت اب اس قابل نہیں تھی کہ دن بھر کولھو کے بیل کی طرح آنکھیں بند کئے اپنے محور پر گھومتی رہیں ـــــ میں سوچنے لگی اتنی بھاری گاڑی کا بار وہ کب تک اپنے کاندھوں پر اٹھا سکیں گی۔ شوہر اور ساس کو خوش کرنے کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے بعد شاید جلد ہی ان کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا، کیوں کہ مسرت کی سُرخی میں سے جھلکتی ہُوئی تھکاوٹ ان کی کمزور صحت کی نشان دہی کر رہی تھی۔

کچھ دن ٹھہر کر وہ سسرال چلی گئیں۔ چلتے وقت انھوں نے مجھے گھسیٹ کر گلے سے لگا لیا اور بھیگی ہُوئی آنکھوں کے ساتھ جب وہ مجھ سے الگ ہُوئیں تو میں نے ان سے کہہ ہی دیا۔

"ثروت آپا! خدا کے لئے اپنی صحت کا خیال رکھنا ـــــ" پھر میرا دل بھر آیا۔ نہ جانے کیوں ـــــ

چند ہی ماہ بعد خبر آئی ـــــ ثروت آپا بیمار ہیں ـــــ مجھے ان کے بڑھاپے سے یہی خطرہ تھا ـــــ دُوسرے ہی دن ہم لوگ اُنھیں دیکھنے گئے ـــــ

ان کی حالت اچھی نہیں تھی ـــــ ایک بند گندے کمرے میں ایک چارپائی پر وہ پڑی کراہ رہی تھیں، اور راہول کیچڑ میں لت پت گلی میں کھیل رہا تھا ـــــ ثروت آپا کے کپڑے بے حد گندے تھے، اور ان میں سے بدبو آرہی تھی ـــــ جب امّی نے ان کی حالت کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے مُسکراتے ہُوئے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ وہ تو بس آج ہی اس کمرے میں آگئی تھیں، ورنہ وہ انکا کمرہ نہیں ہے ـــــ لیکن ان کے مسکراتے ہُوئے ہونٹوں کے پیچھے دبی ہوئی اذیت ناک تلخی مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔ میں نے ثروت آپا سے کئی بار گھر چلنے کی ضد کی، مگر وہ ٹال گئیں۔ کوئی جواب ہی نہ دیا ـــــ خالہ جان کے انتقال کے بعد سے امّی نے اپنی مرحومہ بہن کی نشانی کو اپنے سے الگ نہ کیا تھا، اور ثروت آپا کی تنہائی کے خیال سے خالو جان بھی کبھی کچھ نہ بولے ـــــ ثروت آپا کی یہ حالت دیکھ کر امّی کے آنسو نکل آئے اور وہ انھیں ثروت آپا سے چھپاتی ہُوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ باہر وہ راشد بھائی کی امّی سے باتیں کرتی رہیں۔ میں نے پھر ثروت آپا سے ضد کی ـــــ مگر وہ ایکبارہ بھی گھر چلنے پر راضی نہ ہوئیں، اور جب میں نے بہت قسمیں رکھائیں تو انھوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اگر میں چلی گئی تو جانتی ہو رفو ..... یہاں دوسری ثروت آپا آجائے گی!"

"کیوں ـــــ ؟"

"بس ایسے ہی ـــــ !"

"لیکن ..... تم ..... تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ راشد بھائی اب تمھارا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"ہاں رفو ـــــ لیکن ..... اب ....." اور پھر وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رو پڑیں۔

مجھے غصّہ آگیا۔

"یہ تم روتی کیوں ہو ـــــ جانتی ہو رونے والوں کو لوگ اور رُلاتے ہیں۔ جب دریا بہتا ہے تو لوگ اس کی رفتار میں تیزی پیدا کرنے کے لئے بڑے بڑے باندھ بنا لیتے ہیں اور اس سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ لُطف اندوز ہوتے ہیں۔"

میں جھنجھلا رہی تھی کہ امّی کمرے میں داخل ہُوئیں اور ثروت آپا نے جلدی سے دوسری طرف منھ پھیر لیا، اور جب ان کا چہرہ دوبارہ سامنے آیا تو آنسو ان کی آنکھوں میں جذب ہو چکے تھے۔ امّی نے بھی ان سے گھر چلنے کے لئے اصرار کیا مگر ثروت آپا کسی طرح راضی نہ ہوئیں ـــــ ان کی ساس نے بھی کئی ٹہوکے لگائے۔

"چلی جاؤ نا ـــــ دل ہی بہل جائے گا ـــــ یہاں پڑی پڑی کیا بنا لوگی"

اور مجھے یاد آیا میں جب ثروت آپا کو اس سے قبل چند روز کے لئے روکنا چاہتی تھی تو انھوں نے یہ کہہ کر چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ "اپنا گھر بار دیکھیں ـــــ کون کرنے دھرنے والا ہے وہاں دوسرا۔"

اور آج وہ اس بار کو گھر سے دھکیلنے پر پوری طرح آمادہ تھیں ـــــ ثروت آپا نے پھر آنے کا وعدہ کر لیا اور ہم لوگ واپس چلے آئے۔ اتنی جلدی ثروت آپا یوں گھل گئی تھیں۔ ان کے گدرائے ہُوئے بدن پر ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ چکتے ہُوئے سانولے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی ـــــ اور ہاتھ ـــــ ہاتھ تو اتنے سُوکھے ہوئے دکھائی دیئے کہ جن کا تصوّر بھی مَیں نہیں کر سکتی تھی ـــــ ہمیشہ سسرال میں دَب کر رہنے کا سبق دینے والی امّی بھی آج خاموش تھیں۔ کئی بار ان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ انھیں خشک کر لیا۔

کئی دن بعد اطلاع ملی کہ ثروت آپا کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے ـــــ امّی گئیں ـــــ مگر واپسی پر بہت دل شکستہ تھیں ـــــ خالو جان کے بھیجے ہُوئے روپے راشد بھائی کی جیب میں چلے جاتے اور ثروت آپا بیچاری دن رات کام کی چکّی میں پستے پستے بس ایک نشان سی باقی رہ گئی تھیں، جسے راشد بھائی اور ان کے گھر والے جلد ہی مٹا دینا چاہتے تھے ـــــ چار پانچ روز بعد امّی ثروت آپا کو زبردستی لے آئیں آتے وقت ثروت آپا کی بے نور آنکھیں آنسوؤں کی پتلی پتلی دھاریں بہاتی رہیں۔ برآمدے میں ہی میں ان کا انتظار کرتی رہی۔ مجھے دیکھتے ہی ان دھاروں میں کچھ تیزی آ گئی ـــــ میں نے انھیں سہارا دے کر اندر پہنچا دیا، اور وہ پلنگ پر بے جان سی ہو کر لیٹ گئیں۔

میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "اچھا کیا تم چلی آئیں ـــــ

وہ لوگ تو جان ہی لے لیتے ـــــ جب تک کام کرتی رہیں۔ پیٹ کی روٹی دیتے رہے اور جب .....''

''نہیں رفو...... میں خود ہی نہیں آنا چاہتی تھی ـــــ سوچا تھا اُس گھر سے لاش ہی نکلے گی۔ کتنی خوش قسمت ہوتی ہیں ـــــ مگر خالہ جان.......'' اور پھر وہ ہچکیاں لینے لگیں ـــــ اور میں سوچنے لگی انھیں کس طرح یقین دلاؤں کہ واقعی اس گھر سے ان کی لاش ہی آئی ہے۔ آنسو بہاتی ہوئی، سسکتی ہوئی لاش۔

خالو جان، ثروت آپا کی وجہ سے بہت پریشان تھے، شہر کا کوئی ڈاکٹر نہ بچا جس نے ثروت آپا کی لاش میں زندگی پیدا کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ لیکن میں ثروت آپا کے چہرے پر صرف اس وقت زندگی کے آثار پاتی جب وہ ننھی صوفی کو کلیجے سے لگائے راہول کے سر پر ہاتھ پھیرتیں ـــــ مگر بچے ان سے الگ کر دیئے گئے تھے کیوں کہ ثروت آپا بہت کمزور تھیں اور بیماری بھی سخت تھی ـــــ جب وہ صوفی کو مانگتیں سب کی ناک بھنویں سکڑ جاتیں اور کوئی نہ کوئی بول ہی پڑتا ـــــ ''جان دے دو ان سانپ کی اولادوں کے لئے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ لوگ یہ بھول جاتے کہ یہ سانپ کی اولادیں ہی ثروت آپا کی بھی اولادیں ہیں ـــــ اور جب کوئی راہول کو راشد بھائی کے گھر بھیج دینے کی بات کرتا تو ان کے چہرے سے رہے سہے زندگی کے چند نشان بھی مٹ جاتے۔ اور میں فوراً آڑے آتی۔

''نہیں ـــــ راہول نہیں جائے گا۔ وہ یہیں رہے گا۔'' پھر ثروت آپا کی تشکر آمیز نگاہیں میرے گرد گھومنے لگتیں ـــــ مجھے ثروت آپا سے شکایت ضرور تھی کہ وہ سسرال والوں کو خوش کرنے کی دھن میں اتنی اندھی کیوں بنی رہیں کہ خدا اور رسول کے فرمان میں شوہر پرستی کے علاوہ انھیں کچھ نظر ہی نہ آیا ـــــ مجھے اب معلوم ہوا تھا کہ راشد بھائی خود بھی ان سے بات نہیں کرتے۔ گھر کے اور دوسرے افراد بھی انھیں صرف کام کرنے کے لئے ہی چاہتے تھے ـــــ وقت پر چائے ـــــ وقت پر ناشتہ ـــــ کھانا ـــــ ہر کام کی ذمہ داری انھیں پر تھی اور یہی وجہ تھی کہ گھر کے اور افراد بھی ان کی موجودگی سے خوش تھے۔

ثروت آپا کے سارے اخراجات کے ذمہ دار خالو جان ہی تھے ـــــ

کپڑے، روپے اور دوسرے لوازمات سب ہی کچھ وہ بھیجتے۔ مگر ان کا بھیجا ہوا ایک بھی کپڑا ثروت آپا کے پاس نہ رہتا۔ کبھی کسی کو پسند آجاتا، کبھی کسی کو ___ اور ثروت آپا بیچاری پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹی اپنے فرائض کی ادائیگی میں مشغول رہتیں ___ کبھی کبھی راشد بھائی ان سے دو ایک ___ باتیں کر لیتے اور انھیں جینے کا سہارا مل جاتا۔

راشد بھائی کسی آفس میں کلرک تھے اور انھوں نے یہ شادی ہی غالباً اس خیال سے کی تھی کہ خالو جان کے اکلوتے داماد کی حیثیت سے وہ خالو جان کے ایک عدد پختہ مکان اور پورے مال و متاع کے واحد مالک بن جائیں گے ___ مگر جب ثروت آپا رخصت ہو کر گھر چلی گئیں تو ان بیچارے کا رخصت ہو کر خالو جان کے گھر آجانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا ___ اور اسی لئے وہ کچھ چڑھ سے گئے تھے۔

اکثر ثروت آپا کے خط آتے۔ مجھے اتنے روپیوں کی ضرورت ہے اور وہ روپے راشد بھائی کی جیب میں جوں کے توں چلے جاتے ___ اور اب تو راشد بھائی اور انکے گھر والوں نے یقین کر لیا تھا کہ خالو جان کی زندگی میں انھیں سسرال سے صرف بھیک مل سکتی ہے، پوری طرح قبضہ کبھی نہیں مل سکتا ___ ہاں ایک ملازمہ ضرور مل گئی تھی، بے دام کی ملازمہ اور جب اس کے چلتے ہوئے ہاتھ پیر تھمے تو اس کی زندہ لاش اپنے گھر سے دور کر کے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

ثروت آپا کی طبیعت کچھ دنوں بعد سنبھلنے لگی۔ اور میں، ان کی رگوں میں زندگی دوڑتے محسوس کر کے پھر خوش ہو گئی ___ یونیورسٹی سے واپسی پر میں فوراً ثروت آپا کے کمرے میں چلی جاتی اور پھر دوا وغیرہ کے بارے میں پوچھتے پوچھتے ان سے کبھی پوچھ لیتی ___ "راشد بھائی تو یاد نہیں آتے؟"

اور راشد بھائی کا نام سنتے ہی ثروت آپا کی چمکتی آنکھیں جیسے جھپک جاتیں ___ "یاد ......" کہتے ہوئے وہ کچھ بے چین سی ہو جاتیں اور میرا دل انکی یہ محبت دیکھ کر دکھ جاتا ___ کیسے ظالم ہیں راشد بھائی ___ ایسی مخلص، محبت کرنے والی بیوی جسے سوائے ان کی محبت کے چند الفاظ کے اور کچھ نہیں چاہیئے جو ان کی جھوٹی باتوں کو بھی سچ جان کر جینے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی ___ اس پر

بھی انھیں رحم نہ آیا۔

میں اکثر انھیں سمجھاتی ـــــ ثروت آپا! اب تم کبھی راشد بھائی سے بات مت کرنا ـــــ انھیں بھول جاؤ ہمیشہ کے لئے ـــــ اور......" میرے منھ سے کچھ نکلنے سے پہلے ہی وہ کراہ اٹھتیں۔

"رفو! ـــــ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ـــــ؟ میں انھیں بھلا دوں ـــــ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے ـــــ وہ ـــــ وہ میرے مجازی خدا ہیں ـــــ میرے بچّوں کے باپ ـــــ میں ان کے نام کے سہارے ہی جی لوں گی ـــــ رفو! مجھے دنیا میں خوشیاں نہیں چاہئیں ـــــ مجھے کسی کا پیار بھی نہیں چاہئیے ـــــ بس ـــــ بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ میرے ناخدا ہیں ـــــ وہ میرے شوہر ہیں ـــــ"

اور پھر مجھے اس اندھی شوہر پرستی پر بجائے غصّے کے ترس آجاتا ـــــ بیچاری ثروت آپا ـــــ

ثروت آپا دھیرے دھیرے صحتیاب ہوگئیں ـــــ انھوں نے اپنی تمام ڈیوٹیاں سنبھالنا شروع کر دیں ـــــ اور پھر آہستہ آہستہ ان کے چاروں طرف کام بکھر گئے ـــــ راہول اور صوفی دونوں گھر میں اُدھم مچاتے رہتے۔ ان کو خوش دیکھ کر ثروت آپا بھی مُسکرا دیتیں ـــــ

اکثر رات کو جب میں پڑھتی ہوتی تو وہ میرے کمرے میں آجاتیں ـــــ اور میں فوراً کتاب بند کر کے مُسکراتی ہُوئی ان کا خیر مقدم کرتی اور طرح طرح کی باتوں کے بعد جب وہ واپس جاتیں تو میرا بوجھل ذہن یہ محسوس کرتا کہ وہ راہول کے مُستقبل کے بارے میں کتنی فکر مند ہیں ـــــ

پھر ایک دن اچانک دوپہر میں ثروت آپا کی ساس آگئیں ـــــ خلاف امید انھوں نے ثروت آپا کو بڑے پیار سے گلے لگا لیا اور پھر شام تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں ـــــ امّی وغیرہ سب ہی ان لوگوں سے ناراض تھیں۔ مگر نہ جانے کس چالاکی سے انھوں نے باتیں کیں کہ شام تک امّی کی تیوریاں سیدھی ہو چکی تھیں ـــــ اور پھر چلنے سے کچھ دیر پہلے انھوں نے بتایا کہ راشد بھائی سخت بیمار ہیں ـــــ امّی تو سُنکر چپ سی ہو گئیں مگر ثروت آپا کی ننھی ننھی آنکھیں نجانے

کیوں پھیل گئیں اور انھوں نے خود ہی امّی سے کہہ سُنکر انھیں راضی کر لیا کہ ساس کو صاف جواب نہ دیں بلکہ انھیں اس بار اور بھیجدیا جائے ـــ ممکن ہے اب سے قسمت سنبھل جائے ـــ اور ان کے مجازی خدا ان پر نہیں تو ان کے بچّوں پر ہی رحم کرنے لگیں ـــ اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ سچ مچ ثروت آپا دوسرے دن چلی جائیں گی تو میں غصّہ سے کانپ گئی ـــ بغیر کچھ بولے میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی ـــ اور پھر میں نے دیکھا، ثروت آپا رات بھر بے چینی سے صحن میں ٹہلتی رہیں ـــ شاید اپنے سہاگ کی حفاظت کے لئے دعا کر رہی تھیں۔

دوسرے دن ثروت آپا آنسو بہاتی چلی گئیں ـــ اور میں خاموش دیکھتی رہی ـــ مجھے شک تھا کہ ثروت آپا کے مجازی خدا، اور ان کے گھر والے انسان نہیں ہیں ـــ بیچاری ثروت آپا اتنی معصوم اور نیک ہوتے ہوئے بھی، ان لوگوں کے دلوں کو جیت نہ سکیں تھیں۔

لوگ حسب معمول ان کے گھر پھر سے آنے جانے لگے۔ مگر میں ثروت آپا کے گھر نہیں گئی ـــ میں سوچتی ان لوگوں کو ایک لونڈی کی ضرورت تھی ـــ اور ثروت آپا پھر چلی گئیں ـــ میں ثروت آپا سے اس بات پر ناراض بھی تھی کہ انھوں نے خود ہی عورت کو ایک لونڈی کا درجہ دے رکھا تھا ـــ ان کے لئے عورت صرف ایثار و قربانی کے لئے ہی بنی تھی۔ اور اس کا بدل کبھی وہ نہیں چاہتی تھیں وہ تو سب کچھ دوسری دنیا میں مل ہی جائے گا ـــ ان کے اور میرے خیالات کا یہ تضاد ہم دونوں کو کچھ دُور کرتا گیا۔ مگر اس دوری میں بھی دلوں کی محبّت کم نہ ہو سکی ـــ میں ثروت آپا کو ہمیشہ قابلِ رحم ہستی سمجھتی رہی اور وہ مجھے بے وقوف، محبّت کرنے والی بہن سمجھتی رہیں۔

دن گزرتے رہے ـــ اور میں باہر چلی گئی ـــ ثروت آپا کے بُجھے بُجھے خطوط مجھے ملتے رہے ـــ میں بھی بس ان کو جواب ہی دے دیتی ورنہ ان کو کچھ لکھنا اندھے کے آگے رونا تھا۔

ایک دن زاہد بھائی کے خط سے معلوم ہوا کہ راشد بھائی نے دُوسری شادی کر لی ہے ـــ اور میرا دماغ جیسے گھوم گیا ـــ اُف ثروت آپا ـــ

ثروت آپا تو اب مرجائیں گی ___ میں نے امّی سے تفصیل پوچھی ___ اور امّی نے لکھا کہ یہ شادی ثروت آپا کی تحریری اجازت کے بعد ہوئی ہے اور دوسرے ہی دن مجھے ثروت آپا کا بھی خط ملا۔

"رفو ___! راشد چاہتے تھے کہ دوسری شادی کرلیں ___ میں نے اجازت دے دی ___ جب وہ مجھ سے خوشیاں نہیں حاصل کرسکتے، تو میں ان کی زندگی سے خوشیاں چھیننے کی کیسے حقدار ہوسکتی ہوں۔ اور پھر وہ تو مذہبًا دوسری شادی کرسکتے تھے ___ یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے اجازت مانگی۔ میں بھلا اجازت کیسے نہ دیتی ___ وہ تو میرے مجازی......" اور میں اس سے آگے خط نہ پڑھ سکی ___ میں نے خط کے پُرزے پرزے کرکے ہوا میں اُڑا دیئے میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں ___ آنسوؤں کے پردوں میں میں نے دیکھا ___ ثروت آپا۔ نئی نویلی دلھن کے کمرے میں چائے بھیج رہی تھیں اور ان کی سفید سفید بے جان آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

اس کے بعد میں نے ان کو کوئی خط نہیں لکھا ___ لکھتی بھی کیا ___ ہاں سُنا تھا کہ ان کے تیسرا بچّہ اور ہوا ہے ___ مئی میں جب گھر گھر آئی تو کئی بار خیال آیا کہ بہادر ثروت آپا کو حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے میں بھی دیکھوں ___ مگر امّی نے ان کے گھر جانے کی اجازت نہیں دی ___ ثروت آپا کی صرف خبریں آتی رہیں اور خیریت ملتی رہی۔

اور پھر ___ جب اس جلتی دوپہر میں کمرے کے اندر ہم لوگوں نے اچانک سُنا کہ ثروت آپا آئی ہیں ___ تو، تاش کے پتّے ہاتھوں میں دبائے ہوئے ہم لوگ باہر بھاگے ___ اور جب نحیف ولاغر ثروت آپا کو امّی نے اپنے کندھے سے الگ کیا تو وہ بے ہوش ہوچکی تھیں ___ زاہد بھائی نے سہارا دے کر انھیں پلنگ پر لٹا دیا ___ گھبراہٹ میں میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں ان کے سرہانے ہی بیٹھ گئی ___ سب لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے ___ اور جب ثروت آپا کی آنکھیں کھلیں تو ان کی اداس نظریں میری طرف اُٹھ گئیں ___ اور ___ نظریں ملتے ہی میں

بے اختیار رو پڑی ــــ اور جب آنسو تھمے تو میرے سوال کرنے سے پہلے ہی ان کی کمزور آواز فضا میں لہرائی۔

"ہاں رفو ــــ! وہ بُت ٹوٹ گیا ــــ!! ــــ اور ــــ اور ہمیشہ کے لئے ایک کہانی ختم ہو گئی ــــ" پھر ان کی آنکھیں پتّوں سے جھڑتے راہوں پر جم گئیں ــــ شاید دوسری کہانی کا آغاز تلاش کرنے کے لئے ــــ!

۱۹۵۹ء

وہ لمحہ

وہ آج سے زیادہ کبھی بزدل ___ کمزور ___ اور خوف زدہ نہیں ہُوئی تھی،
اس کے چاروں طرف چینخوں کے گھنے جنگل اُگ آئے تھے ___ بزدل ___ کائر
بزدلی کے اُونچے اُونیچے گھنے پیڑوں کے اندھیروں میں وہ بھٹک رہی تھی ___
اس کا ذہن پنجرے میں بند اس پنچھی کی طرح تڑپ رہا تھا جسے کسی شریر بچّے نے
چاروں طرف سے گھیر کر تیلیاں چبھونے کی ٹھان لی ہو ___ اور وہ تڑپ تڑپ کر
اپنی جان بچا رہا ہو ___ بس ___ ویسے ہی ___ بالکل ویسے ہی وہ بھی تڑپ رہی
تھی ___ وہ کہاں جائے ___ کیا کرے ___ اُف! ___ سزا ___ صرف
ایک بار کی سزا ___ وہ بھی موت جیسی آسان نہیں ___ عمر قید جیسی بھیانک
نہیں ___ بلکہ ___ اس سے بہت زیادہ سخت ___ وہ ___ کبھی
چینخوں سے دُور دودھیا چاندنی میں بھاگ جانا چاہتی تھی ___ یا پھر اُونچے
اُونچے گرم ریگستانی بالو کے ڈھیر میں منھ چھپا لینا چاہتی تھی ___ تاکہ
باہر کی جلن اس کے اندر کھولتے لاوے سے بڑھ جائے ___ یا پھر گہرے سمندروں
کی تہہ میں کھو جانا چاہتی تھی ___ لیکن گہرائیاں ٹیسوں سے بھری پڑی تھیں۔
کسی بھی گہرائی میں دُور دُور تک ٹھنڈک نہیں تھی ___ تیز دھار دار ___ نکیلی
برچھیاں اس کے ذہن میں لپک رہی تھیں ___

بزدل ___ کائر ___ چاروں طرف آوازوں نے شعلوں کا لباس

پہن لیا تھا ـــ اور وہ جل رہی تھی ـــ رتّی رتّی جلنا بھی کتنا اذیت ناک ہوتا ہے ـــ اس کی گردن ـــ اس کے کان اس کا سینہ ـــ بلکہ اس کا وجود سب کچھ پھُنکا جا رہا تھا ـــ

یا پھر ـــ وہ اپنے آپ کو سزا دے رہی تھی ـــ اس ایک لمحہ کی پاداش میں ـــ جسے اس نے کھو دیا تھا ـــ اور جسے وہ دوبارہ پکڑنا چاہتی تھی۔ اور جو بلوں اور ملبوں سے نکلی ہوئی چمکدار، خوب صورت ناگن کی طرح سڑاپ سے پھسل چکا تھا ـــ جس کے لپ لپ کرتے حسین رنگ اب اس کے انگ انگ پر رینگ رہے تھے ـــ اور رتّی رتّی ڈس رہے تھے ـــ

وہ کیسا انوکھا دن تھا ـــ کیسا نرالا ـــ بہت سے سنیچر آئے تھے ـــ اور آتے ہی تھے ـــ لیکن اس روز کے بعد سے جیسے سنیچر ٹھہر گیا ہو ـــ جیسے ہر دن اور ہر رات سنیچر ہی بن گیا ہو ـــ اور اس نے سارے دنوں کے نام نگل لئے ہوں ـــ سارے دن گڈمڈ ہو کر ایک دن بن گیا تھا ـــ اور اپنا بڑا سا کالا ڈنک پٹخ پٹخ کر اس کو یاد دلا رہا تھا ـــ کہ اب کوئی اور دن نہیں آئیگا ـــ صرف سنیچر ہی ہوگا ـــ کیوں کہ اس دن بھی سنیچر ہی تھا ـــ چھٹی سے پہلے کا دن ـــ ورنہ شاید کوئی اور دن بھی ہو سکتا تھا ـــ

وہ ہمیشہ بھاگ کر ہر چھٹی سے پہلے دن اپنے گھر چلی جاتی تھی ـــ اور چھٹی کا دن گزار کر پھر دہلی آجاتی ـــ پانچ گھنٹے کا یہ بس کا سفر وہ منٹوں میں طے کر لیتی ـــ اور ایک دن ہی سہی لیکن اسے لگتا کہ یہ ایک دن کا گھونٹ اسے پورے ہفتہ کی توانائی دیتا ہے ـــ

لیکن اب تو اُسے صرف ایک دن یاد تھا ـــ جس نے اس کے وجود کو گھیر رکھا تھا ـــ وہ ایک دن تھا ـــ محض ایک دن ـــ لیکن ـــ اب ہفتہ ـــ مہینے ـــ اور سال ـــ سب کچھ وہی دن بن چکا تھا ـــ اس کے علاوہ اسے اور کچھ یاد نہیں تھا ـــ

اونچے اونچے نرم گدوں والی بس میں وہ ہمیشہ دھنستے ہی کھو جاتی۔

اور بس ـــــ کالی لمبی سڑک کے آخری چھور کی تلاش میں آگے بھاگتی رہتی ـــــ لیکن اس نے بس کی اس تلاش میں کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا ـــــ وہ تو بس ایک جانی پہچانی جگہ بس رکتے ہی کھٹ سے اُتر جاتی تھی ـــــ اور پھر وہ لمحے ٹھٹھر گئے تھے ـــــ وہ اُتر نہیں سکی تھی ـــــ کنڈکٹر نے کچھ کہا بھی تھا ـــــ لیکن اس کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے ـــــ کھڑکیوں کے پٹ کھُل کھُل کر بند ہو رہے تھے ـــــ اس کے کانوں میں شائیں شائیں کی سیٹیاں گونج رہی تھیں ـــــ اور لمحہ ہنس رہا تھا ـــــ چیخ چیخ کر ہنس رہا تھا ـــــ وہ ہار رہی تھی، یا ہار چکی تھی ـــــ اسے نہیں معلوم تھا ـــــ لیکن کہیں جنگ ضرور ہوئی تھی۔ بھیانک جنگ ـــــ راکٹ اور بموں نے سب کچھ تہس نہس بھی کر دیا تھا ـــــ جہاں سنّاٹوں اور موت کا راج تھا ـــــ

وہ اس لمحہ کو پکڑنا چاہتی تھی ـــــ لیکن اس کے ہاتھ نہیں ہل سکے تھے ـــــ وہ چیخ کر پکارنا چاہتی تھی ـــــ لیکن زبان اُکٹ کر تالو سے چپک گئی تھی ـــــ اور بھورا بھورا ـــــ متوالا بادل کا ٹکڑا دُور ہوتا گیا ـــــ دُور ہوتا گیا۔ اور پھر ـــــ وقت کی دھند نے اس کے وجود کو لمحہ میں بدل دیا ـــــ جو، دن۔ مہینے ـــــ اور سال بن بن کر اسے ڈس رہا تھا ـــــ

وہ کھڑکی سے باہر کچھ خرید رہا تھا ـــــ نیچے جھکا ہوا ـــــ یا پھر ـــــ لٹکا ہوا ـــــ اور وہ برابر کی خالی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی ـــــ اس نے ناول خریدا تھا ـــــ اس کے ہاتھوں میں ایک فلمی رسالہ بھی تھا ـــــ اور پھر وہ ناول کھول کر اس میں کھو گیا تھا ـــــ

اس نے عجیب سا محسوس کیا ـــــ جیسے اس کے اندر گہرائیوں میں ایک اَن دیکھی ـــــ اَن سوچی چاہت کی لہر سرک کر کہیں گُم ہو گئی ہو ـــــ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا ـــــ اس کے وجود سے کوئی اس طرح بے خبر ہو۔ اور اتنے قریب ـــــ ہوا کے ایک جھونکے نے جانی پہچانی مہک سے اس کا رشتہ جوڑ دیا ـــــ اس نے پہلو بدلا ـــــ لیکن ناول پر جھکا چہرہ نہ ہلا ـــــ وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگی ـــــ وہ بڑبڑائی ـــــ بڑی گھٹن ہے ـــــ

ایک کھوئی ہوئی آواز بڑی دُور سے سُنائی دی ـــــ لیکن چہرہ اب بھی سامنے نہیں تھا ـــــ

"یہ میگزین ......" ـــــ "جی جی ہاں شوق سے ـــــ" اور پھر موسم اور میگزین سے آگے ایک اسٹاپ بھی آگیا ـــــ 'کیسا ہے یہ' ـــــ اس نے گھبرا کر ادھر دیکھا ـــــ اس کا سر پھر بھی جھکا ہُوا تھا ـــــ وہ دل ہی دل میں ہنس پڑی ـــــ "بدھو!" ـــــ پھر اس نے سوچا ـــــ اس کا من کبھی اتنا چنچل تو نہیں تھا ـــــ کہ ایرے غیرے کو بدھو کہہ دے ـــــ ہُنہ ـــــ وہ میگزین میں تصویریں دیکھنے لگی ـــــ لیکن اس کا من جیسے ڈول ڈول کر کسی بجلی کے پول سے ٹکرا رہا تھا ـــــ ہلکی سی سرسراہٹ یا شاید گدگدی ـــــ اسے اچھا لگ رہا تھا ـــــ کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا ـــــ

پھر بس سے باہر بڑی اُتھل پتھل ہوئی تھی ـــــ درخت ـــــ چہرے بیل گاڑیاں ـــــ سائیکل سوار ـــــ سب جلدی جلدی ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے ـــــ تارکول کی کالی، چوڑی سڑک دُور سے بھاگتی آرہی تھی ـــــ اور اس کے قدموں میں خوشی خوشی لوٹ کر غائب ہو رہی تھی ـــــ

اس نے کندھوں پر بڑی سی شال کو سنبھالا ـــــ اور آہستہ سے بولی ـــــ "مجھے بھی کتابوں کا بڑا شوق ہے ـــــ!" اور میگزین اس کی طرف بڑھا دیا ـــــ ہلکی سردی کے باوجود اس کے چہرے پر ننھے ننھے موتی اُبھر آئے ـــــ وہ اپنے کو پاربتی کے رُوپ میں محسوس کر رہی تھی۔ اور شیو جیسے اس کے سامنے تھا ـــــ وہی شیو جسے اَن جانے میں اس نے نہ جانے کتنی جے مالاؤں سے لاد دیا تھا ـــــ اسے کیا ہو گیا ـــــ اسے کچھ معلوم نہیں تھا ـــــ بس وہ انسان کے رُوپ میں شیو کو دیکھ کر جیسے بالکل پاربتی بن گئی تھی ـــــ کتنے اُونچے وچار تھے اس شیو کے ـــــ نہ صُورت دیکھنے کی کوشش ـــــ نہ جسم چھو جانے کی چاہت اور نہ بات کرنے کی جلدی ـــــ بلکہ عجیب سا گھبراپن ـــــ جو اس کی سوچوں سے بھی زیادہ تھا ـــــ شاید یہی سب اس کے اندر اُتھل پتھل مچا رہے تھے ـــــ

بہت دن پہلے اس نے ایلورا میں شیو کے بہت سے رُوپ دیکھے

تھے ــــ اور پاربتی بھی ــــ لیکن اس کے بعد وہ شیو کی چھبی اس کے اندر کہیں کھو گئی تھی ــــ اس نے بہت بار کاغذ پر اُتارنے کی کوشش کی لیکن کینوس پر صرف رنگ اُبھر آتے شیو نہیں ــــ اس کے رنگ ــــ اس کا برش سب ہار چکے تھے ــــ اور آج اس کے اندر کا شیو سامنے تھا ــــ تل تل وہی شیو ــــ اور پھر انجانے ہی میں وہ پاربتی بن گئی تھی ــــ

آوازوں کی ٹکراؤ بس کی گھر گھراہٹ میں دبی ہوئی تھی ــــ لیکن ــــ لیکن دونوں کچھ قریب آئے تھے ــــ الفاظ تو کم تھے ــــ لیکن گہرائی زیادہ تھی۔ پھر اس نے سوچا ــــ انھیں گھر چلنے کو کیوں نہ کہوں ــــ ممّی سے کہہ دوں گی ــــ لو ممّی ــــ روز روز پوچھتی تھیں ــــ تمھارا شیو کون ہوگا ــــ کہاں ہے ــــ خیالوں میں بھٹکتی رہتی ہے پگلی ــــ

"تو ــــ تو ممّی دیکھ لیا ــــ یہی ہے وہ شیو ــــ جس کا مجھے انتظار تھا ــــ لو ــــ لو ــــ اب تو خوش ہو ــــ بجوالو شہنائی ــــ اب میں منع نہیں کروں گی ــــ"

اس کے دچار کتنے بلند ہیں ــــ اور آواز کتنی گمبھیر ــــ کتنے کم وقت میں کتنے کم الفاظ بجے ــــ اور صدیوں لمبی داستانیں کہہ سُن لی گئیں ــــ وہ کتنا کم بولا تھا ــــ پکاسو اور حسین کا آرٹ ــــ لُمبا کی موت ــــ افغانستان کی جنگ ــــ اندرا گاندھی ــــ زولا۔ لارنس ــــ اور نہ جانے کتنے ٹاپک اُبھرے اور گزر گئے ــــ لیکن جب اس نے بتایا کہ گھر پر صرف اس کی ماں انتظار کرنے والی ہے ــــ تو ــــ تو ــــ اس ننھے سے جملے نے اس کا سارا خوف دھو دیا ــــ اس کی دنیا ہی بدل گئی ــــ اس کے چاروں طرف چھایا ہُوا خوف کا دھند لکا جیسے چھوٹ گیا ہو ــــ جیسے صدیوں کا انتظار ختم ہو گیا ہو ــــ وہ اپنے وجود سے بے خبر کھویا کھویا جواب دیتا رہا ــــ باتیں کرتا رہا ــــ اور ــــ اور اب باقی ہی کیا رہ گیا تھا ــــ گھر پر ماں انتظار کرتی ہے ــــ یہی جُملہ اس کے چھلانگ لگانے کو کافی تھا ــــ اور ــــ اب وہ اُتر جائے گا ــــ اگلے اسٹاپ پر ــــ اسے جیسے دھچکہ لگا ــــ اس نے کچھ نہیں کہا تھا ــــ اور اس کا شیو پھر کیلاش پربت

پر چڑھ جائے گا ــــ وہ بے چین سی ہو گئی ــــ

"سُنئے ــــ! آپ نے میرے بارے میں......"

"جی ــــ جی ــــ کون کس کے بارے میں سوچتا ہے ــــ سب کا اپنا آپ بہت امپارٹنٹ ہوتا ہے ــــ اور پھر اتنے ٹاپک قدم قدم پر بکھرے ہیں کہ اگر کوئی ان کو صرف چنتا ہی رہے تو کئی زندگیاں گزر جائیں ــــ بغیر کچھ بُوچھے ہُوئے ــــ"

اور پھر دھند لکے چھا گئے تھے ـ لیکن وہ ہاری نہیں ــــ دُودھیا کرنیں اسے سنبھال چکی تھیں "آپ میرے گھر آئیے ــــ ممّی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی ــــ"

"ہیں ــــ ہیں ــــ ہُوں ــــ" اور یہ کھوکھلی سی "ہوں" ــــ اس کے ذہن کو بَرماتی ہُوئی دُور کہیں گم ہو گئی ــــ اس ٹھنڈی سی "ہوں" کے پیچھے اسے لگا ــــ کہیں لاوا کھول رہا تھا ــــ کہیں آتش فشاں دبا پڑا تھا ــــ وہ گھبرا گئی ــــ یہ کیسا شیو ہے ــــ؟ صدیوں بعد ملا ــــ اور پھر گپھاؤں میں چھپنے کو تیار ــــ

آج ــــ آج جب اس کی پینٹنگ مکمّل ہونے کو تھی تو وقت کتنا سکڑ کر رَہ گیا تھا ــــ ایک نقطہ لگانے کا وقت بھی جیسے پھسلا جا رہا تھا ــــ کتنی باتیں ہوئی تھیں ــــ فلاسفروں کی ــــ شاعروں کی ــــ بُت تراشوں کی ــــ لیکن وہ اسے ہراتا چلا گیا تھا ــــ اور وہ ــــ ہار ہار کر جیت رہی تھی ــــ لیکن کہیں اُداسی بڑھ رہی تھی ــــ ہر اگلی ملاقات کی بات کسی نہ کسی انٹلکچول کی پھانسی، یا قتل گاہ میں اُلجھ جاتی ــــ

اچانک جیسے وقت ٹھہر گیا ہو ــــ جیسے ہوا رک گئی ہو ــــ اور پھر بارش کے ننّھے ننّھے قطرے چاروں طرف قوس قزح بنا کر ناچ اٹھے ہوں ــــ وہ خوب صُورت گلابی گھبری آنکھیں اس کے چہرے پر رینگ اٹھیں ــــ اتنے لمبے سَفر میں پہلی بار یہ آنکھیں اُٹھیں اور جیسے ٹھہر گئیں ــــ خاموش ــــ لیکن ــــ دَرد کے طوفانوں کو قید کئے ــــ اتھاہ گہرائیوں میں اُداسی سجی ہُوئی ــــ اس کا دم

گھٹنے سا لگا — کیا اس سے کوئی غلطی ہو گئی — کیا اس نے مجھے غلط لڑکی سمجھا۔
— یا — یا — میں — اس نے کہا تھا — ایسا کچھ بھی نہیں — گمبھیر آواز،
اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی — "بس ہمیشہ یہی ہوا ہے!"

"کیا — ؟"

"جو آج ہوا...... اور آخری لمحے میری موت ہو گئی — میں بہت بار
مر چکا ہوں — بہت بار — بہت بار — اور اب — اب میں مرنا نہیں
چاہتا — میں نے مرنے سے انکار کر دیا ہے!"

"نہیں — نہیں بلیز — میں نے ایک تصویر بنائی تھی — اور آخری
رنگ — آج — آج — ہُوں —

اور یہ لمبی ہُوں — جیسے گہرے کنویں میں اسے ڈبو لے گئی — ہلکے سے
دھچکے سے بس رک گئی تھی — دُور کہیں سے آواز گونجی — "معاف کیجئے گا —
زندگی بغیر دو پہیوں کے چلتی نہیں، ٹھہر جاتی ہے — بار بار میں نے یہی سبق
سیکھا ہے — بار بار — بار بار —" اور پھر ایک بھورا سا کمبل کندھے پر
سنبھال کر وہ کھڑا ہوا — گھٹنوں کے بیچ دبی بیسا کھیوں کو گھسیٹتا اور کھٹا کھٹ
کرتا — آہستہ آہستہ بس سے رینگ گیا —

اس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا — روکنے کے لئے — لیکن ہل نہ سکا —
اس کی چیخیں آسمان تک پہنچ گئیں — وہ پکار رہی تھی — لیکن آواز نے
اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا — اور — اور لمحہ ٹھہر گیا —

۱۹۷۴ء

گھروندے

"ہنہ ـــــ اماں ـــــ تم گھر کیوں نہیں بنواتیں ـــــ بتاؤ نا اماں ـــــ"
زینب آج پھر ٹھنک رہی تھی ـــــ رات کے گھنے اندھیرے سائے اس کے چھپّر سے باہر دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اماں کے ساتھ کونے میں دھان کے پیال پر لیٹی ہوئی زینب کی آنکھیں چھپّر سے باہر لمبے لمبے دیو اور مختلف شکلوں کے بھوت پریت تلاش کر رہی تھیں ـــــ وہ ماں کے سینے سے اور چپک گئی ـــــ چولھے پر رکھا ہوا ننھا سا مٹی کے تیل کا چراغ چھپّر کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا ـــــ چھپّر کے دروازے میں ابھی تک ٹٹی نہیں لگی تھی ـــــ کیوں کہ خیراتی ابھی تک کام سے واپس نہیں آیا تھا ـــــ

"اماں ـــــ بولو نا ـــــ تم گھر کیوں نہیں بنوالیتیں ـــــ بولو ـــــ"

"کیا یہ گھر نہیں ہے ـــــ؟ بُری بات بیٹا ـــــ ہر بات کی ضد اچھی نہیں ـــــ سو جا!"

ماں زینب کو بہلا کر سُلانا چاہتی تھی ـــــ مگر ننھی زینب روز کی طرح آج بھی گھر کے لئے اُلجھ رہی تھی ـــــ اسے یہ گھر بالکل پسند نہیں تھا ـــــ وہ سوچتی ہمارے اَبا آخر گھر کیوں نہیں بنواتے ـــــ یہ بھی کوئی گھر ہے ـــــ ایک چھپّر اور دُور تک ٹٹّر سے گھیر کر آنگن ـــــ اور بس ـــــ نہ کمرہ ـــــ نہ دالان ـــــ نہ آنگن ـــــ اور نہ بیٹھک ـــــ کوئی ملنے آئے تو سامنے والے املی کے پیڑ کا سایہ

بیٹھک بن جاتا ـــ اور پھر اسے یہ تو بالکل اچھا نہ لگتا کہ ایک ہی چھپّر میں چولھا۔ چکّی ـــ اوڑھنا ـــ بچھونا ـــ منھ ٹوٹے پرانے گھڑے اور ہانڈیاں ایک کونے میں تلے اوُپر رکھے ـــ جن پر اکثر چوہے دوڑتے رہتے ـــ ایک کونے میں لکڑی کا بڑا کھڑا کے چوکا سا بنا ہُوا ـــ اور ملائم ملائم پیال کا بستر ـــ بھلا یہ بھی کوئی گھر ہے ـــ اسے تو کبھی بھی وہ گھر کہنے پر تیار نہ ہوتی ـــ

اسے چودھری صاحب کا گھر بہت پسند تھا ـــ باہر بیٹھک، پھر آنگن، پھر دالان ـــ اور دالان کے اندر کمرے ـــ چاروں طرف اُونچی اونچی دیواریں ـــ آنگن کے ایک طرف چھوٹا سا باورچی خانہ ـــ ایک بڑی سی کوٹھری جس میں بڑی بڑی بکھاریں لگی ہوئیں ـــ اسے تعجب ہوتا کہ چودھری صاحب کے یہاں اتنے دروازے کیسے لگے ہیں ـــ جب کہ اس کے یہاں ایک بھی دروازہ نہیں ہے ـــ

جب بھی وہ چودھری صاحب کے گھر جاتی ـــ اسے ایک انجانی مسرّت کا احساس ہوتا ـــ ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی اس کے قدم ٹھٹھک جاتے ـــ گھر ـــ یہ گھر کتنا اچھا ہے ـــ وہ تھوڑا سا تن کر کھڑی ہوتی جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو ـــ اور پھر چودھرائن کی طرح قدم اُٹھاتی ہُوئی، آہستہ آہستہ ـــ اُونچے اور بھاری صَدر دروازے کی طرف لوٹ جاتی، دَروازے کی اوٹ سے باہر جھانکتی ـــ بالکل ویسے ہی جیسے اس نے اکثر چودھرائن کو کرتے دیکھا تھا ـــ پھر وہ دَوڑ کر بیٹھک میں نکل جاتی۔ اور پھر وہاں سینٹھے کے بنے ہُوئے مونڈھوں کو اِدھر اُدھر کھینچنے لگتی ـــ جیسے وہ اپنی بیٹھک ٹھیک کر رہی ہو ـــ اس کا ننھا سا دل دھڑکتا ـــ کوئی دیکھ نہ لے ـــ لیکن سنسان دوپہر میں اس کا یہ کھیل کون دیکھے گا ـــ اور پھر وہ بیڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو زمین سے اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینکتی۔ اکثر ایسا کرتے کرتے وہ بڑبڑانے بھی لگتی ـــ

"بڑے بدتمیز ہیں یہ گنوار ـــ جلتی بیڑی تک پھینک دیتے ہیں ـــ اگر آگ لگ جاتی ـــ تو ـــ تو ان کے باپ کا کیا بگڑتا ـــ اور میاں تو

بربادی ہو جاتی ــــ"

وہ چودھرائن کے الفاظ دہراتی جاتی اور اس کی آنکھیں بار بار اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتی رہتیں ــــ کہیں کوئی دیکھ نہ لے ــــ اور اکثر تو وہ مونڈھے پر ذرا سا ٹک بھی جاتی ــــ لیکن ــــ لیکن پھر وہ جلدی سے اندر بھاگ جاتی ــــ سلمہ کو بُلانے کے لئے ــــ اور جب سلمہ کمرے سے کودتی ہُوئی دالان میں آتی تو اس کا دل دھڑک اُٹھتا ــــ کمرے کے دَروازے سے نکلتی ہوئی سلمہ اُسے بہت اچھی لگتی ــــ اور پھر سلمہ کو دالان ہی میں چھوڑ کر وہ کمرے میں گھس جاتی ــــ اور پھر وہاں سے سلمہ کی طرح کودتی ہُوئی ــــ بھاگتی ہُوئی دالان میں آجاتی ــــ وہ بھُول جاتی کہ وہ زینب ہے وہ اپنے کو سلمہ سوچتی ــــ اور غرور سے اُونچی اُونچی دیواروں پر نظر ڈالتی ــــ جن کے اُوپر نیلا آسمان جھکا ہوتا ــــ اور پھر سلمہ اس کی یہ دُنیا اُجاڑ دیتی ــــ "زینب! چلو کھیلیں ــــ" اور زینب چونک پڑتی ــــ "اوں ــــ ہاں ــــ ہاں چلو کھیلیں ــــ"

وہ گھر کے سامنے پھیلے ہُوئے پُرانے چھپترے سے بڑ کے نیچے بیلوں کی ناندوں سے تھوڑا دُور مُڑ جاتی ــــ "آؤ سلمہ گھروندے بنائیں" ــــ اور کئی لڑکیاں جمع ہو جاتیں ــــ سب ہی زمین پر پیر پھیلا کر بیٹھ جاتیں اور ایک پیر کو مٹی میں توپ کر اُوپر سے دونوں ہاتھوں سے مٹی کو پیٹتی رہتیں ــــ سب ہی مگن ہو کر ایک سُر کے ساتھ کہتی جاتیں ــــ

"چینٹی چینٹی گھر بناؤ ــــ گھر بنا کر گھر لبساؤ ــــ"

سَب کے ہی گھروندے الگ الگ بنتے ــــ زینب خوش ہو کر سب سے کہتی ــــ "میرا گھروندا دیکھو ــــ میرا گھروندا دیکھو ــــ یہ کمرہ ــــ یہ بردٹھا ــــ" اور پھر سوکھی مٹی کی دو انگل اٹھی ہُوئی منڈیر کو کود کر آنگن میں کھڑی ہو جاتی۔ "کتنا بڑا گھر ــــ وہ دیکھو ــــ بیٹھکا ــــ کونے میں بنی چھوٹی سی کوٹھری ــــ میرا آنگن تو تم سب سے بڑا ہے ــــ" وہ ہنس دیتی ــــ مٹی کے گھروندے میں دیکھنا ہی کیا ــــ بس ایک کوٹھری اور دُور تک دیوار کھینچ کر بنا ہوا آنگن ــــ

لیکن سلمہ کا بنا ہوا گھروندا وہ بڑے غور سے دیکھتی ___ اور پھر ہنستے ہنستے دُہری ہو جاتی' نہ جانے کتنے کمرے ___ برآمدے ___ اور ڈیوڑھی ___ وہ مذاق اُڑاتی ___ "آہا! ان کو دیکھو ___ بالکل بدھو ___ بھلا گھر میں کہیں اتنے خانے ہوتے ہیں ___" اور سلمہ منھ بناتے ہوئے چڑھ جاتی ___

"ہٹ تجھے کیا معلوم ___ دیکھ ___ دیکھ یہ ڈرائنگ رُوم ___ یہ ڈائننگ رُوم ___ یہ بڈ روم ___ یہ ریڈنگ رُوم ___ چچا جان کا گھر ایسا ہی ہے شہر میں ___" زینب بڑے غور سے سُنتی ___ لیکن اسے صرف سلمہ کی ڈرائنگ کاپی والی چند شکلیں یاد آتیں ___ اور بس ___ اور پھر وہ سلمہ کو بے وقوف سمجھ کر اپنے گھروندے میں لگ جاتی ___ اور جب شام کے دھندلکے دبیز ہونے لگتے ___ اور گاؤں دھیرے دھیرے دھندلا ہونے لگتا تو سب ہی لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو چل دیتیں ___ زینب کا گھروندا رات تک بنا رہتا ___ اور جب وہ سونے کے لئے جاتی تو اپنے گھروندے کے دروازے مٹی کی پتلی سی دیوار بنا کر بند کر جاتی ___

روزانہ رات کو وہ ماں سے ناراض ہو جاتی ___ "تم گھر کیوں نہیں بنواتیں" اور ماں کے سمجھاتے سمجھاتے اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں ___ اور وہ کمرے اور دالان والے گھر کی رانی بن جاتی ___ رات بھر وہ چودھرائن کی طرح اپنے لمبے چوڑے گھر کے کاموں میں جٹی رہتی ___ کبھی مرغیاں ہنکار رہی ہے ___ کبھی باورچی خانہ کی صفائی کر رہی ہے ___ کبھی کوٹھری سے جنس نکلواتی اور کبھی کمرے میں بیٹھ کر پان چباتی ___ مگر صُبح جب آنکھ کھلتی تو کتھری میں گھسا ہُوا مُنھ اور پیروں میں اُلجھا ہُوا پیال اسے بتا دیتا کہ وہ کہاں ہے وہ جلدی سے آنکھ بند کر لیتی ___ اور کوشش کرتی پھر اسی دُنیا میں لوٹ جائے ___ جہاں سے چند لمحے پہلے آئی تھی ___ لیکن بار بار کس کر آنکھیں میچنے کے باوجود وہ چھپّر میں گھر گھر کرتی چکّی سے دور نہ جا سکتی ___ اور پھر وہ آنکھیں ملتی ہُوئی اُٹھ جاتی ___ اسے خیال آتا اس کا گھروندا ___ اور دُوسرے لمحہ وہ بڑ کے نیچے پہنچ جاتی ___ کہیں رات میں کسی نے اس کا

گھروندا گرا تو نہیں دیا ـــــ اور یہ دیکھ کر اس کا دل مسل جاتا کہ صبح گزرتے ہوئے جانوروں نے اس کے گھر کو اپنے کھُروں سے تباہ کر دیا ـــــ وہ تھوڑی دیر تو افسوس کرتی مگر پھر ـــــ جلدی سے بنانے بیٹھ جاتی ـــــ کہیں سلمہ، مُنّی وغیرہ نہ دیکھ لیں کہ اس کا گھروندا بھی مٹ گیا ہے ـــــ

دن، مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے ـــــ اور اَب زینب کا مٹی کے تودے میں پیر دبا کر بننے والا گھروندا، اس کے ذہن میں بننے لگا تھا ـــــ رات میں ماں سے ضد کرنے کے بجائے وہ پیال کے کونے میں دبک کر چپکے چپکے اپنے گھر کے بارے میں سوچتی رہتی ـــــ گھر کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کے جسم میں گدگدی سی ہونے لگتی ـــــ اس کے گھر میں کمرے ـــــ دالان ـــــ اور ـــــ آنگن کے ساتھ ساتھ اب ایک گھر والا بھی آ بسا تھا ـــــ

سلمہ سے اس کی اب بھی دوستی تھی ـــــ لیکن اب وہ گھروندے بنا کر سلمہ سے اپنی برتری کا اظہار نہیں کر سکتی تھی ـــــ اکثر وہ سلمہ کے غرور کو بھی پی جاتی تھی ـــــ کہیں سلمہ ناراض ہو گئی تو ـــــ وہ کس بہانے اپنے خیالوں میں بسے اس گھر میں آ سکے گی ـــــ جیسے بچپن کی ساری دولت اس نے یہیں چھپا دی ہو ـــــ وہ اب اکثر سارا سارا دن چودھری صاحب کے یہاں رہتی ـــــ باورچی خانہ کی دیواریں چھت تک مٹی سے پوتتی ـــــ چولھا ٹھیک کرتی ـــــ فرش کو خوب رگڑ رگڑ کر دھوتی ـــــ اور یہ سارے کام اس لگن سے کرتی کہ چودھرائن خوش ہو کر سلمہ کو ڈانٹنے لگتیں ـــــ

"دیکھو زینب کو ـــــ کیسے سلیقے سے سارا کام کرتی ہے ـــــ بچاری کا گھر نہ بار تب بھی ......" اور زینب کے چلتے ہوئے ہاتھ یہ سنتے ہی ٹھٹھک جاتے نہ گھر نہ بار ـــــ وہ تصوّر کے سنہرے جھولے سے حقیقت کی چٹان پر دھڑاک سے جا گرتی ـــــ

"ہاں ٹھیک ہی تو ہے ـــــ وہ سلمہ کے گھر میں ہی تو کام کر رہی تھی، وہ تو بالکل بھول گئی تھی کہ یہ گھر اس کا نہیں ہے ـــــ" وہ کام ختم کر کے خاموشی

سے اپنے ایک چھپّر والے گھر میں چلی جاتی ــــ ایک چھپّر اور ٹٹیوں والا گھر ــــ
چودھرائن پوچھتی رہتیں ــــ "کیا ہوا ــــ کیا طبیعت خراب ہو گئی ــ؟"

اس کی کنول جیسی سفید آنکھوں میں شبنم کے قطرے ابھر آتے ــــ اور وہ چپکے سے کسی کونے میں بیٹھ کر انھیں اطمینان سے آنچل میں چھپا لیتی ــــ
باپ تو صبح ہی مزدوری پر چلا جاتا ــــ ماں بھی اپنے کاموں میں لگی رہتی ۔ اور اسے سب کچھ سوچنے کے لئے میٹھی تنہائی مل جاتی ــــ اس کے سارے سپنے مٹی اور چونے کے بنے ہوئے گھر کے ہی اردگرد منڈلاتے رہتے ــــ

وہ فاقے کر سکتی تھی ــــ اسے زیور کا بھی شوق نہیں تھا ــــ اسے پرواہ نہیں تھی کہ اس کی اوڑھنی میں کتنے پیوند لگے ہیں ــــ لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے ذہن کو گھر کے تصوّر سے چھٹکارا نہ ملتا ــــ

وہ زمین پر بیٹھی اپنی سکھیوں سے باتیں کرتی رہتی اور ننھی سی کنکری اٹھا کر بے خیالی میں زمین پر لکیریں کھینچتی رہتی ــــ اور وہ لکیریں آخر میں چودھری صاحب کے گھر کا پورا نقشہ بن جاتیں ــــ

اس کی سکھیاں شادی کی باتیں کرتیں ــــ اور سسرال سے لوٹی ہوئی سکھی کو بار بار چھیڑتیں ــــ اور زینب سب سے پہلا سوال کرتی ــــ "تیرا گھر کیسا ہے ــــ؟" لڑکیاں ہنس پڑتیں ــــ

"گھر کو پوچھ رہی ہے ــــ بے وقوف ــــ گھر والے کو پوچھ ــــ گھر والے کو ــــ" اور زینب مسکرا کر جواب دیتی ــــ

"جب گھر ٹھیک ہو گا تو گھر والا بھی ٹھیک ہی ہو گا ــــ" سب لڑکیاں تو دولہا کے بارے پوچھتیں اور زینب کمرے کے بارے میں ــــ

اور جب ــــ زینب کے باپ نے اس کی شادی پکّی کر دی تو اس کو سب سے پہلے یہ فکر ہوئی ــــ سسرال میں گھر ہے یا چھپّر ــــ؟ اور پھر ایک رات اس نے خواب میں دیکھا ــــ وہ دلھن بنی ڈولی سے اتر رہی ہے ــــ اونچی سی دہلیز کے بعد اس نے جب اندر قدم رکھا تو کمرہ تھا ــــ کمرے کے بعد وہ نہ معلوم کتنے بڑے آنگن سے گزار کر دالان میں بٹھائی گئی ــــ بالکل

حامد بھائی کی دلھن کی طرح ____ گھر بھی بالکل چودھری صاحب کے گھر سے ملتا جلتا تھا ____ پھر نہ جانے کتنی رسموں کے بعد رات آئی تو اسے دالان سے اٹھا کر کمرے میں بٹھایا گیا ____ اور اس نے موقع ملتے ہی چھت کو جھانک لیا ____ موٹی موٹی دھنیوں پر سرخ سرخ پیڑے دکھائی دیئے ____ اس کی نظر سفید سفید دیوار سے پھسلتی ہوئی اپنے سرخ دوپٹے میں الجھ گئی ____ اس کا سینہ مسرت سے بھر گیا ____ وہ چودھرائن لگ رہی تھی ____ اس کا یہ گھر کتنا اچھا ہے۔ کتنا شاندار ____ وہ سلمہ کو ضرور بلائے گی ____ اور چودھرائن کو...... اور اس کے کانوں میں ہمدردی سے بھرے ہوئے چودھرائن کے الفاظ گونج اٹھے "بیچاری کے گھر نہ بار ____" وہ مسکرادی ____ ہُنہ ____ اور پھر اس نے سوچا وہ اپنے اس گھر کے سارے کام خود کرے گی ____ ساس کو کچھ نہیں کرنے دے گی ____

وہ اپنے ذہن میں پورے گھر کے انتظام کا خاکہ بنانے لگی ____ پتہ نہیں مرغیاں ہیں یا نہیں ____ اور آنگن تو روزانہ دھو ڈالوں گی ____ ایک نوجوان چہرہ حامد بھائی جیسا اس کے قریب ____ بہت قریب ابھرا ____ اس کے ہاتھ پیر جیسے بے جان ہو رہے تھے ____ باہر زور زور سے باجے بج رہے تھے ____ اور یہ باجے آہستہ آہستہ اس کے قریب ہوتے گئے ____ قریب ہوتے گئے ____ اور پھر ____ گھر گھر کرتی ہوئی چکی کی آوازیں منتقل ہو گئیں ____ اس کے پیروں میں الجھے ہوئے پیال کے جال نے بتا دیا کہ وہ ابھی اس چھپر کے بندھن کو توڑ نہیں سکی ہے ____ وہ اٹھ بیٹھی ____ اور آنکھیں ملتی ہوئی ماں کے ساتھ چکی پر بیٹھ گئی ____ اس کے ہاتھ چکی گھسیٹتے رہے اور وہ ____ اپنے خوابوں میں بھٹکتی رہی ____ چکی سے اٹھی تو دوسرے کاموں میں لگ گئی ____ آج وہ بے حد خوش تھی ____ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے ____ اس نے آج خواب میں اپنے ہونے والے گھر کو دیکھ لیا تھا ____

ڈولے میں بیٹھتے ہی زینب رخصتی کا رونا دھونا بھول گئی ____

کہاروں کے اُونچے نیچے قدموں اور ڈولے کے ہچکولوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے نئے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی ___

ڈولا رُکا ___ عورتوں کا شور وغل سُنائی دیا ___ چھم چھم زیور چھنکے اور کسی نے جُھک کر ڈولے سے اسے گود میں نکالنا چاہا ___ لیکن اس نے جان بوجھ کر پیر زمین پر ٹکا دیا ___ ٹھنڈی مٹی کی ٹھنڈک نے اسے بتا دیا کہ فرش کچّا ہے ___ اس کا چہرہ گھونگھٹ میں بالکل لپٹا ہُوا تھا ___ ایک عورت کی گود میں وہ کہیں جا رہی تھی ___ شاید آنگن سے گزر رہی ہے ___ اس نے سوچا ___ پھر اسے بستر لگے ایک پلنگ پر بٹھا دیا گیا ___ وہ سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ گھونگھٹ ایک طرف کھسک گیا ___ اور اس کی نظریں سامنے دیوار پر جم گئیں ___ نرکل سے بنی ہُوئی موٹی سی دیوار جس پر پُرانے نرکل کے چھلکے لٹک رہے تھے ___ اس نے جلدی سے دُوسری طرف منھ پھیر لیا ___ اب اس کے سامنے کچّی مٹّی کی دیوار تھی جو چھوئی مٹّی سے پُتی ہوئی چمک رہی تھی ___ اس کا سر گھومنے لگا ___ ایک عورت نے اس کی بگڑتی ہُوئی حالت کا اندازہ کر کے اس کا سر اپنے گھٹنے سے ٹکا لیا ___ وہ آنکھیں بند کئے پڑی تھی ___ اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھیں چھپّر سے لٹکتے پتا در پر جم کر رہ گئیں ___ دھوئیں سے کالا چھپّر ___ اس کے دل و دماغ پر جیسے اندھیرا چھا گیا ___ گھور اندھیرا ___ پھر اسے کچھ نہیں معلوم اس سے کتنی رسمیں کرائی گئیں ___ اور کب رات بھی چپکے سے آ گئی ___ بس کبھی کبھی دُور سے اس کے کانوں میں ایک آواز اُبھرتی ___ "بیچاری کے گھر نہ بار" ___ اور پھر ___ وہ نہ جانے کہاں کھو جاتی ___

صُبح اسے صرف اتنا یاد تھا کہ حنیف نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ شہر میں اس کے ساتھ مکان لے کر رہے گا ___ اسے یہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس نے پہلی ہی مُلاقات میں کس طرح حنیف سے مکان کی بابت کہا تھا ___ اور کیا کہا تھا ___ بس وہ پھر سے خوش تھی ___

اس نے آنگن سے دیکھا ___ باہر نیم کی چھاؤں میں دو ناندیں گڑی

ہوئی تھیں ___ جن میں دو مریل سے بیل چارہ کھا رہے تھے ___ اس سے ذرا دُور ہٹ کر دُوسری طرف دو تین بانس کی چارپائیاں پڑی تھیں ___ جن پر کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے ___ اس کے نئے گھر کا بیٹھکا بھی نیم کی چھاؤں سا تھا ___ بالکل اس کے اپنے گھر کی طرح ___ وہاں املی کا سایہ تھا اور یہاں نیم کا ___ اس کا دل بھر آیا ___ اس کے گھروندے سے بالکل مختلف یہ بیٹھکا تھا ___ وہ خاموشی سے کوٹھری میں لوٹ گئی ___ اس نے اپنے دل کو لاکھ سمجھایا کہ حنیف نے اس سے وعدہ کیا ہے ___ اور پھر اسے تو شہر میں ہی رہنا ہے ___ لیکن وہ اُمڈے ہوئے آنسوؤں کے دھارے کو نہ روک سکی ___

کئی دن گزر گئے ___ آج وہ میکے جا رہی تھی ___ کیسے وہ اپنی سکھیوں سے اس گھر کے بارے میں بتائے گی ___ اس کے خیالوں میں بسا ہوا گھر بھی اس کے گھروندوں کی طرح مٹ چکا تھا ___ دُور ایک چراغ ٹمٹمایا۔ شہر میں تو صرف مکان ہی ہوتے ہیں ___ سلمہ بھی یہی کہتی تھی ___ حنیف نے بھی تو مکان ہی کی بات کہی ہے ___ اور ___ وہ، دُور روشنیاں ڈھونڈنے لگتی ___

سات مہینے گزر گئے ___

حنیف شہر میں رکشا چلاتا تھا ___ وہ دن بھر رکشا چلاتا ___ اور ساتھ ساتھ مکان کی تلاش بھی جاری رکھتا ___ لیکن اب وہ نا اُمید ہونے لگا تھا ___ اسے زینب سے کیا اپنا وعدہ ہوا میں معلّق نظر آنے لگا تھا ___ کہ ایک گندے سے محلہ میں اسے چھوٹا سا مکان مل گیا ___ وہ بہت خوش تھا ___ جلدی جلدی گاؤں بھاگا ___ مکان کی بات سُنکر اور حنیف کے آنے سے زینب پھُولے نہ سمائی تھی ___ وہ جانے پر تیار ہوگئی ___ اس کی ماں اور ساس دونوں نے ہی منع کیا ___ وہ ماں بننے والی تھی ___ لیکن اس نے کسی کی نہیں سُنی ___ وہ خاموش رہی ___ اور ___ حنیف اسے شہر لے آیا ___

جب وہ اپنے خوابوں کے شیش محل میں داخل ہوئی تو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے ــــ اس نے محسوس کیا جیسے وہ پریوں کی شہزادی ہو ــــ اور ــــ اس کا یہ محل جادو کا ہے ــــ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی ــــ چھوٹا سا، مختصر سا گھر ــــ لیکن اس میں چھپّر کہیں نہیں تھا ــــ ایک کمرہ ــــ آنگن ــــ باورچی خانہ ــــ کوٹھری ــــ اور پاخانہ ــــ اس نے بغیر کچھ کھائے پئے ہی گھر کی صفائی شروع کر دی ــــ حنیف بازار سے کچھ کھانے کو لایا ــــ کچھ اس کے ساتھ بھی بندھا تھا ــــ زینب نے جلد ہی جلدی کھانا ختم کیا ــــ اور ذرا دیر میں گھر کا حلیہ بدل دیا ــــ سفید چونے سے پُتا ہوا یہ چھوٹا سا گھر جیسے نور میں نہا گیا ہو ــــ اس نے گھر پر ایک نظر ڈالی ــــ اُف! یہ اس کا اپنا ہے ــــ اور اس کے ذہن میں فوراً یہ خیال جاگا ــــ وہ کیسے سلمہ، مُنّی اور چودھرائن کو دکھائے کہ اس کا گھر وندا کتنا صحیح تھا ــــ اس نے کمرے اور آنگن کے کئی چکّر لگائے اور پھر وہ کچھ افسردہ سی ہو گئی ــــ یہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے ــــ پھر آہستہ آہستہ وہ باورچی خانہ میں چلی گئی ــــ

جلد ہی اس نے محلّہ میں بھی اچھی خاصی دوستی کر لی ــــ سب کو ہی تعجب ہوتا کہ دیہات سے آئی ہوئی یہ لڑکی کس سلیقہ سے گھر سجائے رکھتی ہے ــــ جبکہ اس کے محلّے کی اور عورتیں اور لڑکیاں کبھی اپنے گھر کی طرف غور بھی نہ کرتیں ــــ جھاڑو دے کر کھانا پکانا ہی ان کا کُل کام تھا ــــ سارے دن ہر سَودے والے سے کچھ نہ کچھ خریدا جاتا ــــ کبھی کھانے کا سامان ــــ اور کبھی سنگھار کا ــــ دن بھر پھیری والوں کا تانتا بندھا رہتا ــــ سستی سستی چیزیں خریدی جاتیں ــــ پیتل کے زیور ــــ موتی کے بندے ناخونی ــــ پوڈر ــــ لالی وغیرہ ــــ لیکن زینب اِن سب چیزوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی ــــ اسے تو تخت ــــ پلنگ ــــ مونڈھے ــــ نہ جانے کتنی چیزیں اپنے شیش محل کے لئے خریدنا تھیں ــــ نہ جانے کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی فہرست اس کے ذہن میں موجود تھی ــــ جیسے آہستہ آہستہ

وہ پورا کر رہی تھی ـــــ وہ اکثر بھوکی رہتی ـــــ اس نے کپڑے بنوانے کا نام بھی کبھی نہیں لیا ـــــ وہ اپنے سنگھار کے لئے بھی کچھ نہ خریدتی ـــــ اسکی مٹھی سے جب کبھی روپے کھسکتے تو گھر میں کوئی نئی چیز نظر آنے لگتی ـــــ اس نے جلد ہی اچھا خاصا سامان اکٹھا کر لیا ـــــ

برسات گزر چکی تھی ـــــ اور آسمان کی بلندیوں سے لٹائے گئے ننھے ننھے قطرے دھرتی کی تہہ میں پہنچ کر نہ جانے کہاں کھو گئے تھے ـــــ چمکتے ہوئے نیلے آسمان نے کئی مہینوں کی اوڑھی ہوئی دبیز بادلوں کی چادر دُور پھینک دی تھی ـــــ اور اَب ـــــ وہی وقت آگیا تھا ـــــ جب زینب کو ایک ننھے مہمان کا استقبال کرنا تھا ـــــ وہ اپنی ساس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ سوچتی ـــــ ساس آکر کتنا خوش ہوگی ـــــ اس نے کتنی جلدی بہت سا سامان اکٹھا کر لیا ہے ـــــ اگر سامان کی خرید کا یہی حال رہا تو شاید کچھ دنوں کے بعد یہ گھر چھوٹا لگنے لگے گا ـــــ وہ سارا سارا دن گھر میں ہی لگی رہتی ـــــ کبھی فرش برابر ہو رہا ہے ـــــ کبھی کسی کونے کی مرمّت ہو رہی ہے ـــــ حنیف جب بھی گھر آتا زینب کو گھر میں لگا ہی پاتا ـــــ وہ جھنجھلا جاتا ـــــ اور ـــــ ٹوک دیتا ـــــ لیکن زینب تیز آواز میں جواب دیتی۔

"مردوں کو کیا معلوم گھر کیسے جڑتا ہے ـــــ تم لوگوں کو تو بس کمانے سے مطلب ہے ـــــ گھر عورتیں بناتی ہیں عورتیں ـــــ" وہ دھاک جماتی۔ اور حنیف سچ مچ خاموش ہو جاتا ـــــ

وہ جانتا تھا کہ اس کی تھوڑی سی آمدن میں اس کا گھر، اسکے ساتھیوں کے گھر سے کتنا مختلف ہے ـــــ اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے اکثر محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں میں باعزّت ہو چلا ہے ـــــ اور پھر ایک دن ـــــ اس نے چوراہے پر سُنا ـــــ گومتی میں سیلاب آرہا ہے، برسات تو کب کی گزر گئی ـــــ یہ سیلاب کیسا ـــــ دن بھر شہر میں سنسنی پھیلتی رہی ـــــ اور گومتی کی مستانی چال قہر و غضب میں بدلتی گئی ـــــ دوپہر میں جب وہ کھانا کھانے آیا تو اس نے زینب کو بھی خبر دی ـــــ شہر میں

سیلاب کا پانی پھیل رہا ہے ـــــ لوہے والے پل کے قریب ریزیڈنسی ـــــ اور چھتر منزل والی سڑک پر پانی آچکا ہے ـــــ اس نے خود پل پر سے دیکھا تھا ـــــ ٹیلے والی مسجد اور گھنٹہ گھر کے چاروں طرف پانی بھر چکا تھا ـــــ اور سیکڑوں عورتیں بچے اور مرد سامان اٹھائے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اسٹیشن کی طرف بھاگ رہے تھے ـــــ پانی کی خوفناک لہروں میں چھپر ـــــ برتن ـــــ کپڑے بھاری بھاری جھاڑیاں سب تنکے کی طرح بہتی ہوئی دور منکی برج سے پار بھاگ رہی تھیں ـــــ محفوظ جگہوں پر رہنے والے بھی ہراساں نظر آرہے تھے۔ سارا دن اور رات لوگ بھاگتے رہے اور پانی بڑھتا رہا ـــــ

دوسرے دن صبح معلوم ہوا ـــــ شاہ نجف روڈ پانی میں ڈوب چکا ہے آرٹ اسکول اور ندوہ میں پانی بھر چکا ہے ـــــ یونیورسٹی میں رجسٹرار آفس سے بڑھ کر پانی فیکلٹی بلڈنگ تک پہنچ رہا ہے ـــــ اور اب تو اس کے محلے میں بھی اودھم ہو گیا تھا ـــــ رات تک پانی ضرور اس کے محلے میں پہنچ جائیگا ـــــ

غراتی لہریں اٹھتیں اور زمین کا تھوڑا سا خشک حصہ ان کی تہہ میں پہنچ جاتا ـــــ لوگ محلہ خالی کرنے لگتے ـــــ زینب سے بھی حنیف نے مکان چھوڑنے کو کہا ـــــ مگر وہ جانے پر راضی نہ ہوئی ـــــ وہ کیسے خالی کر دے یہ مکان ـــــ کتنی منتوں اور دعاؤں کے بعد تو اسے اپنے خوابوں کی تعبیر ملی تھی ـــــ مغرب کے وقت تک تقریباً سارا محلہ خالی ہو گیا۔ زینب کی ضد کے آگے حنیف کی کچھ نہ چلی ـــــ پانی آہستہ آہستہ گلیوں میں رینگ رہا تھا ـــــ اور گلیاں چمکیلی چادریں چھپتی جا رہی تھیں ـــــ اور پھر ـــــ اچانک زینب نے دیکھا اس کے شیش محل کے درشن کے لئے مہری سے آہستہ آہستہ پانی آنگن میں پھیل رہا تھا ـــــ تیز لہروں کی ڈراؤنی آواز سارے محلے میں دہشت پھیلا رہی تھی ـــــ اور اس بھیانک گونج کے ساتھ اکا دکا مکان بھی گھم گھما کر گرنے لگے ـــــ زینب کے ساتھ والا مکان گرا، اور زینب دہل گئی ـــــ حنیف اب ایک سکنڈ بھی رکنے کو تیار نہ تھا ـــــ کہ اس کا کمرہ بھی بڑے زور کے دھماکے کے ساتھ بیٹھ گیا ـــــ زینب کانپ گئی ـــــ

حنیف نے جلدی سے باہر جھانکا ـــــ وہ ایک ناویں پانی میں گھرے ہوئے انسانوں اور سامان کو نکالنے میں مشغول تھیں ـــــ کبھی کبھی تو کچھ ایسا شور سنائی دیتا کہ ناؤ بغیر کنارے گئے ہی سامان لادے کسی دوسرے کو بچانے مخالف سمت چل دیتی ـــــ شور و غل اور لہروں کی گڑگڑاہٹ میں ناویں غائب ہو جاتیں ـــــ اور لوگ سامان کو بھول کر جان ہی بچانے کو غنیمت سمجھتے اور خدا کا شکر ادا کرتے ـــــ

حنیف اور زینب بھی ایک پلنگ اور کچھ سامان اپنے اوپر لاد کر گلی میں نکل آئے ـــــ گھٹنے گھٹنے پانی میں وہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک ناؤ والے نے آواز دی ـــــ

"ٹھہرنا بھیا ـــــ ناؤ لاتا ہوں ـــــ!" اور پھر یہ لوگ سڑک کے کنارے پہنچ گئے ـــــ

پانی سڑک پر بھر چکا تھا ـــــ اور جہاں تک پانی پہنچا تھا۔ وہاں گیس کی روشنی کر دی گئی تھی ـــــ خشک سڑک پر لوگوں کا میلہ سا جمع تھا ـــــ جو سیلاب کی سیر کرنے آئے تھے ـــــ اور سامنے والی سڑک پر پانی لہریں لے رہا تھا ـــــ اور آگے سڑک بالکل بند ہو چکی تھی ـــــ دور لالٹین لئے ایک کشتی تیر رہی تھی۔ اور گومتی گھنے محلوں میں گھسی شہر کی ان گندی بستیوں کا جائزہ لے رہی تھی جہاں پانچ سال سے پہلے کوئی لیڈر نہیں گزرتا تھا۔

ہزاروں بے گھر لوگ فٹ پاتھ پر پڑے تھے ـــــ اور پھر کارپوریشن کی طرف سے بانسوں کے سہارے ٹن کے سائبان ان تباہ حالوں کے سر چھپانے کو ڈال دیئے گئے ـــــ زینب اور حنیف نے بھی ایک کونے پر قبضہ کر لیا ـــــ

یوں ہی تین دن گزر گئے ـــــ بھوک، پیاس، خوف اور غم سے زینب کا دم گھٹا جا رہا تھا ـــــ ہیلی کاپٹر نے کھانے کے تھیلے برسائے ـ ٹھیلوں پر لاد لاد کر کچھ دور سے کھانے آئے ـــــ لوہے کی بھاری بھاری تجوریوں نے پوریوں کے ڈھیر لگا دیئے ـــــ لیکن یہ سب نگلنے کے لئے حلق رندھ چکا تھا۔

ہزاروں گھروں کے ساتھ اس کا اپنا گھر بھی مٹ چکا تھا ــــ جس کا کونا کونا اس نے بھوک و پیاس کی شدت برداشت کر کے سجایا تھا ــــ یہاں سے تو اس کا وہ کھنڈر بھی نظر نہیں آتا جو اس رات دھما کے کے ساتھ ڈھے گیا تھا ــــ اب وہ کیا کرے گی ــــ اس کا سارا سامان برباد ہو چکا تھا ــــ اور اب جلد ہی اسے سر چھپانے کے لئے ایک جگہ کی ضرورت تھی ــــ

اس کا ننھا مہمان ...... وہ سوچتے سوچتے تڑپ سی گئی۔ اسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ــــ اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں کے سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر سفید چاندنی میں نہائی ــــ ایک کوٹھی چمک رہی تھی ــــ بہت بڑی کوٹھی ــــ زیب کی نگاہیں اس پر جم گئیں ــــ اتنی بڑی کوٹھی میں تو بہت سے کمرے ہوں گے ــــ بہت سے دالان ــــ اس نے سوچا ــــ سلمہ کا گھروندہ بھی ٹھیک ہی تھا ــــ اس کے دل میں خواہش جاگی ــــ اس کوٹھی کو اندر سے دیکھے ــــ کیسی بنی ہے ــــ اندر کتنے خانے ہیں ــــ ؟

اور پھر ــــ جب ایک روز اس کوٹھی کے دروازے پر بھیڑ جمع تھی ــــ اور سیلاب زدگان کو ڈبہ سے ناپ ناپ کر آٹا اور دال بٹ رہا تھا ــــ وہ بھی لینے پہنچ گئی ــــ اس نے غلّہ کو کوچھے میں لے کر ڈیوڑھی کے اندر جھانکنے کی کوشش کی ــــ مگر اندر ــــ دوسری ڈیوڑھی کی موٹی سی دیوار سامنے تھی ــــ اور وہ اندر نہ جا سکی ــــ

رات کو وہ ٹین کے سائبان کے نیچے لیٹی لیٹی ــــ کوٹھی کے روشندانوں سے پھوٹتی روشنیاں تکا کرتی ــــ کھڑکیوں کے لٹکتے پردوں میں اس کی نگاہیں الجھ جاتیں ــــ

کتنے کم لوگ رہتے ہیں اس میں ــــ اور کتنا بڑا ہے یہ گھر ــــ نہ معلوم کتنے کمرے تو بند پڑے ہوں گے ــــ اور ــــ جب رات کی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا، اس کے جسم میں چبھ جاتی ــــ تو اس کی نگاہیں روشندان سے پھوٹتی ہوئی گرم گرم روشنی پر جم جاتی ــــ

حنیف خراٹے لے کر سوتا رہتا ___ اور وہ سوچتی ___ اس شہر میں کتنے آدمی ہیں جو سڑکوں پر پڑے ہیں ___ اور کتنے کمرے ایں جو بند ہیں۔ کاش یہ بند کمرے کوئی کھول سکتا ___ اندھیرے بند کمرے۔

اور پھر ___ جس روز کارپوریشن کے مزدور سائبان کی ٹن اور بانس ٹھیلوں پر لاد رہے تھے ___ اسے چکر سا آ گیا ___ اس کا سر حنیف کے شانے سے ٹک گیا ___ بانس کے چاروں طرف پرانے ٹاٹ کے پردے جو اس نے لٹکا لٹکا کر دیواریں بنائی تھیں ___ ایک طرف ڈھیر تھے ___ اور سامان ___ چمکتے ہوئے آسمان کے نیچے پھیلا پڑا تھا ___ اس نے سوچا اس کا گاؤں کتنا اچھا تھا ___

ایک چھپر ___ صرف ایک چھپر ___ مٹی کا گھروندا ___ مگر کتنوں کو پناہ دیتا تھا ___ میرا گھروندا ___ ایک کمرے اور ایک دلان والا ___ جو بہہ گیا۔ اور یہ سلمہ کا گھروندا ___ نہ جانے کتنے کمروں اور دالانوں والا۔ مگر۔ مگر مقفل۔

۱۹۶۲ء

بیمہ

مس شاردا کی شادی ___ یہ دفتر میں سب ہی کو تعجب تھا ___ ابھی کل تک تو دفتر میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی۔ جبکہ اکثر دفتر والے کام کم کرتے ہیں، اور صاحب لوگوں کی جاسوسی زیادہ ___ اور پھر ایسی افسر ___ بے حد سخت اور بے پناہ ہمدرد ___ کیا مجال کہ دفتر کے وقت بڑے بابو بھی کرسی چھوڑ دیں اور کیا مجال کہ چپراسی کے سر میں درد ہو اور اس کو دوا لانے زبردستی نہ بھیجدیں ___ کام کا تو یہ حال کہ توبہ بھلی ___ میز پر رکھے فائلوں کے پہاڑ کے پیچھے ان کا چہرہ اتنا ہی مطمئن ہوتا جیسے سارا کام نمٹ گیا ہو ___ کبھی کسی سے زور سے نہیں بولتیں ___ لیکن خود کام اس طرح کرتیں جیسے عبادت کر رہی ہوں ___ بالکل خاموش۔ فائلوں کی ایک ایک لائن پڑھتیں ___ اور دستخط کرتیں ___ آہستہ آہستہ دفتر کا ڈھرا ہی بن گیا کہ کام کے وقت سب اپنی اپنی کرسیوں پر جمے رہتے ___ کبھی کبھی وہ اپنے کمرے سے باہر، یوں ہی ٹہلنے نکل آتیں ___ بس اچٹتی بنظر ہر طرف ڈالتیں چاہے کوئی بیٹھا ہی ہو ___ ایک منٹ اس کے پاس ٹھہرتیں ___ اور ٹہلتی ہوئی آگے ___

حد تو یہ تھی کہ بڑے بابو کی بھی دال نہیں گل سکی ___ پچھلے صاحب تو صاحب تھے ہی لیکن ان کے راج میں بڑے بابو ان سے بڑے صاحب بن گئے تھے ___ صاحب کے آتے ہی اپنی آدھی یا تہائی پی ہوئی چائے کی پیالی چھوڑ ___

ان کے ساتھ ہی ان کے کمرے میں چلے جاتے ۔۔ ان کی ہر بات کا جواب ۔۔ ہاں جی ۔۔ جی صاحب ۔۔ اور ۔۔ یس سَر سے دیتے اور جب کمرے سے باہر آتے تو اپنی سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے، سب کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتے جیسے پروموشن کا پروانہ اندر سے جیب میں رکھ کر لائے ہوں ۔۔ سارے دفتر کے لوگ بڑے بابو کو دفتر کا اخبار کہتے تھے ۔۔ اور آج، بڑے بابو سے باری باری لوگ پوچھ رہے تھے ۔۔ کیوں بڑے بابو، آپ کو بھی نہیں معلوم تھا ۔۔ ڈائرکٹر صاحبہ کی آج شادی ہے ۔۔ اور بڑے بابو سچ مچ کھسیارہے تھے جیسے کوئی ڈیوٹی انھوں نے مس کر دی ہو ۔۔

اصل میں ہوا یہ کہ جب شاردا جی یہاں آئیں۔ تو پہلے دن بڑے بابو یس میڈم کرنے، ڈائرکٹر صاحبہ کے کمرے میں گئے، پر۔ پتہ نہیں وہاں سے کیا پی کر نکلے کہ بغیر کسی کی طرف دیکھے اپنی کرسی پر ایسے جمے جیسے یہ وہی کرسی ہو جس کے لئے برسوں سے یس سر اور ہاں جی کرتے آئے تھے ۔۔ اور بڑے بابو کا یہ حال دیکھ کر ہر ایک اپنے کیل کانٹے سے درست ہو گیا تھا۔

حالانکہ شاردا جی ہر ایک سے بہت نرمی اور محبت سے بات کرتیں۔ کسی سے اگر فائل میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو بڑی سادگی سے اسے سمجھاتیں ۔۔ وہ چپراسی ہو یا بڑے بابو۔ ہر ایک سے اپنوں جیسا برتاؤ کرتیں ۔۔ لیکن ان کی شخصیت میں کوئی ایسا جادو ضرور تھا کہ ان کے سامنے نظریں نیچی ہو جاتیں۔ چند ہی روز میں دفتر کا دفتر بدل گیا تھا۔

اچانک ایک دن دفتر میں آنے والے ہر بابو کو معلوم ہوتا گیا کہ نئی ڈائرکٹر صاحبہ پورے دس بجے آفس آگئی تھیں، تو سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ چپراسی نے بتایا ۔۔ کئی بار سب کے آنے کا وقت پوچھ چکی ہیں ۔۔ پھر جب بڑے بابو آئے اور ان کو بھی معلوم ہوا تو وہ سرپٹ اندر بھاگے ۔۔ اور جب باہر آئے تو چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے ۔۔ پھر ہر بابو کو الگ الگ بلا کر تعارف ہوا، اور کام کے متعلق باتیں بھی، اور واپسی پر سب اپنے کاموں میں لگ گئے تھے ۔۔

پھر دفتر والوں نے طے کیا کہ سب لوگ شاردا جی کو خوش آمدید کہنے

کے لئے پارٹی دیں گے ___ لیکن انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس کو ٹال دیا، اور دفتر میں ہی لنچ کے وقت ان کی طرف سے سب نے چائے پی اور وہ بھی سب کے ساتھ شامل رہیں۔

دھیرے دھیرے شاردا جی کی آہستہ روی، اخلاق اور کام سے لگن نے سارے دفتر میں ان کو ہر دل عزیز بنا دیا ___ وہ کبھی اپنے آپ کو آفس کے لوگوں سے الگ نہ سمجھتیں ___ اور کبھی غصّے یا تیزی سے بات نہ کرتیں ___ ان کا اتنا کہنا کافی ہوتا۔ "آپ خود سوچئے۔ اپنے دل سے پوچھئے کیا آپ نے یہ ٹھیک کیا تھا" اور لوگ واقعی جب اپنے دل سے پوچھتے تو شرمندہ ہو جاتے۔

اور پھر جب اچانک دفتر میں اطلاع ملی کہ شاردا جی کی شادی ہے تو لوگ چونک گئے۔ ان کی سکریٹری تک کو خبر نہیں ہوئی اور شادی کی تاریخ آگئی۔ ہاں دفتر کے لوگوں کے لئے دعوت نامہ ضرور تھا۔ جس پر انھوں نے خود لکھا تھا۔ "تحفہ مت لائیے گا" شاردا۔

شادی بڑی سادگی سے ہُوئی ___ دولھا، گوا میں پولیس افسر تھا ___ ماں باپ شادی کے لئے کہہ کہہ کر تھک گئے تھے۔ آخر اخبار میں اشتہار ان لوگوں نے شاردا جی کو بتائے بنا ہی دے دیا تھا ___ کئی فوٹو اور پیغام آئے۔ پھر مجبوراً شاردا جی کو کسی ایک کو پسند کرنا ہی پڑا۔

شادی سے پہلے شاردا اپنے ہونے والے شوہر سے کئی بار ملی تھیں ___ خط وکتابت کے بعد پتہ نہیں وکرم صاحب کو کیسے یہ اعتماد ہو گیا تھا کہ شادی ضرور ہو جائیگی۔ کیوں کہ وہ ملنے اور دیکھنے آئے تھے لیکن پورے دو مہینے کی چھٹی لے کر ___ اُونچے قد ___ کھلی رنگت ___ اور کھلے دل والے وکرم کو سچ مچ سب نے پسند کر لیا تھا ___ ہمیشہ شادی نہ کرنے کی بحث کرنے والی شاردا بھی خاموشی سے راضی ہو گئیں ___ وہ روزانہ اخباروں میں لڑکیوں کے بارے میں پڑھتی۔ ان کی بے عزتی، ان کا جل جل کر مرنا۔ سماج میں عورت کی جگہ اور پھر بڑے بڑے سماج سدھار بھاشن دینے والوں کے خود اپنے کیریکٹر ___ اسے شادی سے نفرت ہو گئی تھی، اور وہ ہمیشہ بحث کر کے ٹال دیتی ___ متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والی شاردا ___ نے

بڑی محنت سے وہ مُقام حاصل کیا تھا، جہاں آج وہ تھی ــــــ وہ خود اپنے گھر والوں سے بہت پیار کرتی تھی اور اس کے چھوٹے بھائی بہن، ماں باپ سب اس پر جان دیتے تھے ــــــ وہ کہتی تھی تم سب سے زیادہ چاہنے والا اور کون ہو سکتا ہے جو تم لوگ شادی کے لئے مجبور کرتے ہو اور ماں سماج کی دُہائی دیتی ــــــ اس کی سہیلیوں کا بھی حلقہ کافی بڑا تھا جس میں وہ اپنی خوش مزاجی اور انکساری کے سبب بہت چاہی جاتی تھی ــــــ جس آفس میں جاتی اس کے آفس والے اس کے گرویدہ ہو جاتے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ آنکھ ملا کر بات کر سکے۔ بڑے سے بڑا خوشامدی اُس کے سامنے گھگھیانے لگتا۔

وکرم بھی جب پہلی بار شاردا سے ملا تو گھبرا گیا ــــــ اس نے سوچا تھا۔ اتنی بڑی پوسٹ پر ہیں تو ہوں گی بڑی ٹپ ٹاپ ــــــ اڑتی ہوئی گھمنڈی سی ــــــ لیکن یہاں تو بالکل اُلٹا ہوا ــــــ سیدھی سادی، پروقار سی لڑکی ــــــ ہنڈلوم کی خوب صُورت ساری اور لمبے بالوں کا سادہ سا جوڑا ــــــ چشمہ سے جھانکتی چمکدار آنکھیں ــــــ اور لمبا قد، اس کے کردار کی نمایاں نشانیاں تھیں۔

وکرم گہری گہری آنکھوں والا، کھلتے رنگ اور دراز قد، لچھے دار باتیں ــــــ جس جگہ ٹھہرے محفل جم جائے ــــــ اس نے شاردا کو پسند کر کے اپنے والدین کو تار بھی دے دیا ــــــ وہ گوا میں تھا، اس کے والدین بمبئی میں ــــــ اس نے ان لوگوں کا پتہ بھی دے دیا ــــــ جگن اینڈ سنس ــــــ اور شاردا کے والد نے اپنے کسی دوست کو خط بھیج کر معلوم کرا لیا ــــــ جگن اینڈ سنس کا بیٹا گوا میں پولیس افسر تھا ــــــ شاردا کے گھر والے سچ مچ بہت خوش تھے ــــــ چلو دیر میں سہی ــــــ ور تو اچھا ملا ــــــ

اور پھر شادی کا دن آ گیا ــــــ وکرم کے گھر والے ابھی تک نہیں پہنچے تھے ــــــ وکرم بے حد پریشان تھا ــــــ بار بار گھڑی دیکھتا ــــــ بے چینی سے پہلو بدلتا ــــــ اور پھر خوفزدہ ہو کر کہتا ــــــ "کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو ــــــ خدا خیر کرے ــــــ" وکرم نے فون کر کے معلوم کر لیا تھا ــــــ وہ لوگ چلنے والے تھے ــــــ پھیروں کا وقت آ گیا ــــــ اور پنڈت نے وقت گزرنے سے پہلے پھیرے کرانے

پرزور دیا ــــ سب کی رائے سے پھیرے ہوئے اور شادی ہو گئی۔

شاردا رخصت ہو کر ہوٹل چلی گئی ــــ شاردا نے بھی دو مہینے کی چھٹی لے لی تھی ــــ شادی کے بعد اسے بمبئی اور گوا دونوں جگہ جانا تھا ــــ شاردا خوش تھی ــــ وکرم اپنی باتوں سے اسے اتنا ہنساتا کہ اس کی آنکھوں میں پانی آجاتا۔ وہ مزاج کا بہت سادا لگتا تھا ــــ شاردا جو بھی کہتی وہ ہاں کر لیتا ــــ اس نے اپنے گھر فون کر دیا تھا، شادی ہو چکی ہے، آپ وہیں دعوت کی تیاری کریں ــــ پھر وکرم نے کشمیر دیکھنے کی خواہش کی اور دونوں کچھ دنوں کے لئے کشمیر جانے کو تیار ہو گئے ــــ کشمیر سے ہی گوا جانا تھا ــــ شاردا نے سوچا ــــ اب وہ دہلی تنہا واپس آئے گی۔ ٹرانسفر وغیرہ کی کوشش کرنے کے لئے ــــ اس نے اپنے بیمے کے کاغذات اور بنک کے کاغذات سب وکرم کو دکھائے ــــ ان کا کیا کرنا ہوگا ــــ اور وکرم نے بے دلی سے سب دیکھ کر شاردا کو دے دیا ــــ "امیر ہو بھائی ــــ ایک لاکھ کا بیمہ ــــ مجھے تو ہمیشہ ڈرنا پڑے گا ــــ اپنا حساب کتاب خود ہی رکھو۔ مجھ سے کوئی مطلب نہیں ــــ میں تو نوکر ہوں ــــ"

پھر دونوں کشمیر چلے گئے، پندرہ دن کے لئے ــــ کشمیر پہنچ کر شاردا نے گھر خط لکھا ــــ وہ دونوں بہت خوش اور خیریت سے ہیں ــــ اور پھر ــــ پھر ــــ اچانک تار ملا ــــ سب کچھ مٹ گیا ــــ سارا کھیل ختم ہو گیا ــــ ماں چیخ پڑی ــــ "نہیں ــــ یہ نہیں ہو سکتا ــــ شاردا کو کچھ نہیں ہوگا ــــ"

ماں اَدھ موئی ہو چکی تھی ــــ باپ سکتے کے عالم میں تھا اور چھوٹے بھائی بہن بوکھلا گئے تھے ــــ

شاردا جنگل میں مری ملی تھی ــــ وہ کافی اونچی چٹان سے نیچے گر گئی تھی۔ صبح وکرم چائے پینے کے بعد کافی دیر تک انتظار کرتا رہا ــــ جب وہ نہیں آئی تو اس نے پولیس کو خبر کی ــــ اور پولیس نے دو گھنٹے کے اندر جنگل سے شاردا کی لاش برآمد کر لی ــــ

ــــ جب شاردا کے والدین ہوٹل پہنچے ــــ تو وکرم سر تھامے بیٹھا تھا ــــ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ــــ بس پتاجی اتنا ہی سمبندھ بھگوان نے لکھا تھا ــــ ماں پتھر کی مورت بن گئی تھی ــــ لاش اسپتال جا چکی تھی ــــ وکرم نے بتایا کہ وہ صبح چلا

جائے گا ـــــ اس نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی خرید والیا تھا ـــــ لیکن پولیس انسپکٹر جو ہوٹل میں موجود تھا، اس نے کہا ـــــ "مسٹر وکرم ـــــ آپ بغیر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دیکھے ہوٹل نہیں چھوڑ سکتے۔"

"ٹھیک ہے!" ـــــ کہتے ہوئے وکرم جھنجھلا سا گیا ـــــ "کیا اسے میں نے مار ڈالا ـــــ وہ میری پتنی تھی ـــــ ہم دونوں رات میں ساتھ ہی گھومتے رہے کافی رات گئے ہوٹل آئے ـــــ پر صبح تڑکے نہ جانے کیوں وہ چلی گئی ـــــ میں تو سو رہا تھا ـــــ پھر چائے پی کر انتظار کرتا رہا ـــــ دس بج گئے تو میں نے پولیس میں رپورٹ کی ـــــ"

اور ـــــ اور ـــــ وہ ہکلا گیا ـــــ سامنے انسپکٹر پوسٹ مارٹم رپورٹ لئے کھڑا تھا "مسٹر وکرم ـــــ شاردا کو گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا ہے ـــــ بعد میں لاش نیچے گرائی گئی ہے۔"

پولیس کے خوف سے کانپتا ہوا بیرا سامنے کھڑا کہہ رہا تھا ـــــ "صاحب آپ نے چائے تو باہر سے آکر مانگی تھی ـــــ"

فروری ۱۹۸۷ء

سائے اور روشنی

سُورج اپنے خون آلود چہرے کو چھپائے ہُوئے جب دُنیا رُخصت ہونے لگا تو اس نے پلٹ کر پھر انسان کی دُنیا میں جھانکا۔

دور سنگم کی دھندلاہٹ میں دو افسردہ بہنیں گلے مل رہی تھیں، دونوں کے سر خم اور بال بکھرے ہُوئے تھے۔ کمر سے نیچے لٹکتے ہُوئے بالوں سے قطرے ٹپک رہے تھے اور چاند جیسی شفاف پیشانیوں پر سُرخ افشاں جھلملا رہی تھی ـــ بڑی بہن نے پیار سے چھوٹی بہن کو گلے سے ذرا الگ کیا اور کہا۔

کیوں، اتنی چپ کیوں ہے ری؟ تُو تو بے حد اداس ہے!۔ چھوٹی بہن بڑی بہن کے زور سے لپٹ گئی۔

"وہ..... وہ..... سوریہ دیو..... خُون..... خُون.....!" اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے، آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

بڑی بہن کی شیتل کنول جیسی آنکھیں دُور بہت دُور سُورج کی سُرخی سے ہم آغوش ہو گئیں اور وہ بھی گھبرا گئی۔

"گنگی ـــ اب کیا ہو گا ـــ؟"

اور گنگی کے پتھریلے ہونٹ اور سخت ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ

کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ افسردگی سے بولی۔

"کل ___ کل پورنماشی کا نہان ہے نا جمنی ___ اور یہ سُوریہ دیو ___" وہ پھر کانپ گئی۔ "اس کی لالی دیکھ رہی ہے۔ یہ آنے والے کل کی تصویر ہے ___ کل کی ___ جب انسان ہولی کھیلے گا ___ سُرخ ہولی۔ اور میری گود میں آتمک شدھی کے لئے منہ چھپائے گا۔ میرے ہی سینے پر کھڑا ہو کر چندرما کو جَل ارپت کرے گا۔ جمنی میں کیا بتاؤں میں نے آج شام کو کیا سُنا ہے، کیا دیکھا ہے، مجھے سب معلوم ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے؟"

گنگی کی باتیں سُن سُن کر جمنی کا چہرہ فق ہوا جا رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"میں نے بھی شام کو بہت کچھ سنا ہے جمنی"۔ اور پھر اس نے برف جیسے ہاتھوں سے گنگی کے تھرتھراتے بازوؤں کو زور سے دبا لیا۔ فضا میں اندھیرا چھا گیا۔ سُورج دنیا کو منھ چڑھا کر اپنی راہ ہو لیا۔ اور ستارے جھلملا اُٹھے لیکن دنیا کی بے پناہ اداسی دیکھ کر وہ بھی سکتے میں رہ گئے ___ دونوں بہنوں نے کانپتے ہوئے تاروں کو دیکھا۔ ٹھنڈی سانس بھری اور پھر دُور مشرق کی سمت سے اُبھرتی ہوئی روشنی میں جھانکنے لگیں۔ چھوٹی بہن نے بڑی بہن کے کان میں چپکے سے کہا۔

جانتی ہے جمنی میں نے کیا سُنا ہے ___؟ دُور سونے والے مندر کے میدان میں آج کوئی میٹنگ تھی، بڑے بڑے سادھو سنت اور لیڈر آئے تھے، گھنٹے اور شنکھ بھی بجے تھے، اور لوگ کہتے رہے یہ مُسلمان یہاں کیوں ہیں؟ اپنے پاکستان کیوں نہیں جاتے؟ اگر سیدھی طرح جائیں تو جائیں ورنہ مار مار کر بھگا دو انھیں۔ تم چالیس کروڑ ہو اور یہ محض سات کروڑ۔ بس ایکتا کی ضرورت ہے، ایکتا کی۔ انھوں نے ہمیشہ بدمعاشی کی ہے ___ جب بادشاہ بنے تو ہماری عورتوں سے شادیاں کیں، ہم کو غلام بنایا، ہمارے مندر لوٹے، مسجدیں بنائیں ___ اور اب جب ہمارا راج ہے تو کہتے ہیں ہم سب بھائی بھائی ہیں، ہندو مسلم بھائی بھائی۔

ہر ہر مہا دیو کا نعرہ بلند ہُوا، گھنٹے اور سنکھ ذرا تیز ہو گئے اور ایک بھدی سی آواز ان سب پر حاوی ہو گئی۔ بھائیو! جس طرح انھوں نے ہماری عورتوں سے شادیاں

کی تھیں ہم بھی ان کی لڑکیاں زبردستی چھین لیں گے۔ جلسہ میں تالیاں گونج اٹھیں۔ ایک بے صبر آواز فوراً ہی سُنائی دی "مگر کیسے ۔؟"

سفید، لمبا چوڑا کرتا پہنے ہُوئے دھواں دھار تقریر کرنے والے نے کہا! " یہ ہمارے گنپت جی بتائیں گے، دیوی نے ان کو درشن دیئے ہیں اور تم لوگوں کے لئے پیغام بھی۔" اور پھر لاؤڈ اسپیکر پر تجسیم سوامی گنپت جی کھڑے تھے۔ سوامی جی کی جے کے نعروں سے ایک بار آسمان بھی ہل گیا ___ اور جانتی ہو جمنی ___ میں اپنا راستہ بھول گئی۔ چادر کی لہرائی ہُوئی چمک ٹھٹھک گئی، جب میں نے سُنا ہے سوامی جی کہہ رہے تھے " دیوی کا اُپدیش ہے کہ اپنی آتما کے نروان کے لئے کل پورن ماشی کے اوسر پر ہولی کھیلو۔ سُرخ ہولی۔" اور سوامی جی کے ہونٹوں کے گوشوں میں شرارت ناچ گئی، میں نے دیکھا تھا جمنی، اور لوگ بھی سمجھ گئے تھے، اور پھر جلسہ ختم ہو گیا۔ اس کی آواز دھیمی ہوتی چلی گئی۔ اور جب یہ قصّہ ختم کرتے ہُوئے گنگی نے دُور خلا میں سے اپنی آنکھیں جمنی کی طرف پھیریں تو نازک اندام جمنی تقریباً بے ہوش ہو چکی تھی۔

گنگی نے جُھک کر سنگم سے ایک چلّو بھر پانی لیا اور جمنی کے منھ پر چھڑک دیا، دھیرے دھیرے جمنی کی آنکھیں کھلنے لگیں، آسمان پر چاند جھانک رہا تھا، لیکن جیسے جیسے وہ اس دُنیا کے قریب آتا جاتا، اس کی روشنی اُداس ہوتی جاتی ___ دُنیا سے اٹھتے ہُوئے بخارات آسمانی مخلوق کو سہمائے دے رہے تھے۔ وہ منتظر تھے کہ نجانے کیا ہونے والا ہے ___؟ دھرتی والے چاند پر آئیں گے یا چاند ہی ٹکڑے ہو کر دھرتی پر گر جائے گا یا یہ سب ختم ہو جائے ___؟

گنگی، جمنی کو سنبھال رہی تھی۔ جمنی کو ہوش آ چکا تھا ___ وہ کراہی۔

گنگی ___ میری گنگی ___ میں نے بھی کچھ ایسا ہی سُنا ہے ___ مسجد والا بڑا میدان ہے نا وہیں کچھ لوگ جمع تھے۔ ان کے پاس لاؤڈ اسپیکر تو نہیں تھے لیکن ان کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ ان کو کل کی ہولی کے بارے میں معلوم تھا مولانا شبراتی کہہ رہے تھے۔

"خدا کے نام پر شاکر رہو ___ کیا خدا ہمارا ساتھ نہ دے گا، اس نے تو تب ہمارا ساتھ دیا تھا جب ہم صرف چند سو آئے تھے اور اتنے بڑے مُلک ___ پر

بھاگ گئے تھے، وہ بڑا مسبب الاسباب ہے، وہ تو چوک گیا ہمارا غازی ورنہ مار مار کر سب کا بھرتا کر دیتا تب پوچھتا کہ کہو کہاں گئی گھنٹی ___ خیر! اللہ کا نام لے کر آج رات میں یکجا ہو کر وظیفہ پڑھو، کل سب روزہ رکھیں گے۔ اور مُسلمان بھائیو! ڈرنا نہیں۔ اگر رنگ کی ایک چھینٹ بھی پڑ جائے تو ہمارے لئے مرنا ہی بہتر ہے۔ اسلام کی حرمت رکھنا مرنے سے کیا ڈرنا" اور .... اور گنگی میں کیا بتاؤں کہ انھوں نے کیا کہا۔

"کہتے تھے کہ اگر یہ کافر ہم سب کو مار بھی دیں گے تو کیا دُنیا سے اسلام مٹ جائے گا۔ جب ہم سب شہید ہو جائیں گے تب اسلامی فوجیں آجائیں گی۔ ساری دُنیا میں اسلامی حکومت ہو جائے گی اور تب قیامت آجائے گی"۔ اتنا کہہ کر جمنی نے زبان سے اپنے ہونٹ تر کئے اور پھر آہستہ سے بولی۔

"اس مجمع میں ایک طرف میں نے کھسر پھسر سُنی اور سیٹھ دھنی رام کا نام بھی"۔

چاند تاروں نے دونوں کہانیاں دم سادھ کر سُنیں اور دونوں بہنیں ایک دوسرے کو سہارا دیئے ساری رات آنسو بہاتی رہیں۔

تارے غائب ہو گئے اور چاند نے بے جان ہو کر دم توڑ دیا، زندگی کی شاداب سُرخی لئے سُورج نمودار ہوا، اور دُنیا کا رنگ دیکھتے ہی سفید پڑ گیا۔ مگر زمین کے ذرّے سُرخ ہو گئے۔ ماں کی چھاتی پر بیٹے بیچ بیچ الجھ پڑے، کچھ بدلہ لے رہے تھے، کچھ بچاؤ کر رہے تھے۔ مسجدوں کے مینارے لڑھکائے گئے۔ مندروں کے کلس سرنگوں کر دیئے گئے اینٹوں کے ڈھیر لگ گئے اور انسان مر گیا۔ درندہ زندہ ہو گیا۔ ٹیاں پچھوڑی گئیں، لڑکیاں گھسیٹی گئیں، بوڑھوں کو ٹھوکریں لگائی گئیں، بچے پُرانے کپڑوں کی طرح چیر کر چیتھڑے کر دیئے گئے۔ اور سُورج گھبرا گیا۔ اس کی گرمی زائل ہو گئی، اس کا رنگ فق ہو گیا، اور وہ مغرب کی بالکنی سے چھلانگ لگا گیا۔

دُور سنگم سے ذرا اُوپر دو پرچھائیاں اُبھریں، ننگے سر، اُجڑے بال، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہُوئی، آنکھیں پتھرائی ہوئیں، دونوں ایک دُوسرے کو تھامے ہُوئے تھیں۔

"جمنی ___! اب ہم کو یہاں سے جانا پڑے گا، ہماری رُوحیں اس پاپی دُنیا میں نہیں رہ سکیں گی ___" گنگی کی بات جمنی نے سُنی اور پھر کچھ سوچتے ہُوئے آہستہ سے بولی ___

"گنگی! تجھے تو یہیں رہنا چاہیئے، تیری رُوح اور تیرے جسم کو تو بھارت واسی دیوی مانتے ہیں، ماتا کہتے ہیں۔ تُو تو ماں ہے ___ گنگی تو اپنے بچّوں کو چھوڑ کر نہ جا۔ میں جاتی ہُوں۔ میں کمزور دل ہُوں، ہزاروں سال سے اپنے دامن میں بسی ہزاروں یادگاروں کو ٹوٹتا ہُوا میں نہیں دیکھ سکوں گی کہیں مسلمانوں کی بنوائی یادگاریں ڈھائی گئیں تو میں شاہجہاں کو کیا منھ دکھاؤں گی، میں اکبر سے کیسے آنکھیں چار کر سکوں گی، اور جب ممتاز تاج کے کھنڈروں سے اُبھرے گی تو سب سے پہلے اس کی بے سروسامانی دیکھنے والی میں ہوں گی، میں یہ کیسے دیکھوں گی ___ نہیں نہیں گنگی ___ میں جاتی ہُوں ___ یہاں سے مسلمانوں کا نشان مٹایا جائے گا، اس کا مطلب ہے قلعہ ڈھایا جائے گا، خوبصورت باغوں میں آگ لگ جائے گی۔" وہ کراہی۔ کیا مسلمان اس سے مٹ جائے گا گنگی ___؟"

"نہیں جمنی! مسلمان کیسے مٹے گا، وہ بھی اسی دھرتی کا لعل ہے، وہ باہر کا کہاں ہے، اس نے میری رگوں سے تمھاری رگوں سے، اس دھرتی کی رگوں سے خون، گوشت اور زندگی پائی ہے۔"

یہ سب تو انسان کے سوچنے کی باتیں تھیں گنگی ___ لیکن انسان مر گیا ___ انسان مر گیا۔ اس لئے ہم دونوں کی روحیں یہاں نہیں رہ سکیں گی۔"

بڑی بہن نے چھوٹی بہن کا ہاتھ پکڑا اور اوپر اُٹھنے لگی۔

"ٹھہر جمنی! جاتے ہُوئے اس شہر کا چکر تو لگا لوں، انسان تو مر چکا ہے ___ مگر چلتے پھرتے خونخوار درندوں کو ایک نظر دیکھ تو لوں۔"

اور پھر دونوں بہنیں اندھیرے میں آگے بڑھیں، دونوں ٹٹول ٹٹول کر ایک دوسرے کو سنبھالے چل رہی تھیں

"رک جا گنگی۔" جمنی نے جھک کر دیکھا۔

ایک نوجوان لڑکی ننگ دھڑنگ پڑی تھی، اس کا مچھلی جیسا سڈول دہکتا بدن اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ اس کے بھرے بھرے جسم پر سے جگہ جگہ درندوں نے گوشت نوچ لیا تھا، وہ سیدھی چت پڑی تھی، گنگی بھی دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

"لڑکی ہے؟"

"ہاں لڑکی ہے، ٹھنڈی لڑکی۔" گنگی نے جھک کر غور سے دیکھا۔

"یہ تو سیتا ہے!"

"نہیں، سکینہ ہے!"

دونوں بہنیں پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن سیتا اور سکینہ میں کوئی فرق نہیں تھا بس وہ لڑکی تھی محض لڑکی۔ ایک قوم کی ناموس، عزت، جو برہنہ تھی، جس کا تنا ہوا نوجوان جسم بتا رہا تھا کہ وہ آج سے پہلے مریم تھی، معصوم تھی۔ اس کے جسم کو درندوں نے نوچا تھا، جھنجھوڑا تھا، اور اب کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ سیتا ہے کہ سکینہ ـــ؟ گنگی اور جمنی کی آنکھوں سے دریا اُبل پڑے، اور وہ آگے بڑھ گئیں۔

آگے اینٹوں کے ڈھیر تھے، دونوں لڑکھڑا گئیں۔

"یہ کیا ہے؟"

"مندر تھا ـــ شاید!"

"نہیں! مسجد تھی!"

دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک اینٹ تھی محض پتھر، جو مسجد کا بھی ہو سکتا تھا، اور مندر کا بھی۔ اور جس کا ملبہ یہاں ڈھیر تھا کلس اور مینارے ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے، دونوں نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پتھروں پر ایک نظر ڈالی اور پھر ملبے میں پھینک دیا ـــ شاید اس ملبے سے کوئی مسجد بن جائے، کوئی مندر بن جائے۔ یا پھر مندر کے ملبے سے مسجد اور مسجد کے ملبے سے مندر اُبھر آئے۔

ان کے قدم آگے بڑھ گئے۔ آگے بڑھتے ہی گنگی چیخ پڑی۔

"خون ـــ!"

سُرخ سُرخ خون ـــ دونوں طرف نالیوں میں بہتا ہوا ملبے کے ایک گڑھے میں جمع ہو رہا تھا ـــ سُرخ خون ـــ کچھ جما ہوا ـــ اور کچھ بہتا ہوا ـــ مگر کس کا ہے؟ جمنی کی سوالیہ نگاہیں گنگی کی طرف اُٹھیں۔

"انسان کا ـــ صرف انسان کا ـــ!"

دونوں نالیوں میں بہتا ہوا، ایک رنگ کا خون، ایک ہی گڑھے میں یکجا ہو رہا تھا۔ صرف خون ـــ گہرا سُرخ اور بہتا ہوا، انسان کا خون۔

یہ خونیں منظر دیکھ کر دونوں بہنیں کچھ دیر سکتے میں کھڑی رہیں ـــ پھر

جلدی جلدی آگے بڑھ گئیں — آگے دس بارہ قدم ہی چلی تھیں کہ گنگی ایک سوکھی سی شاخ سے الجھ کر جمنی پر گر پڑی۔ جمنی نے اسے سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا —؟"

اور جب انھوں نے سوکھی ہوئی اس شاخ کو غور سے دیکھا تو جھرّیوں سے بھرا ہوا ہڈی اور چمڑے کا اینٹھا ہوا ایک ہاتھ تھا، جس کو کسی درندے نے توڑ دیا تھا، اور جو شانے سے اکھڑا ہونے کی وجہ سے جسم سے ذرا الگ پڑا تھا،

جمنی نے وہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بیٹھ گئی۔ اس کے آنسو بہہ نکلے — یہ ایک بوڑھی عورت کی لاش تھی، جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، سوکھے ہوئے جھرّیوں سے بھرے سینے پر چھری کا بڑا سا شگاف تھا، اور خون میں اتھڑی ہوئی لاش اندھیرے کے باوجود مسکراتی نظر آرہی تھی — دھنسی ہوئی آنکھیں اور بنا دانتوں کے کسا ہوا جبڑا، اپنے بیٹوں کی بہادری پر جیسے مسکرا رہا تھا۔

جمنی چیخ پڑی — "ماں!" اور اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے — گنگی اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"شنکر کی ماں ہے؟"

"نہیں! رحیم کی!"

"نہیں — نہیں — وہ صرف ماں ہے ماں — اس کے بیٹوں نے اس کے کپڑے پھاڑ دیئے ہیں — جس چھاتی سے انھوں نے خون چوس کر زندگی پائی تھی، وہیں انھوں نے چھرا گھونپ دیا ہے — یہ ماں ہے — مقدس ماں — جس نے ایک کیڑے کو جنم دے کر اس قابل کر دیا کہ وہ اس کی چھاتی کو روند سکے، اس کی بوٹیوں کو کتوں سے نچوا سکے۔

اپنی ماں کی یہ درگت — کوئی پہچان کر بتائے کہ یہ شنکر کی ماں ہے یا رحیم کی۔ وہ تو بس ماں ہے، ماں! — جس نے سپوت جنم دیئے — جس نے انسان پیدا کئے، اور جو حیوان بن گئے۔

"آؤ گنگی آؤ، اپنی روحوں کو اس گندگی سے آلودہ نہ کریں — آؤ چلیں۔"

اور چلتے چلتے انھوں نے دیکھا۔ ایک بچّے کے دو حصّے الگ الگ لڑھک رہے ہیں —

اس معصوم بچے کی کیا خطا تھی ــ؟ اس نے کس کا مندر ڈھایا تھا ــ؟ کس کی مسجد توڑی تھی ــ؟ وہ کلکاریاں بھرتا ہوا ماں کی چھاتی سے دودھ پی رہا تھا ــ اور پھر ــ وہ پرانے کپڑے کی طرح پھاڑ دیا گیا۔ پھاڑنے والا کون تھا ــ؟ وہی انسان ــ؟

نہیں انسان ایسا نہیں کر سکتا! ــ انسان ایسا نہیں ہو سکتا! ــ انسان تو مر گیا ہے اور حیوان جیوت ہو اُٹھا ہے ــــ دونوں روحیں آنسو پونچھتی ہوئی اوپر اُٹھ رہی تھیں اور دونوں کے بے جان جسم سنگم پر سر جوڑے پڑے تھے۔

اچانک جمنی نے گنگی کو مخاطب کیا۔

"گنگی ٹھہر ــ وہ دیکھ ــ دیکھ سائے اُبھر رہے ہیں ــ ایک دوسرے کو پناہ میں لئے ہوئے ــــ شاید دھند کچھ ہلکی ہو رہی ہے۔ انسانیت کروٹ بدل رہی ہے۔ سیتا اور سکینہ کی آبرو پر، ماں کی سڑی ہوئی لاش پر، شنکر اور رحیم دونوں آنسو بہا رہے ہیں ــ یا پھر انسان رو رہا ہے۔

دونوں روحیں سوچ رہی تھیں کیا انسان مرا نہیں تھا۔ سو گیا تھا ــ صرف سو گیا تھا ــ اور اب وہ جاگ اُٹھا ہے ــ انسانیت جاگ اٹھی ہے ــ شاید پیار جاگ اُٹھا ہے۔

ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا ــ جیسے پوچھ رہی ہوں۔ نیچے چلوں یا اُوپر۔ اور دوسری مسکرا دی۔ چاروں طرف مقدس نور بکھر گیا۔ اور مشرق کی سمت سے روشنی اُبھر آئی، جس نے سارے ماحول کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

۱۹۶۲ء

گُلشن بُوا

گھر کے احاطہ میں یُوں تو بہت سے شاگرد پیشہ آباد تھے ـــــ قطار میں بنی کوٹھریاں اور ان کے سامنے ٹاٹ کے پردے پڑے برآمدے ـــــ اور پھر دو ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں ـــــ اِدھر اُدھر لڑھکتے ہوئے مونڈھے۔ آنگن نہ ہوتے ہوئے بھی آنگن کا تصوّر ضرور قائم کر دیتے تھے ـــــ

گلشن بوا کا کوٹھری نما کوارٹر مغرب کی طرف دو کوارٹر چھوڑ کر تیسرا تھا ـــــ اور اس کے بعد اسی لائن میں چار کوارٹر اور تھے ـــــ جن میں دُوسرے لوگ آباد تھے ـــــ

مجھے یاد نہیں کہ گلشن بوا کب سے اس میں رہ رہی تھیں ـــــ سُنا ہے کہ دادی امّاں نے ان کی جوانی پر رحم کھا کر انھیں پناہ دی تھی ـــــ انکے میاں عین جوانی میں انھیں تنہا چھوڑ کر کسی نیچ ذات کی لڑکی کو لے کر بھاگ گئے تھے ـــــ اور گلشن بوا جو پتہ نہیں کس گاؤں سے اپنے دولھا کے ساتھ شہر میں آ بسی تھیں بالکل تنہا رہ گئی تھیں ـــــ

گھر کی آبادی کے ساتھ ساتھ ان کی عمر بھی بڑھتی گئی ـــــ اور شاید میری یاد سے بہت پہلے گلشن بوا اس کوارٹر میں منتقل ہو گئی تھیں ـــــ اور پھر دھیرے دھیرے انکی حکومت دوسرے کوارٹروں تک پھیلنے لگی ـــــ کوارٹر میں آ جانے کے بعد گلشن بوا نے کچھ اس طرح اپنی زندگی کی بساط بچھائی کہ سارے مہرے

ان کے ارد گرد بغیر کسی چال کے جمع ہونے لگے تھے ___ اکثر امی کے اصرار پر بھی بوا گھر میں رہنے پر تیار نہ ہوتیں ___ جیسے ان کی محل سرائیں ___ ان کے بغیر چراغ نہ جلیں گے ___ یا کچھ بہت اہم ہو جائے گا ___

دیکھنے میں نہ زیادہ تنحیم شحیم ___ نہ گھن گرج والی آواز ہی ___ لیکن ان کی شخصیت میں کوئی مقناطیسی اثر ضرور تھا ___ کہ ہر چھوٹا بڑا ان کی عزت ان جانے ہی کرنے پر مجبور ہو جاتا ___ ان کے نرم نرم ہونٹوں سے ٹپکا ہوا ہر جملہ لوگ سر آنکھوں پر اٹھا لیتے ___ کوارٹروں کی لائن تو لائن ان کی شہرت سارے محلے میں بلکہ دوسرے محلے تک پھیل چکی تھی ___ اوسط قد چھریرا بدن ___ سانولی رنگت ___ آنکھیں کچھ ابھری ہوئی ___ بڑی بڑی سی ___ ناک لمبی ___ ٹھوڑی کی طرف ذرا جھکی ہوئی ___ جو کبھی ستواں ضرور کہلائی ہوگی گول گول نرم گال جن پر زندگی کے ہر سرد و گرم نے اپنے اپنے نقش چھاپ دیئے تھے ___ ہونٹ باریک ___ اکا دکا دانت ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ایک دوسرے سے ہم آغوش رہتے ___ اور منھ کے اندر پگھلا ہوا پان غلغلایا کرتا۔ ہاتھوں میں موٹی موٹی چاندی کی چار چار چوڑیاں ___ کانوں میں تلکڑی کی بجلیاں ___ گلے میں بڑے بڑے نو چاند ___ ایک لمبی سی چاندی کی زنجیر ___ جس میں کبھی کبھار کام آنے والی چھوٹی سی تلوار جیسی دنت کھدنی، لٹکتی رہتی ___ ہو سکتا ہے ان کے پاس کچھ اور دھراؤ گہنے ہوں ___ لیکن میں نے اس سے زیادہ کبھی ان کو کچھ پہنے نہیں دیکھا ___ وہ چاہے باجی کی شادی ہو ___ چاہے بھائی جان کی بارات ___ کپڑوں میں ان کا سلیقہ مجھے کبھی نہیں بھایا ___ عجیب ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہوتے ان کے ___ پائجامہ ٹخنوں تک تو گھٹنا معلوم ہوتا ___ لیکن گھٹنوں پر پہنچتے پہنچتے ڈھیلی ڈھالی شلوار بن جاتا ___ اوپر سے بالکل مولوی صاحب جیسا چوڑی چوڑی کلیوں والا کرتا لٹکتا رہتا ___ اور ان سب پر چاندنی میں دھلا سفید دوپٹہ سر پر منڈھا رہتا ___ جس کے نیچے سے ان کے کچے پکے بال جھانکتے رہتے۔

ان کا کوئی رشتہ دار تھا یا نہیں یہ تو میں نہیں جانتی ___ ہاں

ہر استاد خوب جانتی ہوں کہ سارا شاگرد پیشہ ان پر جان چھڑکتا تھا ــــ

صبح تڑکے نماز سے فارغ ہوتے ہی سبحان اللہ، سبحان اللہ کا وظیفہ ہلکے سُروں میں گنگناتی ہمارے گھر آجاتیں ــــ اور ان کی کلکتیا جوتی کی سپٹر سپٹر کی آواز کبھی دُور اور کبھی نزدیک میرے کانوں سے ٹکرانے لگتی ــــ بس مجھے معلوم ہو جاتا کہ اب میں زیادہ دیر بستر میں نہیں رہ سکتی ــــ اور پھر سبحان اللہ سبحان اللہ کی ترنم آمیز گنگناہٹ میرے بہت قریب آجاتی ــــ میں آنکھیں کھول دیتی ــــ بُوا مجھے جگاتی کبھی نہیں ــــ لیکن بے مقصد وہ کمرے کا سامان اِدھر اُدھر رکھنا شروع کر دیتیں اور ان کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا جب تک میں بستر نہ چھوڑ دوں ــــ اور پھر سب سے بڑی مشکل یہ کہ میں نماز بھی پڑھوں جس کو مولوی صاحب نے تو کم لیکن گلشن بوا نے بڑی مشکل سے زبانی رٹوایا تھا ـ

میں اِدھر جائے نماز پر کھڑی ہوئی اور بوا باورچی خانے پہنچ جاتیں ـ وہ ہمیشہ میرا ناشتہ میرے کمرے میں ہی کراتی تھیں ــــ اور پھر جلدی جلدی کپڑے بدل ــــ بال سنوار ــــ مجھے سات بجے سے پہلے ہی اسکول کے لئے تیار کر دیتیں ــــ

ان کی ایک ادا مجھے کبھی نہیں بھائی ــــ اور وہ ان کا کس کس کر میری چوٹیاں باندھنا ــــ لاکھ چلاّتی ــــ بوا بال نچے ــــ ہائے بوا بال نچے ــــ لیکن بوا ــــ بڑے اطمینان سے جواب دیتیں ــــ چھوٹی بی بی دیکھنا آپ کے بال کتنی جلدی کمر تک پہنچ جائیں گے ــــ اور میں کس کر آنکھیں میچ لیتی ــــ بالوں کے بڑھنے کا شوق اور درد مل جل کر عجیب سی بے بسی اور جھنجھلاہٹ کا احساس پیدا کرتے ــــ لیکن مجبوری تھی ــــ وہ مجھے پیار بھی تو بے پناہ کرتی تھی ــــ بالکل دادی اماں کی طرح

مجھ سے فارغ ہوتے ہی باورچی خانے اور کھانے کی میز کے بار بار چکر لگاتیں اور ٹھیک آٹھ بجے یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاتیں ــــ اور اب ان کا ایک سیکنڈ بھی ہمارے گھر ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ــــ

وہ گھبرائی ہوئی جلدی جلدی اپنے گھر پہنچتیں ــــ چیں چیں روتے ہوئے ــــ ناک بسورتے ہوئے ــــ گندے ــــ گھناؤنے بچوں کو گود میں اٹھائے ــــ میلی کچیلی عورتیں ان کے ٹاٹ کے پردے کے سامنے ہجوم لگائے ہوتیں ــــ مائیں روتے ہوئے بچوں کو کمر پر لادے ہلا ہلا کر بہلاتیں ــــ اور گلشن لوا کو دیکھتے ہی اس ہجوم میں ہلکی سی کھلبلی مچ جاتی ــــ وہ ان سب پر نظر ڈالتی ٹاٹ پلٹ کر اندر چلی جاتیں ــــ اور جھٹ لوٹا لے سنلائٹ صابن سے خوب مل مل کر ہاتھ دھوتیں ــــ پھر ایک ٹوٹا ساٹین کا جوکور ڈبہ ــــ منگھڑ ٹوٹی المونیم کی پتیلی اور سفید سفید روئی لے کر وہ دالان میں پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتیں ــــ اور کہتیں ــــ "آنکھوں والے چلیں بھائی ــــ اور پھر لوا بڑی مشاقی سے روئی کے پھوئے دوا میں بھگو بھگو کر بچوں اور کبھی بڑوں تک کی آنکھوں میں نچوڑتی رہتیں ــــ شیشی میں نہ جانے کون سی اکثیر دوا ہوتی ــــ گلابی گلابی سا پانی ــــ اور بس ــــ لیکن اس کے لئے ہی اتنے لوگ جمع ہو جاتے ــــ

بچوں کی چیخ دپکار ــــ بڑوں کی سی سی ــــ گونج اٹھتی ــــ

اور لوگ بڑے اعتماد کے ساتھ واپس جاتے ــــ اس کے بعد فوراً وہ گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھتیں ــــ "دوا کس کس کو لگوانا ہے ــــ؟" یہ کہتے کہتے وہ پلنگ سے اتر پاس ہی بڑی پیڑھی پر بیٹھ جاتیں ــــ المونیم کی کالی کالی پتیلی میں کبھی گہرا گہرا سرخ پانی بھرا ہوتا اور کبھی نیم کی پتی ابلا پانی ــــ روئی بھگو بھگو کر نہ جانے کتنے گھناؤنے ــــ گندے ــــ گہرے ــــ اور ہلکے زخم دھلتے ــــ کسی کے جوئیں سے بھرے سر میں غار جیسا زخم ہوتا تو لوا جھٹ قینچی اٹھاتیں ــــ اور سڑاپ سڑاپ کرتی بالوں کے ڈھیر لگا دیتیں ــــ اور کوئی اف تک نہ کرتا، نہ جانے کون کون سی دوائیں لگاتیں ــــ کبھی دیسی قسم کا مرہم ــــ کبھی صرف ابلی ہوئی نیم کی پتی ــــ کبھی کوئی بلیٹس ــــ اور بقول گلشن لوا کبھی کبھی تو صرف بمبیا مرہم ہی کافی ہوتا ہے ــــ

سنا تو یہ جاتا تھا کہ کسی بڑے بزرگ نے ان کے ہاتھ میں شفا بخشی

تھی ـــ ان کے ہاتھ سے پُرانے سے پُرانے ناسُور تک اچھے ہو جاتے تھے ـــ انھیں کاموں میں گلشن بوا کو بارہ ایک بج جاتے ـــ سب سے چھٹکارا پا کر ہاتھ دھو دھا وہ پھر ہمارے گھر موجود ہوتیں ـــ ان کا کھانا دادی امّاں کے وقت سے ہمارے گھر کے ہی ذمّہ تھا ـــ اور امّی نے بھی اس روایت کو قائم رکھنے میں شاید کوئی نقصان نہیں سمجھا ـــ ان کو جیسا اُلٹا سیدھا کھانا ملتا وہ بڑے چاؤ سے کھاتیں ـــ جیسے انھوں نے خدا سے یہی مانگا تھا ـــ وہ کھانا کھا کر گھر کے اور کاموں میں لگ جاتیں ـــ جو ان کے لئے پہلے ہی سے رکھا ہوتا۔ جیسے جاڑوں میں رضائیاں، لحاف، گدے وغیرہ میں تاگے ڈالنا ـــ سنوارنا۔ اور گرمیوں میں کرتے اور کبھی کبھی تو چکن کی ساری ہی پچھوا کر ان کے سپرد کر دی جاتی ـــ وہ یہ سب کام بڑے لگن سے کرتیں ـــ جیسے وہ اسی کام کے لئے بنی ہوں ـــ

اس دَرمیان کبھی کبھی وہ امّی سے باتیں بھی کرتیں ـــ وہ باتیں ایسے دردمندانہ انداز سے کرتیں جیسے اپنی اولاد یا اپنے بہت قریبی عزیز کے بارے میں ہوں ـــ

"کل کی بات سُنی آپ نے بی بی ـــ یہ حمید دا کتنے غضب کا ہے ـــ عَورت تو پوُرے دن سے ہے ـــ اور موارات کو دھائیں دھوئیں کرنے لگا۔ وہ تو میں پہنچ گئی ـــ ورنہ جان ہی لے لیتا دونوں کی ـــ اب پڑی ہے پلنگ پر ـــ اور خود بھاگا پھر رہا ہے مُوا ـــ

بی بی ـــ شبراتن کا معاملہ رفع دفع ہو گیا ـــ کل اس کا آدمی آیا تھا ـــ مان گیا ہے بی بی ـــ دو چار روز میں لے جائے گا ـــ" اور پھر بڑے اطمینان سے کہتیں ـــ "لڑکی اپنے گھر ہی بھلی ـــ"

وہ باتیں کرتی جاتیں لیکن ان کے ہاتھ اور ان کی آنکھیں ان باتوں سے بالکل بے تعلق اپنے کام میں لگے رہتے ـــ کبھی کبھی ان کی بڑی بڑی آنکھیں کسی بات پر اٹھتیں اور پھر جھک جاتیں ـــ کسی کی لڑکی بھاگ گئی ہے ـــ کسی کا میاں سے جھگڑا ہو گیا ہے ـــ یا کوئی اور ایسی ویسی بات ہو جائے تو محلّے کے سارے قضیئے

گلشن بوا کو ہی نمٹانے پڑتے ___ اور ان میں نہ معلوم کون سا جادو تھا کہ بیوی کا میکے جاتا ہُوا بکس واپس گھر میں آجاتا ___ اور رُوٹھا داماد تک من جاتا اور بیٹھی ہوئی لڑکی کو خوشی خوشی لے جاتا ___

تین بجتے ہی چائے کے برتن کھنک اُٹھتے ___ وہ شام کی چائے ہمیشہ خود ہی بناتی تھیں ___ اور چائے کے ساتھ مزے مزے کی مختلف چیزیں بھی اس معاملے میں وہ کسی کی رائے کا انتظار نہ کرتیں ___ ہاں اگر کوئی فرمائش کر دیتا تو کہنا ہی کیا تھا ___ گرم گرم پکوڑے ___ مزے دار چاٹ ___ میٹھی کھجوریں ___ شکر پارے وغیرہ ___ لیکن پانچ بجتے ہی ___ بوا بے چین ہو جاتیں ___ اور پھر ہمارے گھر سے نکلتے ہی پہلے کوارٹر سے آخری کوارٹر تک کا پُورا ایک چکر لگاتیں ___ اور مغرب کی نماز سے قبل ہی وہ اپنے کوارٹر پہنچ جاتیں ___ نماز پڑھتے پڑھتے ان کے کوارٹر کے سامنے پھر مجمع ہونے لگتا۔ لیکن اس وقت کا یہ مجمع صرف اڑدس پڑوس کے کوارٹروں تک کا ہی محدود نہ ہوتا بلکہ پُورے محلّے کا ہوتا ___ وہ نماز پڑھ کر سلام پھیرتیں کہ عورتیں اپنے بچّوں پر پھُونک ڈلوانے کو بے چین ہو جاتیں ___ وہ نہ معلوم کیا پڑھ کر دم کرتی جاتیں اور مجمع ہٹتا جاتا۔ طرح طرح کی باتیں پھُونک ڈلوانے والیاں بتاتیں ___ کبھی کوئی آسیب ___ کبھی کوئی بیماری ___ کبھی کوئی ڈر ___ اور کبھی کوئی جھپان ___ کوئی پانی دم کراتی ___ کوئی الائچی اور کوئی لوبان ___

سنا ہے کہ بڑے بڑے آسیب تک گلشن بوا کی پھُونک سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں ___ اور اکثر تو اس سلسلے میں تھوڑا بہت مجمع تک ہو جاتا ___ کوئی نوجوان ___ آسیب زدہ لڑکی لائی جاتی ___ اور ___ گلشن بوا مرچیں سُلگا سُلگا کر ___ ایسی دعائیں پڑھتیں کہ آسیب چھینک چھینک کر توبہ کرتا ہوا بھاگتا ___

صبح اور شام کے معمول میں گلشن بوا کے یہاں کبھی فرق نہ آتا۔ سوائے ایک معاملہ کے ___ یعنی اگر محلّہ میں کسی کے یہاں بچّہ پیدا ہوتا تو بس ___ بوا کا پتہ چلنا مشکل ہو جاتا ___ ہاں صبح اور شام تو ضرور کوارٹر

کے قریب زندگی پھیل جاتی ورنہ بڑی مشکل سے دن میں کسی وقت یا دُوسرے دِن آکر امی سے معذرت کرلیتیں ـــــ

"کیا بتاؤں بی بی ـــــ اجّن الیسا روئے تھا کہ جاتے ہی بن پڑا۔ اس کے دو بچّے تو پہلے ہی جموگا لے جا چکا تھا ـــــ"

"جموگا لے گیا ـــــ ؟" امی مسکرا دیتیں۔

"ہاں بی بی ـــــ جموگا ـــــ !! بطخے لائے گئے ـــــ شیر دانت لایا گیا ـــــ لیکن بی بی ـــــ بطخا موا بچّہ دیکھتے ہی خاں خاں کرکے بھاگا ـــــ" اور پھر وہ خوف زدہ سی ہوکر بتاتیں ـــــ "بی بی ـــــ یہ جموگا ہے نا ـــــ خود تو بچّہ بنکر پڑ جاتا ہے ـــــ اور بچّے کو سمیٹ لے جاتا ہے ـــــ اے بی بی ـــــ رات دِن کتنے وظیفے ـــــ آئت الکرسی ـــــ اور سورۂ ناس پڑھ کر دم کیا ہے، تب یہ تیسرا بچّہ بچا ہے ـــــ"

اس طرح جب وہ پوری طرح بچّے کو جموگے سے بچا لیتیں تو ساتویں دن بے پناہ محنت کے بعد تھکی تھکی سی گلشن بوا گھر آجاتیں ـــــ اور پھر ـــــ وہی معمول ـــــ اسی طرح زندگی کا دھارا گھومنے لگتا ـــــ عمر کے ساتھ گلشن بوا کی مشغولیت بھی بڑھتی جارہی تھی ـــــ

میں سوچتی ـــــ بار بار سوچتی ـــــ کیا ان کا اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں ـــــ ان کی اس ہماہمی میں مجھے ان کی زندگی کا رنگ کچھ پھیکا پھیکا محسوس ہوتا ـــــ حالاں کہ وہ مطمئن نظر آتیں ـــــ یا پھر ان کو ان سب باتوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہ تھا ـــــ

انھیں کبھی کسی تے دن میں آرام کرتے نہیں دیکھا تھا ـــــ وہ چاہے گرمیوں کی لمبی سنسان دوپہر ہو ـــــ یا ـــــ جاڑوں کی گرم نرم دھوپ ـــــ شاید کبھی بیمار نہ ہونے ـــــ اور ـــــ کبھی آرام نہ کرنے کا وعدہ کرکے ہی انھوں نے اس دُنیا میں قدم رکھا تھا ـــــ

ان کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی بات کرے یہ کسی کی مجال نہیں تھی لیکن اگر کبھی یہ حادثہ ہو ہی جاتا تو وہ عجیب خالی خالی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے

کہتیں ___ کیا میں تمھیں اکیلی لگتی ہوں ___ کیا تم لوگ میرے نہیں ہو۔ یہ سب کون ہیں جو میرے نہیں ہیں ___ جو صبح سے شام تک مجھے گھیرے رہتے ہیں ___" اور میں ان کی اس معصومیت پر نہ جانے کیوں کڑھ کر رہ جاتی۔

کئی روز سے گلشن بوا نظر نہیں آئیں ___ میں بھی امتحان میں مشغول تھی ___ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا ___ رات پوچھنے پر معلوم ہوا ___ بوا بیمار ہیں ___ تو پھر ان کے پاس کون ہوگا ___؟ میرے دل پر چوٹ سی لگی ___

اور ___ صبح تڑکے میں بھاگتی ہوئی اس تیسرے کوارٹر کے برآمدے میں، ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر داخل ہوئی ___

"گلشن بوا ___ اے گلشن بوا ___؟" میرے پکارنے پر بھی کوئی آواز نہیں آئی اور پھر میں نے دیکھا ___ گلشن بوا جھولا سی چارپائی میں گٹھری بنی آرام سے سو رہی تھیں ___ میرے ہاتھوں سے جیسے کسی نے جھپٹ کر کچھ چھین لیا تھا ___ اُف ___ رات کے نہ جانے کس حصّے میں ان کی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر اس ظالم گہری نیند نے انھیں آ دبوچا تھا ___

امّی کے بھیجے ہوئے اُبلے انڈے اور چائے کا گلاس ایک طرف لڑھکا پڑا تھا ___

۱۹۵۶ء

رشتوں کے بندھن

ساجدہ کا اُڑا اُڑا رنگ دیکھ کر بیگم رفیق کی گہری، ڈوبی ہوئی آنکھیں دیئے کی آخری لو کی طرح جھلملائیں تڑپیں ___ اور پھر ساجدہ کے تیکھے نقشے اور سانولی رنگت کے پار کہیں دُور کھو گئیں ___

چنچل و شوخ ساجدہ کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے شمع کی طرح پگھل پگھل کر جی رہی ہے ___ دُوسروں کے لئے تو روشنی ضرور ہے لیکن بیگم رفیق رتی رتی پگھلتی شمع کو دیکھ رہی تھیں ___ ماں جو ٹھہریں ___

ساجدہ کا جوانی سے بھرپور چہرہ انتظار کی آگ میں سُلگ سلگ کر ستواں نظر آرہا تھا ___ راشد آج بھی باوفا ہے ___ یا ہو سکتا ہے وفادار بننے کی محض کوشش کر رہا ہو ___ نہیں نہیں ___ وہ سچا ہے ___ اس کی محبت امر ہے ___ لیکن ___ لیکن زندگی تسبیح کے دانوں کی مانند کھٹا کھٹ سرکتی جا رہی تھی ___ اور ___ شادی ___ بس ساری بات یہیں آکر اٹکتی تھی ___

بیگم رفیق، ساجدہ کے سامنے مجبور ___ ساجدہ، راشد کے سامنے دوزانو ___ اور راشد، صفو آپا کے سامنے کچلا ہوا پڑا تھا ___

اس زنجیر کی کوئی کڑی اپنی جگہ سے ہلتی نظر نہیں آتی ___ لیکن ___ اُنگلیاں

ہیں کہ چاروں طرف گنّے کے کھیت کھڑا کئے ہیں ___ گھنا کھیت ___ اُوپر سے بے وقت کی برسات بھی ___

"کیوں شادی کب ہو رہی ہے ___؟"

"کافی دنوں سے گھپلا چل رہا ہے ___"

بے چاری صفو آپا ___ کتنی کتنی بار ساجدہ نمازوں میں گڑگڑائی تھی ___ "اے پروردگار ___ صفو آپا کا جوڑا کہاں بھٹک رہا ہے ___؟ میرے سامنے سُرخ پھول کھِلکھِلا کر ہنس رہے ہیں ___ اور ___ میں ان کی طرف صرف دیکھ سکتی ہُوں اپنے جوڑے میں سجا نہیں سکتی ___ انگوروں کے خوشے میرے سامنے مسرت ہو کر جھوم رہے ہیں اور میں چھو بھی نہیں سکتی ___ اُف ___ صفو آپا ___"

ساجدہ کی زندگی گنّوں کے کھیتوں میں گھری نہ ہوتی تو اس کا دم نہ گھٹتا ___ رشتہ داروں کا ___ عزیزوں کا ___ جاننے والوں کا ___ دوستوں کا گھیرا ___ اسکے گلے کا پھندا بن کر روز بروز تنگ ہوتا جا رہا تھا ___

شادی ___ شادی ___ اُف وہ کہاں ڈوب جائے ___؟ اور ڈوبنے کا خیال بھی باہوں میں راشد کا مہکتا ہوا پیار لئے دور آسمانوں کی گلابی و سنہری کرنوں میں چھپ جاتا ___

صفو آپا تو راشد سے بھی پُورے چار سال بڑی ہیں ___ اور ___ اور میں ___ اس کے سامنے سنہرے مہین مہین تاروں میں بجلیاں کوند جاتیں ___ وہ کانپ جاتی ___

صفو آپا کی شادی ___ پھر وہ دیکھتی صفو آپا سر سے پیر تک سفید کپڑوں میں دُور افق میں کہیں تیر رہی ہیں ___ اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں گلاب کھِل اُٹھتے ___ شہنائیوں کے درمیان راشد کا سفید گھوڑا پھول جھڑتا آگے بڑھتا ___ آگے ___ اور ساجدہ سُرخ جھلملاتا ہوا آنچل اٹھا کر سر پر رکھ لیتی ___ نظریں مسرّت کے بوجھ سے جھکی ہی ہوتیں کہ ___ صفو آپا کے دُودھ جیسے سفید لٹھے کے کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ اس کے دونوں نتھنوں میں کافور اور لوبان کی مہک کا سمندر انڈیل دیتی

"___ توبہ ہے ___ یا اللہ توبہ ہے" ساجدہ توبہ کرتی ___ پیشانی سے پسینہ

پوچھتی اور جلدی جلدی چاروں طرف دیکھتی ـــــ کسی مجرم کی طرح ـــــ جیسے واقعی اس نے ہی صفو آپا کا گلا گھونٹ دیا ہو ـــــ

"اُف ـــــ! وہ کتنی خود غرض ہو گئی ہے ـــــ اپنے سُرخ آنچل سے صفو آپا کی زندگی کی شمع ہی گل کر دی تھی ـــــ اسے لگا. جیسے آئے ہُوئے تمام رقعے اس نے پرچی پرچی کر کے ہوا میں اُڑا دیئے ہوں ـــــ اور وہ چھوٹی چھوٹی تتلیاں ـــــ ہزاروں ـــــ لاکھوں ـــــ اور پھر کروڑوں کی تعداد میں اس کے چاروں طرف بھنبھنانے لگیں. خود غرض ـــــ خود غرض ـــــ

وہ ڈر گئی ـــــ کہیں راشد نہ سُن لے ـــــ اور پھر زور زور سے توبہ کرنے لگی ـــــ یہ تو صرف میں نے سوچا تھا ـــــ میں نے تو دعا کی تھی ـــــ صفو آپا کیلئے. ـــــ پھر ـــــ یہ سب کیا ہو گیا ـــــ؟

اندر ـــــ گہرے کنویں میں سے ایک لپلپاتا ہوا سانپ پھنکار کر باہر آنے ہی والا تھا ـــــ کہ بھاری ـــــ منوں بھاری پتّھر سے ساجدہ نے کنویں کا منھ بند کر دیا ـــــ اور ـــــ سانپ اندھیروں میں ٹٹول ٹٹول کر اس کا کلیجہ ـــــ اس کا دل ـــــ اس کا دماغ ـــــ اس کا انگ انگ ڈسنے لگا تھا ـــــ اُف!

"امّی ـــــ" وہ چیخ پڑی ـــــ

بیگم رفیق پان کی سرخ سرخ پیک کو منھ میں بند کئے ـــــ ساجدہ کے سانولے ـــــ دھندلے ـــــ چہرے میں کچھ تلاش کر رہی تھیں ـــــ آواز تو تھی ہی نہیں ـــــ صرف چیخیں تھیں ـــــ بے آواز چیخیں ـــــ بھیانک خوابوں کی بے آواز چیخیں ـــــ

امّی کی نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائیں ـــــ اور ـــــ آج ـــــ آج ـــــ امّی پھر وہی پُوچھیں گی ـــــ وہ جان گئی تھی ـــــ وہ اِدھر اُدھر کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی ـــــ آج بھی اس کے سوال کا ایک ہی جواب تھا ـــــ صفو آپا کی شادی ـــــ اور ـــــ اسی بوجھ کے نیچے خود راشد بھی سسک پڑا تھا ـــــ اس کے شانے جُھول گئے تھے ـــــ

اسی گھٹن کو کم کرنے کے لئے وہ ساجدہ کا مہکتا ہُوا آنچل بار بار اپنے منھ تک

سے مَس کر رہا تھا ___ اور تالیوں کی بھیانک، بے سُری آواز سے ساجدہ ڈر گئی تھی،
تالیاں اس کا پیچھا کر رہی تھیں ___ اور ___ اور وہ بھاگتے بھاگتے بے دم ہو چکی
تھی ___ کس کس سے کہے ___ اس نے کچھ نہیں کیا ___ اس نے کچھ نہیں کیا ___
جینے کی خواہش پر ___ پھانسی کی سزا بہت ہے ___ زندگی کی تمنا راشد نے
جگائی تھی ___ پھر ___ پھر وہ گنہگار کیوں ___؟

اس نے پلٹ کر دیکھا ___ راشد کی نظریں ___ لوگوں کی انگلیاں مُحبّت
___ وفا ___ سب کچھ ___ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں ___ اس کے
ہاتھ سے جیسے کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور سرسراتی ہوئی دور پھسل جاتی ہے ___

"امّی ___ امّی ___ بس کیجئے ___ للّٰہ بس کیجئے ___" اور بیگم رفیق کے
سامنے دس سال پہلے کا شرمیلا راشد نظریں جھکائے کھڑا تھا ___

"رشتہ دار کا ہی تو لڑکا ہے ___ اگر کسی قابل ہو گیا ___ تو ___ اپنی ساجدہ
جو ہے ___" اور پھر انھوں نے ایک کمرہ خالی کرا دیا تھا ___ راشد کے رہنے کو ___
وہ وکالت پڑھنے شہر آیا تھا ___

اور اب ___ اب تو وہ ایڈووکیٹ ہے ___ کامیاب ایڈووکیٹ ___
نوجوان ___ خوب رو ___ قابل ___ چاروں طرف بہت سے ہاتھ لہرا
اُٹھے تھے ___ پکّا پھل سب ہی توڑنا چاہتے تھے ___ ہاتھوں کے جنگل میں
راشد بہت اونچا دکھائی دے رہا تھا ___ اور پھر ___ کئی ہاتھ اس جنگل کو
نیچے چھوڑ کر ہوا میں اُڑنے لگے ___ راشد کچھ اور اونچا ہو گیا ___ اور پھر ___
نہ جانے کیسے سارے ہاتھ ایک ساتھ مل گئے ___ سمندر امنڈ پڑا ___ تالیوں
کا خوفناک سمندر، اور ___ اور ___ بدنامیوں کا زہریلا جھاگ چاروں طرف
پھیل گیا ___

اس کسیلے ___ کڑوے جھاگ کی چھینٹیں جب بیگم رفیق کے چہرے
پر پڑیں تو وہ تڑپ تڑپ گئیں ___ وہ سوچتیں ___ ساجدہ کو کیوں پیدا کیا میں نے
___ وہ کیوں جیتی رہی اب تک ___؟ اور ___ ساجدہ ___ آنکھیں بند
کئے یہ سارا زہر ___ سارا کھولتا ہوا لاوا ___ پیتی رہی ___ اس کے چہرے پر

ایک شکن بھی نہ ابھرتی ـــــ بغیر منھ بنائے ـــــ اس کا بگڑا ہُوا منھ اس کی شکست ہے
اور وہ شکست قبول نہیں کر سکتی ـــــ وہ راشد کی مسکراہٹوں سے کچھ سفید سفید
کلیاں چُنتی ـــــ اپنے جلتے ہوئے ماتھے اور تپتے ہُوئے رخساروں سے مس کرتی۔
وہ ساری کلیاں اس کی محبّت کی گرمی سے کھِل اٹھتیں ـــــ اور ـــــ اندھیروں
کے ناگ سو جاتے ـــــ تالیوں کا جنگل اور گنّے کے کھیت پگھل کر دھواں بن جاتے،
خواہشیں ـــــ آرزوئیں ـــــ سینہ میں تڑپنے لگتیں ـــــ اور
وہ بیگم راشد بن جاتی ـــــ راشد کی صفو آپا کے لئے خدا سے منّتیں کرتی ـــــ یا خدا
صفو آپا کی مانگ افشاں سے بھر دے ـــــ اور پھر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگتی ـــــ
میں کیا مانگوں ـــــ کس کے لئے مانگوں ـــــ اپنے لئے ـــــ صفو آپا کے لئے ـــــ
یا ـــــ اس بھیانک جنگل کے لئے جس میں مَیں بھٹک رہی ہُوں ـــــ

۱۹۶۶ء

بابا

بابا کا ایک مفہوم تو بچپن ہی میں سمجھ میں آ گیا تھا اور وہ تھا بچوں کو پکڑنے والے کا تصور ـــــ بڑا سا جھولا کندھے پر لٹکائے، سر پر بہت بڑا جٹا ہوئی رسیوں کا سا، گرد سے اَٹا جوڑا ـــــ سینہ پر بکھری ہوئی داڑھی اور ٹھوڑی تک لٹکتی مونچھیں، جس کے ایک ہاتھ میں لوکی کی تونبی اور دوسرے میں لمبا سا چمٹا ـــــ

ویسے ہماری دوست چمپا تو اپنے پتاجی کے پتاجی کو بھی بابا ہی کہتی ہے سر گھٹا ہوا ـــــ بیچ چاند پر بالوں کی ایک موٹی سی لٹ جس میں گرہ لگی ہوتی ـــــ ننگے دھڑ ننگے بدن پر ایک دھاگہ داہنے کندھے سے بائیں طرف کمر تک لٹکتا ہوا۔ کمر میں سفید مہین سی کگر والی سفید دھوتی ـــــ گیہوں رنگ ـــــ چوڑے سے ماتھے پر چندن کا تلک ـــــ اور ناک کے نیچے سفید موٹی موٹی مونچھوں کے گچھے ـــــ داڑھی اور دانت دونوں صاف ـــــ یہ بابا تو ضرور تھے لیکن ان سے ڈر بالکل نہیں لگتا تھا ـــــ کیوں کہ وہ ہمیشہ بڑے سکون سے بات کرتے اور ان کی آنکھیں سدا مسکراتی رہتیں ـــــ

بابا ـــــ کا استعمال اس وقت تو بڑا ہی عجیب لگتا ہے جب کوئی بھکاری، اچھے خاصے سوٹڈ بوٹڈ جنٹلمین کے آگے ہاتھ پسار کر کہتا ہے ـــــ "بابا۔ ا جگ جگ جیو ـــــ"

ویسے انگریزیت کا خدا بھلا کرے اچھے خاصے بُوا جیسے بچے بھی بابا کہہ کر

اکثر پکارے جاتے ہیں — پتہ نہیں یہ ہندوستانی والدین، بچوں کو بابا کا نام کیوں دے دیتے ہیں — ہو سکتا ہے وہ کسی نئے قسم کا بابا بنانا چاہتے ہوں — کیوں کہ سُنا ہے نام کا اثر کردار پر بہت پڑتا ہے — اور بچپن کا دیا یہ نام کبھی — بابائے ملّت یا بابا بھیمپت داس قسم کے خطابات بن جائیں — اور بابا — انجینئر یا ڈاکٹر کہلانے لگ جائے —

خیر کچھ بھی ہو — بابا کسی نہ کسی شکل میں ہر ہندوستانی گھر میں موجود ہوتے ہیں — ویسے میں جن بابا کا ذکر کرنے جا رہی ہوں وہ خدانخواستہ کسی بھیانک قسم کے بابا ہرگز نہیں — اور نہ ہی بھولے بھولے گالوں والے گڈّے جیسے —

ہاں تو یہ بابا جن کے کسی رشتہ دار کا کسی کو آج تک پتہ نہیں — اصل میں امّی کی شادی میں ان کے ساتھ ہی ابّا کے گھر چلے آئے تھے — انھوں نے بارات آنے سے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ میں بٹیا کے ساتھ ہی لکھنؤ میں رہوں گا۔ پتہ نہیں بٹیا پر کیا پڑے۔ شہر کا معاملہ ہے — اور گھر کا پرانا نوکر ہونے کے ناطے ان کے اس اعلان کو کون ٹال سکتا تھا — نانا ابّا نے بھی سوچا چلو ٹھیک ہے۔ گھر کا ایک نوکر ساتھ رہے گا تو بٹیا کو آرام ہی ملے گا —

اور اس طرح بٹیا کے جہیز میں چار دھوتیوں اور چار قمیصوں کا اضافہ کرا کے بابا بھی لکھنؤ آ گئے تھے — اب پتہ نہیں واقعی بابا بٹیا کی محبّت میں لکھنؤ آئے تھے، یا قصبہ سے شہر آنے کے شوق نے بٹیا سے محبّت میں اضافہ کرا دیا تھا — پھر بھی امّی تو یہی بتاتی ہیں کہ بابا ان کو چاہتے ہی بہت تھے — سارے بہن بھائیوں سے زیادہ — ویسے ان کے چاہنے میں شک مجھ کو بھی قطعی نہیں — کیوں کہ جب میں امّی کی پہلی اولاد بن کر دُنیا میں وارد ہُوئی اس وقت بھی بابا نے پیار اور محبّت کے ساتھ مجھے گود میں لے لیا تھا — اور جب بے بی امّی کی ساتویں اولاد بن کر آئی تو بھی بابا نے مسکرا کر خیر مقدم کیا تھا — اور بس پھر خدمت اور پیار کرتے رہے تھے —

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بچپن سے لے کر اب تک بابا میں کوئی خاص فرق

میں نے محسوس نہیں کیا ــــ ویسے ہی لمبے اور ذرا بھاری ڈیل ڈول کے بابا ــــ بالکل ویسے ہی گیہواں رنگ ــــ سر اور داڑھی گھٹی ہوئی ــــ مونچھیں ذرا ہلکی اور لمبی مگر انھیں تنی ہوئی نہیں کہا جا سکتا ــــ آنکھیں بہت چھوٹی، پچپچاتی ہوئی ــ تپلیاں بے حد چھوٹی، جن پر ہمیشہ بھنویں جھکی رہتیں ــــ ایک ذرا زیادہ اور دوسری ذرا کم ـ آنکھوں سے زیادہ کام لینے میں ہمیشہ کنجوسی کرتے ــــ راستہ چلتے تو بغیر دیکھے، سر اُٹھائے چلے جاتے ــــ کھانا کھاتے تو بھی گردن نہ جھکتی بلکہ بڑا سا نوالہ پلیٹ سے ٹٹول کر ہی اُٹھا لیتے اور منھ میں رکھ کر آرام سے چباتے رہتے ــــ اس طرح وہ چھ سات چپاتی ایک گھنٹہ سے کم میں کبھی ختم نہ کر پاتے ــــ ہاں چاول وہ ضرور بغیر ایک بار بھی منھ چلائے نہ جانے کیسے نگل لیتے ــــ ورنہ کھانا کھانے کا وقت ایک گھنٹہ سے بڑھ کر نہ جانے کتنا ہو جاتا ــــ

وہ بیٹھے کھانا کھا رہے ہوتے ــــ ان کا سر اوپر ہوتا ــــ تو ہم لوگوں میں سے کوئی ان کے آگے سے کھانا سرکانے کی کوشش کرتا ــــ ہاتھ آہستہ سے ان کی پلیٹ کی طرف بڑھتا کہ ان کی جھٹکے دار آواز سنائی دیتی ــــ

"اے ہٹو ویسی ــــ اور دیکھو ــــ جیسے میں جانتا نہیں ــــ!" اور اس طرح ان کے اندازے کی قوت کا احساس ہو جاتا ــــ اور ہم لوگ ہنس پڑتے ــــ یہی قوتِ احساس تھا کہ سڑک پر سر اٹھائے بلا روک ٹوک ہمیشہ چلتے رہے ــــ اور بڑھاپے تک کوئی حادثہ نہیں ہوا ــــ

بچپن سے اب تک بابا کو ہم نے جس طرح اپنے گھر پر حاوی دیکھا ہے اس سے تو کبھی سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ نوکر قسم کی کوئی چیز ہیں ــــ رات کے کھانے میں ذرا بھی دیر ہوئی کہ خانساماں کی آفت ــــ

"بھیا ادریس ــــ بچے سو جائیں گے تو کیا پکاؤ گے خاک ـ" امی نے دودھ نہیں پیا تو ڈانٹ رہے ہیں ــــ

"دودھ نہیں پیو گی تو بچہ رات بھر چیخے چلّائے گا ــــ اس لئے دودھ پینا تو ضروری ہے ــــ!" اور کبھی کبھی تو حد ہو جاتی کہ ابا کو بھی ٹوک دیتے ــــ

"واہ رے بھیا ــــ اس وقت تانگہ سے ہی آ جاتے ــــ جلچلاتی

دھوپ میں رنگ تو دیکھو بالکل تانبا ہو گیا ہے ــــــ" اور ابا جواب میں صرف مسکرا دیتے، گھر کے دوسرے نوکروں کے تو ایک طرح سے وہ مالک ہی تھے ــــــ پھر کبھی دُودھ والے سے جھگڑا ہے کہ دُودھ میں پانی ملاتا ہے ــــــ کبھی چکی والے سے شکایت ہے کہ آٹا کم تولتا ہے ــــــ حلتی ہُوئی آٹے کی بڑی سی گٹھڑی سر سے اُتار کر رکھتے اور بڑبڑاتے رہتے ــــــ یہ کام بھی اپنے ذمہ اس لئے لئے ہوئے تھے کہ صاف کئے ہُوئے گیہوں کی، رکھوالی کر سکیں اور آٹا کم نہ ہونے پائے ــــــ امی لاکھ سمجھاتیں ــــــ "ہوگا! جانے دو۔ مگر بابا ہر وقت کسی نہ کسی چکر میں پریشان ہی رہتے ــــــ یہاں تک کہ خانساماں، باورچی خانے کی دیا سلائی سے کتنی بار بیڑی جلاتا ہے، اس کی بھی گنتی ان کے پاس رہتی ــــــ نعمت خانے میں دودھ کی پتیلی کھلی کس نے ڈال دی ــــــ اور پھر بالائی کو جھک جھک کر غور سے دیکھتے ــــــ اگر خانساماں کا چرایا ہوا گھی ــــــ یا شکر کی پڑیا اِدھر اُدھر لکڑی کی کوٹھری وغیرہ میں مل جائے تب تو آفت ہی آجاتی ــــــ ایک ایک کو دکھاتے پھر رہے ہیں اور خانساماں کی چوری کا اعلان بھی ساتھ ہی کرتے جاتے ہیں، اب اگر خانساماں شرم دار ہوا، اور چلا گیا تو سارے گھر کی مصیبت آجاتی کیونکہ بابا خود تو باورچی خانے کے کام کو جانتے نہ تھے اور دعویٰ ایسے کرتے جیسے ساری ذمہ داری نبھا دیں گے ــــــ اور جب ایسا وقت آتا تو واقعی وہ اچھی خاصی ذمہ داری لے بھی لیتے، آنکھوں کا استعمال وہ عام طور سے کم ہی کرتے تھے ــــــ یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا کہ وہ پیاز کترنے بیٹھتے تو الٹے ہاتھ میں پیاز کی آنڈی اور سیدھے ہاتھ میں چھری ــــــ پیاز کی آنڈی آنکھ سے ایک یا دو انچ کی دُوری پر کئے چھری چلا رہے ہیں ــــــ اور پیاز کے پتلے پتلے لچھے نیچے گر رہے ہیں ــــــ پتہ نہیں کون سا جادو تھا کہ ان کی آنکھوں میں پیاز کی جھار نہ لگتی اور ہم لوگوں کی آنکھوں میں دور بیٹھنے پر بھی نمی آجاتی ــــــ ہر سبزی وہ یوں ہی اندازے سے کاٹ دیتے اور حد تو یہ کہ کبھی گوشت بگھارنے اور بھوننے کی بھی ذمہ داری لے لیتے ــــــ ٹٹول کر نمک ڈالتے اور کبھی جو کم یا زیادہ ہوا ہو ــــــ روٹی بھی پکانے کی کوشش کرتے جو زندگی بھر کوشش کے آگے نہ بڑھ سکی ــــــ اور شاید وہ اسلئے کہ امی کے میکے سے آئے تھے اور امی بھی ان کو بہت چاہتی تھیں ــــــ

بابا کو کبھی کسی نے بہت سنجیدہ نہیں دیکھا ــــــ بس کبھی کبھار کسی نوکر کی

شامت آتی تو بابا کو غصہ بھی آجاتا ـــــ ورنہ عام طور سے بابا کو سب ہی خوش مزاج کہتے تھے ـــــ پتہ نہیں ان کی یہ خوش مزاجی اب تک قائم کیسے ہے ـــــ؟ ان کے نہ تو کوئی رشتہ دار کبھی نظر آئے اور نہ بابا نے ہی کبھی کسی کا ذکر کیا ـــــ جوان ہو کر بھی بابا نے کوئی رشتہ نہ جوڑا ـــــ نہ شادی کی ـــــ اور نہ ہی کبھی کوئی معاشقہ ہوا ـــــ سُنتے ہیں ایسے لوگ بڑے تلخ مزاج ہو جاتے ہیں ـ لیکن بابا میں کسی نے کبھی کسی قسم کی تلخی یا جھنجھلاہٹ نہیں دیکھی ـــــ

عید کے دن منھ اندھیرے نہاتے ـــــ رشیمی بھڑک دار قمیص ـ اسی کپڑے کی ٹوپی ـــــ اور سفید دھوتی پہن کر عید گاہ جاتے ـــــ جوتے سے بابا کو زندگی بھر کا بیر تھا ـــــ اگر ہم لوگ کبھی اصرار کرتے تو وہ کہتے ـــــ

"پیر دل کو قید کرنے سے کیا فائدہ ـــــ کھلے کھلے آزادی سے رہتے ہیں ـ"

عید گاہ سے واپسی پر سارے بچوں کو پیسے بانٹتے ـــــ ایک زوردار آواز لگاتے ـ "چلو بچو عیدی لو ـــــ" اور سارے بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے ـــــ ایک ایک اکنی بڑی مشکل سے ٹٹول ٹٹول کر ہتھیلیوں پر رکھتے جاتے ـــــ اور ساتھ ہی ہتھیلی کو چھو بھی لیتے ـــــ اور پھر مجال ہے کہ کوئی ہتھیلی دوبارہ پھیل جاتی ـــــ ہم لوگ خوش ہو کر بابا سلام ـــــ بابا سلام کا نعرہ لگاتے ـــــ کیوں کہ اسی اکنی سے عیدی کی بسم اللہ ہوتی تھی ـــــ وہ عیدی ہمیشہ اکنی ہی رہی ـ اور اسی سے عیدی کی بسم اللہ ہوتی رہی ـ

ممی جب انگلینڈ میں تھے ـــــ تو بابا کو بہت افسوس ہوا کہ بھیا کو وہ عیدی کیسے دیں ـــــ اور یہ بھی کہ آج بھیا کی عید سونی ہوگی ـــــ وہ سارے دن بھیا کو یاد کرتے رہتے ـــــ نہ بھیا کو عیدی ملی ہوگی ـــــ نہ بھیا نے سوئیاں کھائیں ہوں گی ـــــ اور جب ممی کے عید کارڈ اور خط میں سے بابا کے نام پیغام سنایا جاتا کہ بابا سے سلام کہئے اور کہئے کہ ہماری عیدی باقی ہے ـ اگلے سال دو آنے اکٹھا لیں گے ـــــ تو بابا مسکرا اٹھتے ـــــ ان کی دھنسی ہوئی مدھم آنکھیں چمک اٹھتیں ـــــ جیسے خلوص اور پیار کی کرنیں پھوٹ پڑی ہوں ـــــ اور پھر دعاؤں کا سوتا ان کے ہونٹوں سے اُبل پڑتا ـــــ جن میں حضرت علیؑ، بڑے پیر صاحب، اور

خواجہ صاحب کے نام صاف سنائی دیتے ـــــ جن کے سائے میں ان کا بھیا ولایت میں پڑھ رہا تھا ـــــ

اسی طرح محرم بھی بابا بہت زور دار مناتے ـــــ خود امام حسین کے فقیر بنتے ـــــ پتہ نہیں کس کی منّت کا تعزیہ رکھتے ـــــ نویں کی رات بابا کا تعزیہ چوک پر رکھا جاتا ـــــ شام سے گہری ہری قمیص اور ہری ہی رنگی ہوئی دو پلی، ٹوپی پہن لیتے ـــــ گلے میں ہرے کلاوے کا موٹا سا ہار جس میں ایک باریک سا چاندی کا چھلّہ پڑا ہوتا ـــــ بابا فقیر بنے سب کو شربت پلاتے رہتے۔ رات میں الائچی دانے (شکر میں لپٹی ہوئی کھیلیں) آتے ـــــ اور ساری رات شہنی بجتی۔ لوبان سلگتا ـــــ رات بھر مرثیے، نوحے پڑھے جاتے اور بابا دہے روتے رہتے صبح عطر اور کیوڑہ چھڑک کر تعزیہ اٹھاتے اور کندھے کا سہارا دیتے ہوئے کربلا میں جاکر ٹھنڈا کر آتے ـــــ

بابا کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہمیں اکثر یاد آتا ہے ـــــ ہملوگ بہت چھوٹے تھے ـــــ میری عمر آٹھ سال کی ہوگی اور ممّی کی چھ سال ـــــ ہملوگ ہمیشہ بابا کے ساتھ ہی باہر گھومنے بھیجے جاتے تھے ـــــ ایک بار بابا ہملوگوں کو دسہرہ کا میلہ دکھانے لے گئے ـــــ میلے میں بڑی بھیڑ تھی ـــــ ایک کندھے پر میں اور دوسرے پر ممّی۔ اس شان سے میلے کی سیر کر رہے تھے، جیسے کسی اونچی پہئیے والی گاڑی پر ہوں ـــــ سارے میلے میں بابا آہستہ آہستہ چکّر لگاتے اور اس درمیان ہملوگ چھوٹی موٹی شاپنگ بھی کرتے رہتے ـــــ "بابا غبارے۔" اور بابا فوراً دو غبارے لے کر ہاتھ اونچا کر کے ہملوگوں کو پکڑا دیتے ـــــ "بابا گیند" بابا گیند خرید دیتے ـــــ "بابا غلیل ـــــ" "بابا تیر کمان" ـــــ اور بابا سارا سامان اوپر پہنچاتے رہتے، جسے بڑی مشکل سے ہملوگ سنبھالے رہتے ـــــ اور مزا تو جب آتا کہ ہملوگ اسی اونٹ نما گاڑی پہ بیٹھے بیٹھے ضد کرتے ـــــ "بابا کچالو ـــــ" "بابا مٹر ـــــ" تو بابا کی مجبوری دیکھنے کے قابل ہوتی ـــــ وہ بار بار یاد دلاتے کہ امّی نے ـــــ کھانے والی چیز پر پابندی لگائی تھی ـــــ مگر ہملوگ امّی والی بات ان سنی کر دیتے ـــــ ان کے گھٹے ہوئے سر پر منڈھی ہوئی دو پلی ٹوپی اتار کر

ان کا سر پیٹنے لگتے۔ یا تو اُچک اُچک کر ان کے کندھے توڑنے کی کوشش کرتے۔ اور آخر مجبور ہو کر بابا، کچالو کا ایک پتہ خرید کر اُوپر پہنچا دیتے ___ اور ہم لوگ فوراً سر پر ٹوپی رکھ کر اپنی میز بنا لیتے ___ پتہ میز پر ٹکا رہتا اور ہم لوگ میلے کے ساتھ ساتھ چاٹ سے بھی لُطف اندوز ہوتے ___ آج مجھے یاد آتا ہے کہ اس چاٹ میں بابا نے کبھی سونٹھ والی میٹھی چٹنی نہیں ڈلوائی، شاید اس ڈر سے کہ کہیں میز پوش کے ساتھ ان کے اور کپڑے بھی ہم لوگ برباد نہ کر ڈالیں ___ کچھ بھی ہو ___ ویسے مزیدار کچالو پھر آج تک کبھی کھانے کو نہ مل سکے۔

راون میں آگ لگی ___ مجمع میں ہلچل مچ گئی ___ سارا مجمع آگے جانے کی کوشش میں لہریں لے رہا تھا ___ لیکن ہم لوگ چاہے کتنی ہی دُور ہوں۔ آرام سے راون جلتا دیکھتے اور بابا کو بتاتے جاتے ___ اب پسلی ٹوٹی ___ اب ہاتھ گرا ___ اور لوگ لکڑیاں لے کر بھاگ رہے ہیں ___ بابا بیچارے سر جھکائے کھڑے رہتے اور ہم لوگوں سے بار بار پوچھتے ___ "دکھائی دے رہا ہے نہ" اور ہم لوگ تالیاں بجا بجا کر ہنستے رہتے ___

واپسی میں میلے سے باہر آکر بابا نے اکڑوں بیٹھ کر ہم لوگوں کو اُتارا ___ کندھے سے اُترتے ہی میں نے ضد شروع کر دی۔ لال والی چوڑی لے دو ___ مجبوراً ہم دونوں کی انگلی پکڑ کر کنارے پر دول کی بنی ہوئی دوکان پر پہنچے ___ میں چوڑیاں دیکھنے لگی ___ مجھے لال چوڑیاں چاہئیں ___ میرے ہاتھ کی چاہئیں ___ ابھی چوڑیاں خریدی بھی نہیں تھیں کہ پتہ نہیں کب بھیّا انگلی چھڑا کر میلے میں غائب ___ بابا چیخے ___ "بھیّا ___ او بھیّا ___" اور میری تو جان ہی نکل گئی۔ بھیّا کے غائب ہونے کا مطلب تھا۔ بچے پکڑنے والا پکڑ لے گیا بھیّا کو ___ اور میں چیخ چیخ کر رونے لگی ___

بابا بیچارے بوکھلائے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے ___ اُن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے پانی کے چشمے اُبل پڑے تھے ___ اور منھ سے جھاگ اُڑ رہا تھا ___

سامنے ایک سپاہی نظر آیا تو بابا دہاڑیں مار کر رونے لگے ___ "میرا بھیّا

کھو گیا ہے —" میں بابا کا برابر ساتھ دے رہی تھی — اس لئے ہر دیکھنے والا بڑی ہمدردی سے اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگتا —

ذرا دیر میں مجمع اکٹھا ہو گیا — بابا مجھے بہلانے کی کوشش میں اور بھی بِلک بِلک کر رو رہے تھے — سپاہی نے ان کو وہیں روک دیا تھا کہ شاید بچہ واپس اسی جگہ آجائے اور خود بچّہ کو تلاش کرتا ہوا نظروں سے غائب ہو گیا تھا — اچانک ہی بھیّا صاحب ایک سیٹی والے کی جھبیا پکڑے اسے گھسیٹتے ہوئے، چوڑی والے کی دوکان کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیئے — میں چلائی۔

"بابا — بھیّا!" — اور بابا چوڑی والے کی دوکان کی طرف ایسے جھپٹے جیسے شِکرا، کبوتر پر — اور پھر بھیّا کو پاکر — پاگلوں کی طرح "میرا بھیّا — میرا بچہ" کہہ کر بابا، بھیّا کے عضو عضو کا معائنہ کرنے لگے — آنسو اب بھی ان کی آنکھوں میں مچل رہے تھے — اور پھر اچانک ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے بھیّا کو گود میں دبا کر بابا میلے سے ایسا بھاگے جیسے سچ مچ کوئی پکڑنے والا ان کے بھیّا کو پکڑنے آرہا ہو —

بعد میں بھی اس واقعہ کا جب کبھی کوئی ذکر کر دیتا، بابا ہمیشہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگتے —

بابا اب کافی ضعیف ہو چکے ہیں لیکن ان کی اکڑ میں کوئی کمی نہیں ہے وہ اسی آن بان سے رہتے ہیں — ہاں ذرا دُبلے ضرور ہو گئے ہیں، اور اپنے خیال میں بچوں کو اچھی غذا پہنچانے کی خاطر گاؤں میں رہنا شروع کر دیا ہے — بوتل کا دُودھ اور بازار کا گھی ان کے لئے ناقابل قبول ہے، اس لئے گاؤں میں بھینسوں کی دیکھ بھال اور مرغیوں کی رکھوالی انھوں نے اپنا کام بنا لیا ہے — دُوسرے نوکروں پر وہاں بھی ان کی حکمرانی ہے — تازی سبزیوں کا بھی انھوں نے بڑا انتظام کیا ہے۔ لیکن بیچارے کو بہت افسوس ہے کہ روزانہ پہنچا نہیں سکتے — آٹھویں دسویں روز چھ میل دُور سے پیدل چل کر بچوں کو دیکھنے آتے ہیں — لاکھ کہو — "بابا یکہ پر آجایا کرو —" مگر جواب آج بھی وہی ہے — "کیا ہم اپاہج ہیں —؟"

بابا اکثر ایک غم کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کا بھیا اور دُلھن بہت دُور رہتے ہیں ــــ وہ اپنے بھیا اور دُلھن بی بی کو بہت چاہتے ہیں اور کبھی تو دعائیں دیتے دیتے ان کی آنکھیں تک نم ہو جاتی ہیں، جنھیں وہ دھوتی کے کونے سے خشک کرنے کی کوشش کرتے ہیں ــــ آج تک یہ بات راز ہی رہی کہ بابا ہم سات بھائی اور بہنوں میں سے کس کو زیادہ چاہتے ہیں ــــ جو دُور ہُوا یا بیمار ہُوا بابا کے لئے وہی سب سے پیارا ہو جاتا ہے اور ہم سب کے لئے ہمارے بابا کتنے پیارے کتنے اچھے ہیں یہ ان کو کون بتائے ــــ

کبھی کبھی تو دل ڈر سے کانپ جاتا ہے ــــ بابا اگر بچھڑ گئے تو ــــ وہ اکثر کہتے ہیں ــــ "دیکھنا ہم تو چلتے پھرتے دنیا سے جائیں گے۔" ویسے دیکھنے میں تو یہ خطرہ کافی دُور ہے ــــ مگر پھر بھی کون جانے کب ــــ محبت کا یہ سوتا سوکھ جائے ــــ

۱۹۵۹ء

گلاب کا پودا

میں نے جب بھی ان کے بارے میں سوچا تو کبھی اس کا فیصلہ نہیں کر سکی کہ میرا دل ان کی محبت، ان کے خلوص سے معمور ہے یا اس میں ناراضگی اور نفرت کا دھواں اُمنڈ رہا ہے ـــــ بچپن کی دھندلی اور رنگین یادوں کے درمیان دُبلے پتلے، سانولے رنگ کے لمبے سے اتالیق، جنھیں ہم سب بھائی بہنوں کو ماسٹر خالو کہنا پڑتا تھا ـــــ پچکے پچکے گال، دھنسی ہوئی مگر چیتے جیسی گہری آنکھیں ـــــ نوک دار ترشی ہوئی داڑھی اور سر پر چھوٹے چھوٹے کھچڑی بال ـــــ جن کو کئی کئی بار کنگھے سے سنوارا جاتا ـــــ لیکن کبھی جو ان میں فرق آیا ہو ـــــ وہ ویسے کے ویسے چاند پر چپکے رہتے ـــــ کندھوں سے لٹکتی لمبی سی ململی قمیص ـــــ ذرا چھوٹی مہری کا پاجامہ ـــــ اور پمپ جوتے ان کی شخصیت کا اہم جزو تھے ـــــ لیکن جاڑوں کے موسم میں وہ اپنے لباس کے سلسلے میں بہت محتاط ہو جاتے ـــــ شیروانی تو مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی پہنی ہو ـــــ لیکن اکثر و بیشتر براؤن سا کوٹ اور کبھی کبھی خوب صورت سا اوور کوٹ ان کے ٹخنوں تک لٹکتا نظر آتا ـــــ اور تب وہ کچھ نئے نئے اور عجیب سے لگتے ـــــ شاید رعب دار ـــــ یا پھر ڈراؤنے سے ـــــ

ان کا متعارف ابا سے کیسے ہو گیا تھا مجھے نہیں معلوم ـــــ لیکن آرٹ اسکول کے خوش نویس ماسٹر صاحب نے اپنی خوش نویسی اور میٹھی میٹھی

باتوں سے ابّا کو کافی متاثر کر لیا تھا ___ اور ابّا نے اپنے بچّوں کو خوش خطی سکھانے کا پروگرام بنا لیا ___ ہم لوگ ان کی شاگردی میں دے دیئے گئے ___ میں اور بھیّا دونوں ہی ان کے لئے تختۂ مشق بن گئے ___ ڈھیر سا کام ___ تختی پر لکھنا ___ معنی رٹنا ___ ہجّے یاد کرنا ___ وغیرہ وغیرہ ___ پھر میں نے محسوس کیا ___ نہ جانے کیوں ماسٹر خالو ___ مجھ سے کچھ دُور ہو گئے ___ اور بھیّا کے ساتھ ان کا برتاؤ پہلے جیسا تھا ___ اب ہم دونوں کے کاموں میں فرق ہونے لگا ___ اور تصحیح میں بھی ___ بھیّا کی تختی وہ بڑے پیار سے اُٹھاتے اور کلک کے قلم کو سنبھال کر کالی روشنائی میں ڈبوتے اور پھر آہستہ آہستہ حرف کے دائرے تختی پر بناتے اور ___ "یُوں ___ یوں" کر کے سمجھاتے ___ لیکن میری تختی ہاتھ میں جاتے ہی جیسے ان کے کانٹا چُبھ جاتا ___ ان کی آنکھیں کچھ گہری گہری لگتیں ___ تختی ہاتھ میں لیتے اور میرا منھ تاکتے ہُوئے نہایت سنجیدگی سے اعلان کر دیتے ___ "تم پڑھ وڑھ نہیں سکتیں ___" اور پھر بڑی بے دردی سے کہہ دیتے "جاؤ گھر کے کام سیکھو ___ پڑھنے چلی ہیں ___" اور میں سمجھ نہ پاتی کہ میں کیا کام سیکھوں ___ اور میں چڑھ جاتی "کام ___ کام نوکر کرتے ہیں ___ ماسٹر خالو ___ مجھے تو پڑھنا ہے ___" اور وہ مجھے جھڑک دیتے ___ "ہاں ہاں پڑھنا ہے ___ بڑی پڑھنے والی ہو نا ___" اور پھر وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگتے ___ بابو جی نہ جانے کیوں پڑھانا چاہتے ہیں ___ جیسے اُستانی ہی تو بن جائے گی ___" اور میرے دل میں ان کے لئے نفرت کا سمندر اُمنڈ پڑتا ___ اور میں روہانسی اٹھ کر چلی جاتی ___ اور وہ پُورے انہماک سے بھیّا پر لگ جاتے ___ لیکن اکثر بھیّا بھی روتے ہُوئے اماں سے شکایت کرتے ___ "ماسٹر خالو نے گالی دی تھی ___" گالیوں سے ہم لوگ بالکل مانوس نہیں تھے ___ اور ماسٹر خالو کے کردار کا نہایت اہم جزو یہ گالیاں تھیں ___ قلم ___ کاغذ ___ تختی ___ کتاب ___ کپڑا ___ سب ہی سے سالے کا رشتہ جوڑ لیتے ___ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کس رشتے کا اظہار ہے ___ بس ہم دونوں ہی اس لفظ کو بے حد گندی گالی

سمجھتے ـــــ اور اکثر اوقات بغاوت کر دیتے ـــــ اس بغاوت کا اظہار اس طرح ہوتا کہ ماسٹر خالو کے لاکھ ڈرانے اور دھمکانے کے باوجود قلم تک ہاتھ میں نہ پکڑتے اور منھ سے تو کچھ بولنے کا سوال ہی نہیں تھا ـــــ اور پھر ـــــ وہ ابا کی بار بار کی گئی تاکید کو ایک دم بھلا دیتے ـــــ اور کلک کے قلم کو قط کی طرف سے پکڑ کر ہم لوگوں کے ننھے ننھے ہاتھوں کو سرخ کر دیتے ـــــ اور ہم لوگ رو پڑتے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوتا کہ ماسٹر خالو آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑاتے ـــــ اور مجھے گہری آنکھوں سے گھورتے رہتے ـــــ جیسے وہ میرے ساتھ کوئی زیادتی کرنا چاہتے ہیں اور ان کو کسی نے کس کر باندھ رکھا ہے ـــــ یہ بے بسی کی نفرت میں نے ہمیشہ محسوس کی اور میرے دل میں نہ جانے کیوں بار بار ایک خیال سر اٹھاتا ـــــ واقعی میں پڑھ نہیں سکتی ـــــ کتنا مشکل ہوتا ہے پڑھنا لکھنا ـــــ اور مجھے یاد آتا کہ ماسٹر خالو ہمیشہ کہتے رہتے ہیں ـــــ لڑکیوں کا پڑھنا کس کام کا ـــــ گھر کے کام ـــــ اور گھر کے کام کے ساتھ ہی ـــــ مجھے بڑی بی یا کوئی دوسرا نوکر یاد آجاتا ـــــ اور میں پھر کتابوں کو سمجھنے کا تہیہ کر لیتی ـــــ

اور اس روز تو میرے تلووں کے نیچے سے زمین ہی سرک گئی جب مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کی پڑھائی والے کمرے سے ملحق اندرونی دالان میں ماسٹر خالو کا سامان سجایا جا رہا تھا ـــــ ان کے گھر والے اپنے وطن جا رہے تھے ـــــ پتہ نہیں کیوں اور کیسے ماسٹر خالو ہمارے گھر ہم لوگوں کے مستقل اتالیق بن کر آرہے تھے ـــــ میرا دم گھٹنے لگا ـــــ مجھے یاد آیا انھوں نے کتنی ہی بار میرے سامنے ہی ابا سے میری کیسی غلط غلط شکایتیں کی تھیں ـــــ جن کا اثر ابا کی صرف ایک مسکراہٹ میں نمایاں ہوا تھا ـــــ لیکن میں ـــــ یہ ضرور سوچنے لگی تھی کہ شاید لڑکی ہونا کچھ برا ہوتا ہے ـــــ اور پھر ایک دن میں نے اعلان کر ہی دیا ـــــ مجھے ان سے نہیں پڑھنا ہے ـــــ اور ان کی میرے سامنے یہ پہلی ہار تھی ـــــ کیوں کہ ابا نے فوراً مان لیا ـــــ اور ابا کا یوں مان لینا ہی ماسٹر خالو کے اصولوں کی قربانی تھی ـــــ انھوں نے بار بار ابا کو دھیمے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ لڑکی سرکش ہے ـــــ اسے دبا کر نہ رکھا تو

پچھتانا پڑے گا ـــــ

میری بیٹوں جیسی پرورش اور شاید میرے گھر کا معمولی سا آزادانہ رویّہ ان کے ماحول سے مختلف تھا ـــــ اور وہ اس نئے ماحول کو دیکھ کر جھنجھلا سے گئے تھے ـــــ پھر بھی کوئی بات تھی جس کے سبب وہ گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے ـــــ اور پھر وہ بھیّا سے محبت بھی بے پناہ کرتے تھے ـــــ

ایک روز اچانک پھر میں ماسٹر خالو سے قریب آ گئی ـــــ میں نے دیکھا کہ ان کے دالان میں کچھ بڑے خوب صورت سے لکھے ہوئے کتبے لٹک رہے ہیں ـــــ میں نے ان کی ساری تلخی بھلاتے ہوئے خوش ہو کر پوچھ ہی لیا ـــــ "آپ نے بنایا ہے؟" ـــــ اور ان کی عینک کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں غرور ابھر آیا ـــــ

"ہاں! ـــــ میں نے بنائے ہیں ـــــ سیکھو گی ـــــ؟" اور میں بغیر ان کے خلوص پر شک کئے، بول پڑی ـــــ "جی ہاں! ـــــ آپ ہمیں پھول پتیوں میں لکھنا ضرور سکھا دیجئے!"

وہ مسکرا پڑے تھے ـــــ کیوں؟ ـــــ مجھے نہیں معلوم ـــــ اور پھر میں اکثر شام کو ان کے پاس بیٹھنے لگی تھی ـــــ

ان کی سختی ـــــ ان کا شکائتی انداز ـــــ اور پھر بات بات میں چڑھ جانا ـــــ پتہ نہیں کیوں امّی اور ابّا برداشت کرتے ـــــ اکثر کھانے کے معاملے میں نوکروں اور ان میں کچھ جھگڑے ہوتے ـــــ اور وہ بھی کچھ اس قسم کے کہ دال میں گھی کم ہے ـــــ یا ـــــ سالن میں بوٹیاں ـــــ اور پھر وہ بڑے اعتماد سے امّی کو سمجھاتے ـــــ "ان بدمعاشوں کو نہیں معلوم کہ پڑھانے میں کتنا دماغ خرچ ہوتا ہے ـــــ" اور امّی دبی مسکراہٹ کے ساتھ ان کو یقین دلا دیتیں کہ اب ایسا نہیں ہوگا ـــــ

وہ بھیّا کو بڑے پیار سے باہر گھمانے لے جاتے ـــــ ان سے بے پناہ محبت کرتے ـــــ یہاں تک کہ ان کو بھیّا کا اسکول جانا بھی بار لگتا لیکن ویسے وہ سب کے ساتھ تلخی کا برتاؤ کرتے ـــــ بڑے ہی خود غرض دکھائی دیتے ـــــ

میں سوچتی ـــــ اتنا سخت انسان بھی ہو سکتا ہے ـــــ اور میں بار بار غور کرتی کہ ان کی ساری تلخی ہمارے گھر میں کیوں شکر میں لپیٹ دی جاتی ہے ـــــ؟ ان کے سخت رویئے پر بھیّا بھی کبھی کبھی بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ـــــ "مجھے ان سے نہیں پڑھنا ہے ـــــ"

اور پھر میں دیکھتی ـــــ ماسٹر خالو بے چین ہو جاتے اور بڑے پیار سے بھیّا کو سمجھاتے ـــــ "میاں مجھے تو بس گلاب کا پودا سمجھو ـــــ میرے پھولوں کو توڑ لو ـــــ اور کانٹوں کی پرواہ نہ کرو ـــــ" میں نے یہ بات اکثر دور سے سُنی تھی ـــــ اور پھر مجھے یہ لگا شاید ـــــ یہ بات انھوں نے مجھ سے ہی کہی ہے ـــــ کیوں کہ میں نے ہمیشہ ان کے کانٹوں کو ہی اہمیت دی تھی اور ـــــ وہ مجھ سے دور ہوتے چلے گئے تھے ـــــ یا میں ـــــ ان کے کانٹوں سے اُلجھتی بہت دُور نکل چکی تھی ـــــ ان کو دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھ سے چلّا چلّا کر کہہ رہے ہیں ـــــ تم لڑکی ہو ـــــ تم لڑکی ہو ـــــ اور میں نفرت سے منھ پھیر لیتی ـــــ

اور پھر ـــــ اُس رات دھندلی نیلی روشنی میں کئی روز کے بخار کے بعد جب مجھے ہوش آیا ـــــ تو میرے سرہانے مورت کی طرح ـــــ خاموش ماسٹر خالو کھڑے تھے ـــــ اور ان کی آنکھیں عینک کے پار بھی سوجی سوجی لگ رہی تھیں ـــــ یہ آنکھیں بہت بار میں نے ایسی ہی سوجی دیکھی تھیں ـــــ جب امّی بیمار تھیں ـــــ اور جب بڑی بی زینے سے گر گئی تھیں ـــــ انھوں نے بڑے پیار سے مجھ سے پوچھا تھا ـــــ

"کیسی ہو ـــــ؟"

اور میں انھیں دور سارے محلّے میں بکھرا محسوس کر رہی تھی ـــــ گلاب کی ہلکی پھلکی پنکھڑیاں جیسے فضا میں چھا رہی تھیں ـــــ میرے ماتھے پر پسینہ چھلک آیا ـــــ میں شرمندہ تھی ـــــ

میں نے کبھی ان چھپے ہوئے پھولوں کو نہیں دیکھا تھا ـــــ کبھی ان کی مہک محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ـــــ اور ہمیشہ کانٹوں

میں الجھتی رہی ــــــ

شاید گلاب کی اسی مہک نے ان کی ہر زیادتی ــــــ ہر تلخی کو شکر میں لپیٹ دیا تھا ــــــ جسے ابّا اور امّی نے بڑی احتیاط اور محبّت سے اپنے گھر میں سجا رکھا تھا ــــــ

۱۹۷۳ء

فیصلہ

ہال میں دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی ___ اور آرکسٹرا پورے شباب پر بج رہا تھا ___ جوڑے ایک دوسرے کو تھامے ہولے ہولے آرکسٹرا کی لہروں پر تیر رہے تھے ___ قدم بڑی مشاقی سے تیز اور مدھم دھنوں کا ساتھ دے رہے تھے ___ ساری کے پلّو اور دوپٹوں کے آنچل ہوا میں لہرا رہے تھے۔

آج بھی زاہدہ کا پارٹنر رشید ہی تھا ___

اُسے کلب آئے ہوئے پورا ایک سال ہو چکا تھا ___ شروع شروع میں تو وہ محض کافی پی کر گپ شپ میں ہی وقت گزارتی تھی ___ یا پھر دوسروں کو آرکسٹرا کی دھنوں پر لہراتے دیکھتی رہتی ___ اور پھر ایک دن رشید کے بے حد اصرار پر وہ بھی موسیقی کی لہروں پر تیرنے لگی ___ اور ___ اور ___ جیسے رشید اور زاہدہ کی تو جوڑی ہی بن گئی ___

رشید جو کلب میں مشہور تھا ___ ہر روز نئے پارٹنر کا انتظار کرتا تھا اب وہ صرف زاہدہ کا انتظار کرتا ___ اور ___ ایش ٹرے میں راکھ بھرتا رہتا ___ زاہدہ کو دیکھتے ہی وہ سلگتی ہوئی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیتا۔ اور ہمیشہ کی طرح شکایت کرتا ___

"اب چھ بجے ہیں ___"

زاہدہ مسکرا دیتی ___ "نہیں ___"! اور پھر دونوں کی مسکراہٹیں ٹکرا کر

قوس و قزح کے رنگوں میں تحلیل ہو جاتیں ـــــ

آرکسٹرا دھیما ہو چکا تھا ـــــ ہال میں روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔
اور زاہدہ انجانے سوال کا جواب سوچ رہی تھی ـــــ آج اس نے محسوس کیا تھا کہ ڈانس کے درمیان راشد نے بار بار اس سے کچھ کہنا چاہا تھا ـــــ ہونٹ پھڑ پھڑائے تھے ـــــ آنکھیں جھپکی تھیں ـــــ بظاہر وہ صوفے پر آرام سے بیٹھی تھی ـــــ لیکن اندر ہی اندر ہزاروں بے چینیاں کلبلا رہی تھیں ـــــ ہاں ـــــ یا ـــــ نہیں ـــــ اور پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ بھوری بھوری گہری وادیوں میں وہ بھٹک رہی ہے ـــــ

"ایک بات کہوں ـــــ؟"

اور زاہدہ جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگی ـــــ اس کا دل ایک بار زور سے دھڑکا ـــــ اور پھر ـــــ سناٹا سا ہو گیا ـــــ دور آرکسٹرا کے مدھم سُر اُلجھ رہے تھے ـــــ اور ـــــ پورے ہال میں جیسے سرگوشیاں ہو رہی تھیں ـــــ

"مجھے معلوم ہے ـــــ!"

"تو ـــــ تو ـــــ" راشد نے جلدی جلدی دُہرایا!

"لیکن ......" اور پھر زاہدہ کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا ـــــ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے ـــــ اس نے سامنے میز سے گلاس اُٹھایا، اور ایک سانس میں خالی کر دیا ـــــ

"راشد میری طبیعت خراب ہو رہی ہے ـــــ مجھے اب یہاں سے چلا جانا چاہیئے ـــــ" اور وہ اچانک کھڑی ہو گئی ـــــ راشد نے بہت روکا ـــــ معافی مانگی ـــــ

"شاید میری وجہ سے ......"

"نہیں راشد ـــــ نہیں ـــــ بس یوں ہی دل کچھ گھبرا سا گیا ہے ـــــ"
اور پھر ـــــ وہ آہستہ آہستہ باہر چلی آئی ـــــ راشد اسے گاڑی تک پہنچانے آیا ـــــ اور آرکسٹرا کی آواز دُور تک اس کا پیچھا کرتی رہی ـــــ

زاہدہ آج معمول سے پہلے گھر واپس آگئی تھی ـــــ بُوا کو بے حد تعجب تھا ـــــ زاہدہ کے کمرے میں آتے ہی بوا بھی کمرے میں داخل ہُوئیں۔

"کیا ہوا بٹیا ـــ خیر تو ہے؟"

راشدہ کا اُداس چہرہ دیکھتے ہی وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

"کچھ نہیں ـــ بس سر میں درد تھا چلی آئی ـــ"

"چائے بنا لاؤں؟"

"نہیں!"

بُوا اپنی تسلی کے لئے زاہدہ کا ماتھا ٹٹولنے لگیں ـــ

"کچھ بھی تو نہیں بُوا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔!"

اور پھر بوا سمجھ گئیں ـــ آج بٹیا کو گھر بہت یاد آرہا ہے ـــ وہ مطمئن ہو کر چلی گئیں ـــ

زاہدہ کھڑکی کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گئی ـــ باہر اندھیرے کے بادل منڈلا رہے تھے ـــ برسات کی خنک ہوا کے جھونکے نے جیسے زاھدہ کے ماؤف دماغ میں ہلچل پیدا کر دی ـــ وہ بے چین ہو اُٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ـــ دُور اندھیرے کی گہرائیوں میں اُسکا ماضی مچل رہا تھا ـــ

اسے یہاں آئے ہُوئے تو صرف چار سال ہُوئے تھے ـــ لیکن وہ یہاں کے ماحول میں کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ ہی ہمیشہ ہمیشہ سے اس کی زندگی ہو ـــ بُوا اُس کے ساتھ گھر سے آئی تھیں ـــ اور یہی بُوا ـــ اس کی زندگی کے زم گرم کی ساتھی تھیں ـــ اس کا چھوٹا سا دو کمروں کا فلیٹ ـــ اس کا چھوٹا سا لان ـــ چند پھولوں کے گملے ـــ اور بُوا ـــ یہ ساری چیزیں مل کر اُس کا گھر بناتی تھیں ـــ

یہاں وہ ایک مقامی کالج میں پڑھاتی تھی ـــ اور کالج کیمپس میں ہی اس کا فلیٹ تھا ـــ دھیرے دھیرے اس کی بہت سی دوست بن چکی تھیں ـــ اور ان میں زیادہ تر شام کو کلب جاتی تھیں ـــ زاہدہ بھی

جانے لگی ــــ اور پھر وہاں کی پُرکشش رنگینیاں اسے اچھی لگنے لگیں ــــ قہقہوں اور روشنیوں کے درمیان اس کا چہرہ کھلا رہتا ــــ جیسے اُسے دنیا کا کوئی غم نہ ہو ــــ

آرکسٹرا شروع ہوتا ــــ روشنیاں دھیمی ہوتیں ــــ رنگ بدلتیں۔ اور اس کے پیر ہَولے ہَولے تیرنے لگتے ــــ راشد کی مضبوط باہوں کے سہارے ہال کے فرش پر دھیرے دھیرے اس کے قدم ایک دو تین چار کے دائرے بناتے رہے ــــ جب آرکسٹرا کی دھن تیز ہو جاتی تو اس کے یہ قدم جلدی جلدی گھومنے لگتے ــــ اور یہ آخری اسٹیپ اسے بہت پسند تھے ــــ جیسے کسی قید کو توڑ کر وہ دُور بھاگ رہی ہو ــــ اور اسے آزادی کا احساس اپنے دوش پر دُور اڑائے لے جا رہا ہو ــــ

آرکسٹرا رُکتا ــــ سب ٹیبل بھر جاتیں ــــ کافی اور آئس کریم کے دَور چلتے ــــ کہیں برج ہوتا اور کہیں ٹیبل ٹینس ــــ اور یہ دو گھنٹے منٹوں میں گزر جاتے ــــ کلب سے واپسی پر اسے بُوا انتظار کرتے ملتیں ــــ وہ جلدی جلدی منھ ہاتھ دھوتی اور کھانا کھا کر ــــ اسٹڈی کی میز پر بیٹھ جاتی ــــ

آج وہ اس طرح کلب سے چلی آئی تھی ــــ وہ خود بے چین تھی۔ راشد کیا سوچے گا ــــ اور وہ دور کچھ تلاش کرنے لگی ــــ "نہیں نہیں ــــ میں اب کلب نہیں جاؤں گی ــــ" اس کا سر کُرسی کی بیک پر ٹک گیا ــ اور آنکھیں بند ہو گئیں ــــ

بوا نے کھانے کے لئے بڑ بڑانا شروع کیا ــــ اور زاہدہ نے کھانا اپنے کمرے میں رکھوا کر بڑی مشکل سے بوا کو ٹالا ــــ اور پھر ــــ اس نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا ــــ رات گہری ہو چکی تھی ــــ کھڑکی سے دُور اندھیروں میں اس کی آنکھیں کچھ تلاش کرتی کرتی کہیں بہت دُور ڈوب گئی تھیں ــــ وہ بڑبڑائی ــــ

"نہیں راشد ــــ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہی ہوگا زاہدہ ___ یہی ہوگا ___ زندگی کا راستہ تنہا نہیں کٹ سکے گا ___!" آگے پھیلا ہوا ہاتھ اس نے جھڑک دیا ___ کانوں پر ہاتھ رکھ لئے ___ اور آنکھوں سے جلتا ہوا لاوا امڈ پڑا ___

"میں کیا کروں ___ میں کیا کروں ___ رضا ___ کیا میری محبت صرف دھواں بن کر رہ گئی ہے ___ کیا ٹھنڈے ہوا کے جھونکے برسوں میری زندگی سے لپٹی اس دھند کو مٹا دیں گے ___ رضا ___ وہی ہوا ___ وہی ہوا نا ___ جو تم چاہتے تھے ___ اور ___ جس کا مجھے خوف تھا ___ ہم نے عہد کیا تھا ___ ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہنے کا ___ لیکن تم دور ہو گئے ___ اور ___ اور ___ وہ عہد ___ برسوں بعد ___ جیسے ___ جیسے ___! ٹھنڈی پیار کی چھاؤں میں ___ دھندلا ہو رہا ہے ___

اس نے گھوم کر دیکھا ___ چھوٹی سی میز پر رکھا ___ رضا کا فوٹو ___ اسٹیل کے فریم میں چمک رہا ہے ___ اس کی بڑی بڑی آنکھیں زاہدہ کو گھور رہی تھیں ___ اُس نے اٹھ کر فوٹو اٹھا لیا ___ "رضا ___ تم کتنے اچھے تھے ___ لیکن ___ لیکن ___ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ___!" اس نے فوٹو کھڑکی پر سامنے رکھ لیا ___ اور ___ رضا کی آنکھیں مسکرا اٹھیں ___ جن میں زہر تھا ___ زاہدہ گھبرا گئی ___ میں مجرم ہوں ___ میں مُجرم ہوں رضا ___ ہاں کئی دنوں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دس سال کی جلتی زندگی کو محسوس ضرور کر رہے تھے۔ اُف!

ہم دونوں ایک دُوسرے کو کتنا چاہتے تھے ___ رضا اگر ایک دن بھی مجھ سے نہ ملے تو بے چین رہتا تھا ___ اور میں ___ میری تو دُنیا ہی وہ تھا ___ دونوں کے گھر والے یہ بات جانتے تھے ___ اور کسی کو اعتراض بھی نہ تھا ہم نے مل کر آئندہ زندگی کے خواب بُنے تھے ___ ہم دونوں کتنے مسرور تھے۔ جب وہ بنگلور کے لئے جا رہا تھا ___ واپسی ہی تو ہم لوگوں کی منزل تھی ___

اس کی آنکھیں پھر باہر کی تنہائیوں میں بھٹکنے لگیں ___ شاید کسی کی واپسی پر ___ خوش آمدید کہنے کے لئے ___ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا ___

ـــــ دس سال ـــــ بھیانک دس سال کے دس راکھشس ـــــ نیزوں پر اس کا پیار اٹھائے قہقہے لگا رہے تھے ـــــ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ـــــ

ایک بار اُسے رضا ملا تھا ـــــ حضرت گنج میں وہ مارکیٹ میں جا رہی تھی کہ اس کی اچانک نظر پڑی ـــــ "رضا ـــــ" وہ چونک گئی ـــــ اور پھر وہ جلدی جلدی چل کر دھڑکتے دل سے اس کے پاس بھی پہنچ گئی ـــــ

"رضا ـــــ؟"

اور ـــــ رضا یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا ـــــ

"اب میری طرف سے کوئی اُمید نہ رکھو ـــــ!"

"کیوں ـــــ؟"

یہ "کیوں" فضا میں تحلیل ہو گیا ـــــ رضا دور جا رہا تھا اور پھر زاہدہ واقعی اس سے نااُمید ہو گئی ـــــ

زاہدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ـــــ اس کے ماضی کا ایک ایک نقش داغ بن بن کر ابھر رہا تھا ـــــ اس نے رضا کو بھول لینے کی کوشش کی ـــــ وہ خوش رہنے کی کوشش کرتی ـــــ اور آخر ـــــ وہ عادتاً ہنسنے اور مُسکرانے لگی ـــــ وہ دنیا کے ساتھ ساتھ خود کو بھی دھوکا دے رہی تھی۔ کبھی قہقہوں اور مسکراہٹوں کے درمیان اگر رضا کا خیال آجاتا تو اچانک اسکی ہنسی رک جاتی ـــــ مگر صرف ایک لمحہ کے لئے ـــــ اور پھر زاہدہ اپنے آپ کو دھوکے کی دُنیا میں جھونک دیتی ـــــ اور چاروں طرف قہقہے بکھر جاتے وہ اپنی دوستوں میں پھر چہچہانے لگتی ـــــ کلب، ریڈیو، ڈانس اور سنیما یہی سب اس کی دنیا بن گئے تھے ـــــ

چار سال پہلے جب وہ یہاں آئی تھی تو یادوں کے ساتھ رضا کا فوٹو بھی اس کے کمرے میں آگیا تھا ـــــ اسی رضا کا فوٹو جس نے اسے دُنیا کی ہر خوشی سے محروم کر دیا تھا ـــــ اسی رضا کا جس نے اس کا ہاتھ تھام کر زندگی کا ساگر پار کرنے کا وعدہ کیا تھا ـــــ اور طوفان دیکھتے ہی اس کو منجدھار میں

چھوڑ کر خود ساحل پر جا کھڑا ہوا تھا ــــ اور اس کے کمزور بازو اکیلے اس طوفان کو پار نہ کر سکے ــــ

رضا خوشیوں کا متوالا نارمل زندگی گزار رہا ہے ــــ اس کے دو بچے ہیں ــــ اس کی خوب صورت بیوی بے حد ایڈوانس ہے ــــ یہ سب کچھ اس نے سُنا ــــ اور پھر ــــ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کو تسلّی دینے لگے ــــ اس کے سینے کی جلن کم ہونے لگی ــــ اس نے بھی کلب میں زندگی کی مسکراہٹیں جو محض لمحوں میں قید تھیں اپنا لیں۔

ــــ اور ــــ اور ــــ اَب ــــ جب راشد نے اسے ہاتھ بڑھا کر سہارا دینا چاہا تو ــــ تو وہ ڈر گئی ــــ خوف سے کانپ اٹھی ــــ اس کی وفا ــــ اس کے وعدے ــــ اس کا عہد ــــ اُف ــــ

اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چھلک اُٹھے ــــ اس کا ضمیر ــــ لیکن ــــ لیکن ــــ وفا ــــ بے وفائی ــــ زندگی ــــ روشنی ــــ موت ــــ یہ سب کچھ اس کے سامنے منتشر تھے ــــ اس کا حلق سوکھ رہا تھا ــــ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے ــــ وہ اُٹھی ــــ صراحی کی طرف بڑھی ــــ اندھیرے میں ہاتھوں سے ٹٹولتی ہوئی ــــ اور اس کی ہی ٹھوکر سے چھوٹی میز کھڑبڑا کر گری ــــ اس نے گھبرا کر جلدی سے کمرے میں لائٹ کر دی ــــ اُف ــــ

سامنے فرش پر میز اُلٹی پڑی تھی ــــ اور اسٹیل کے فریم پر سیکڑوں دھاریاں اُبھر چکی تھیں ــــ چور نظروں سے زاہدہ نے فریم کی طرف دیکھا ــــ اور ــــ اسے اُٹھائے بغیر وہ صراحی کی طرف بڑھ گئی۔ ٹھنڈے پانی کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے جیسے اُسے نئی زندگی دے دی تھی ــــ

۱۹۶۴ء

بی مُغلانی

اِدھر ـــــ اَے اِدھر ـــــ بی بی ـــــ یہ جگہ ہے ـــــ
اے خدا رکھے اِدھر نکل آئیے ـــــ اور اس تڑاقے کی آواز کے ساتھ ہی
میری آنکھ کھل گئی ـــــ نہ معلوم کون سا اسٹیشن ہے ـــــ لیٹے
ہی لیٹے اُوپری برتھ سے ذرا گردن لمبی کر کے نیچے جھانکا ـــــ مچمچاتی سی
دو آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں ـــــ سر پر گول ٹوپی کے ساتھ ٹخنوں تک
لٹکتا ہوا ملگجا سا سفید برقع ـــــ جو پوری طرح دونوں شانوں کے پیچھے جا
چکا تھا ـــــ شاید ٹرین میں داخل ہوتے ہُوئے سخت جدوجہد کرنی پڑی
ہو گی ـــــ جھرّیوں سے مرصّع گول گول نرم اور گورا چہرہ ـــــ ہونٹوں
کے دونوں طرف، باچھوں سے پان بہا پڑ رہا تھا ـــــ کمر ذرا آگے کو جھکی
ہُوئی ـــــ برقعے کے اندر ہی ایک موٹی سی عنابی دُلائی ـــــ جس میں
گہرے ماشی رنگ کی چوڑی گوٹ لگی ہُوئی تھی ـــــ خوب اچھی طرح
چاروں طرف سے لپیٹے ـــــ ایک ہاتھ میں چھوٹی سی بقچی ـــــ اور دُوسرے
میں المونیم کا لوٹا لئے ـــــ وہ مجھے ایسا گھور رہی تھیں جیسے ان کی جگہ
نہ ملنے کے سارے مسائل مجھے گھورتے رہنے سے ایک ایک کر کے غائب
ہو جائیں گے ـــــ میں نے گھبرا کر اپنا چہرہ دُلائی میں چھپا لیا ـــــ
میں صاف سُن رہی تھی کہ نیچے بڑی گھما گھمی ہو رہی ہے ـــــ اور

برابر شور بھی ـــــ اَے ہَے ـــــ مُوا دیکھتا نہیں ـــــ پیر پر جھابہ ڈالے دیتا ہے ـــــ اَے اُوئی ـــــ میں مَری ـــــ خدا غارت کرے ـــــ اے بیگم صاحبہ ـــــ خدا رکھے آپ پیر اُٹھا لیجئے ـــــ کہیں کوئی بکسا دکسا نہ گر جائے مُوا ـــــ یہ نگوڑے رات کے سفر میں ـــــ اے خدا رکھے یہی سب تکلیفیں ہوتی ہیں ـــــ

بیگم صاحبہ کی آواز اتنی ہی کم سُنائی دے رہی تھی جتنی بڑی بی کی زیادہ ـــــ وہ برابر ہائے ویلا مچائے جا رہی تھیں ـــــ اور میں سوچ رہی تھی یہ کمبخت کون سا اسٹیشن ہے جو گاڑی اتنی دیر سے ہلنے کا نام نہیں لیتی ـــــ نہ معلوم کتنا سامان کس طرح نیچے فٹ کیا جا رہا تھا ـــــ آخر کار اللہ اللہ کر کے سیٹی کی آواز سُنائی دی ـــــ اور ـــــ مجھے ذرا تسلی ہُوئی اب قلی سے جھگڑے کی آواز اور بلند ہو گئی تھی ـــــ نہ جانے کتنی بے ایمانیوں اور اسٹیشن پر اسباب کی چوریوں کے الزام قلی پر لگائے جا رہے تھے ـــــ بہر حال کسی نہ کسی طرح بیچارے قلیوں کو رینگتی ٹرین سے اُترنا نصیب ہُوا ـــــ اور کمپارٹمنٹ میں ذرا خاموشی ہُوئی ـــــ ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ پھر پٹاخے دار آواز سُنائی دی ـــــ

"ہائے مولا مشکل کشا علی ـــــ تیرا لاکھ شکر ہے ـــــ کیسی مدد کی ہے تو نے اس وقت نہیں تو ـــــ اَے اِے پیارے میاں، اندر اندر لحاف میں ـــــ ہے ہے ـــــ بڑی ٹھنڈ ہو رہی ہے ـــــ اَے خدا رکھے ـــــ اگر کچھ ہو ہُوا گیا تو سارا مزا کرکرا ہو جائے گا ـــــ دیکھو مُنھ اندھیرے لکھنؤ پہنچو گے ـــــ صبح تڑکے ـــــ توبہ توبہ کتنی سردی ہو گی، اس وقت ـــــ"

اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ کیسے مُسافر ہیں کہ ایک بڑی بی ہی، سب کے حصّے کا بولے جا رہی ہیں ـــــ بیگم صاحبہ کی ہوں ہاں ـــــ یا قلیوں کے سلسلے میں کچھ آواز آئی اور بس ـــــ اور ـــــ یہ ـــــ یہ بکّی نہ جانے کس کل سے چل رہی تھی کہ کسی طرح فل اسٹاپ ہی نہیں ہوتا ـــــ

میرے دِل میں بار بار یہ خواہش جاگتی کہ سَر اُٹھا کر ان لوگوں کا ذرا معائنہ تو کروں جو ابھی ابھی میرے ہمسفر بنے ہیں ــــ لیکن بڑی بی کی چُبھتی ہُوئی نظریں اب بھی میرے چہرے پر رینگ رہی تھیں ــ پھر بھی میں نے ہمّت کی ــ دُلائی کو ذرا نیچے کھسکا دیکھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ بڑی بی جھٹ کھڑی ہو گئیں "اے بی بی ــــ خدا تم کو جیتا رکھے ذرا اپنے پیر تو سمیٹ لیجئے ــــ میں یہ پوٹلی ذرا اوپر رکھ دوں ــــ" یہ بات کچھ ایسے خوشامدانہ اور تحکمانہ انداز سے کہی گئی تھی کہ میں نے اپنے پیر فوراً تھوڑے سمیٹ لئے ــــ یا یہ سمجھئے پیر خود بخود خوف سے سُکڑ گئے ــــ نہ جانے کیسا خوف تھا ــــ حالاں کہ نہایت شریفانہ چہرے کے ساتھ گفتگو کا لہجہ بھی نہایت ہی شائستہ تھا ــــ بس آواز میں نہ جانے کیسی کرختگی تھی ــــ اب میرے پیروں کے پاس ایک باسکٹ رکھی گئی اور اس پر ایک پوٹلی جو بڑی بی کے ہاتھ میں سب سے پہلے میں نے دیکھی تھی ــ اور پھر بڑی بی اپنی عنّابی دلائی کو سنبھال سنبھال کر اپنے چاروں طرف بیٹھی لپیٹ رہی تھیں ــــ اور جب دُلائی خوب اچھی طرح ان کے چاروں طرف منڈھ گئی تو اندر ہی اندر نہ جانے کہاں سے چھپا ہوا بٹوہ نکالا گیا ــــ بٹوہ ابھی کُھلا ہی تھا کہ میرے نیچے والی سیٹ سے ایک گورا تندرست ہاتھ باہر نکلا جس کی کلائی میں بہت سی سونے کی چوڑیاں پھنسی ہُوئی تھیں ــ اور انگلیاں نہ جانے کتنی انگوٹھیوں سے مرصّع تھیں ــــ

"لو یہ پان لو ــــ" بیگم صاحبہ کی آواز تھی ــــ

"اے جیتی رہو بی بی ــــ خوش رہو ــــ خدا مقصد میں کامیابی دے ــــ اے بی بی میں کہتی تھی خدا رکھے چھوٹے حضور کو بھی ساتھ ہی لانا چاہیئے تھا ــــ وہ لوگ بھی دیکھ لیتے ــــ اے ہاں ــــ خدا رکھے ان کی بھی تسلّی ہو جاتی ــــ میری مانیے حضور تو بات پکّی ہی کر لیجئے گا ــ بس ــــ ایسی لڑکی ہے سرکار ــــ چراغ لے کر ڈھونڈئیے تب بھی نہ ملے گی ــ چاند کا ٹکڑا ہے بی بی ــــ چاند کا ــــ بھولی ایسی کہ ہونٹ کھلتے ہی پھول جھڑیں ــــ اور سرکار بولنا تو آتا نہیں چھوٹی بٹیا کو ــــ!

"اے ہوگا ـــــ یہ سب تو میں دیکھ ہی لوں گی ـــــ تم اپنے کام کا پوری طرح خیال رکھنا ـــــ بس حسب نسب کی مجھے فکر ہے ـــــ ہڈی میں ذرا کھوٹ نہ ہو ـــــ"

"ہُنہ ـــــ واہ ری بی بی ـــــ بس حد ہے ـــــ خدا رکھے ـــــ بھلا مجھے کیا پڑی ہے کہ بڑھاپے میں اپنے منھ پر کالکھ پُتواؤں ـــــ اے جانتی ہیں آپ خالص ایرانی نسل ہے ان لوگوں کی سرکار ـــــ لکھنؤ کے رئیسوں میں ہیں۔ نواب ذکن اللہ رکھے ـــــ ایک ہی خاندان ہے۔ بس سارے شہر میں ـــــ اے بی بی خدا رکھے پوتڑوں کے رئیس کہلاتے ہیں ـــــ باپ۔ دادا۔ پرداد۔ بگڑ سگڑ دادا ـــــ سارے کے سارے خدا رکھے اپنے وقتوں کے ایک ہی اشراف تھے ـــــ سرکار ـــــ میں تو اپنے چھوٹے حضور کو بس ایسی دلہن دلاؤں گی چندے آفتاب، چندے ماہتاب کہ سارے شہر میں دھوم مچ جائے ـــــ خدا رکھے بی بی ـــــ میرے بسائے گھروں میں ہمیشہ گھی کے چراغ جلتے ہیں مجھے ایسا ویسا نہ سمجھئے گا سرکار ـــــ مجھے لالچ رتی برابر نہیں ـــــ میں تو سمجھتی ہوں حضور کے اشرافوں میں رذیلوں کا پیوند لگ جائے تو خدا کے یہاں بھی بخشش نہیں ـــــ میں آپ لوگوں کی خدمت تو کرتی ہی ہوں سرکار ـــــ مگر اپنی موت زندگی نہیں بھولتی ـــــ جی رے کام کرتی ہوں اپنے سرکاروں کا کام ہو جائے تو مغلانی کا حق مغلانی کے ہاتھ پر ـــــ نہیں تو سو جوتیاں!"

"اے ہاں مغلانی خوب یاد آیا ـــــ سُنا ہے میر شاکر علی کے گھر کا رشتہ اچھے لوگوں میں نہیں ہوا ـــــ بہو کے خاندان میں کچھ فی ہے" بیگم صاحبہ کی رازدارانہ آواز سُنائی دی ـــــ

اور بی مغلانی نے وہیں سے بات اڑا لی "لو بی بی ـــــ ان کا بھی آپ ذکر لے بیٹھیں ـــــ اے جیسی روح ویسے فرشتے ـــــ" اور پھر بڑے رازدارانہ انداز سے جھک کر آہستہ سے بولیں ـــــ ان کے بگڑ دادا نے کوئی کسبی رکھ چھوڑی تھی ـــــ یہ سب اسی کسبی کی اولادیں ہیں سرکار اے خدا رکھے ان کی ذات بات کا خود کیا ٹھیک جو بہو بنا فی کے ملتی ـــــ"

اور پھر ـــ بہت آہستہ سے ـــ "وہ تو کہیئے میں ہی تھی جو ایسا اشراف خاندان ڈھونڈا ـــ سب جاننے والے تو اشراف ہی سمجھتے ہیں ـــ بس یہاں باپ کی طرف سے نی تھی ـــ اُدھر ماں کی طرف سے ذرا سی نی ہے۔ لیکن بی بی خدا رکھے ایسا امیر گھرانہ ہے کہ چاروں طرف مُن برستا ہے۔ چار اشرفیاں تو انھوں نے دلھن کے دوپٹہ کے کونوں میں باندھ دی تھیں۔ اور پلٹ کر نام تک نہیں لیا ـــ اور خدا رکھے بی بی ـــ مجھے بھی وہ بنارسی جوڑا دیا کہ ایک ہاتھ سے اُٹھاؤ تو کلائی میں موچ آجائے اور اوپر سے دو سو رُوپیہ بی بی ـــ پان کھانے کو ـــ"

"اے نوج ـــ تم دو سو لیئے پھرتی ہو ـــ لو بوی ـــ اے میرے دل کی کرا دو تو دیکھو تم کو کیسا خوش کرتی ہوں ـــ بھئی مجھے کسی ریاست دیاست کی ضرورت نہیں ـــ ہاں چار پیسے والے ضرور ہوں ـــ شہر میں عزت ہو ـــ اور سب سے بڑھ کر تو بس وہی بات جس کو میں بار بار کہتی ہوں ـــ خاندان کی کڑی کڑی جانچ کر لینا ـــ تم خود لکھنؤ کی ہو، اسی لئے تم سے کہتی ہوں ـــ نہیں تو نجّو کی ماں کتنے ہی رشتے لائی ـــ"

"بس بس ـــ بی بی ـــ اس نجو کی ماں کا نام میرے سامنے مت لیجیئے ـــ بھلا وہ اشرافوں کو کیا جانے ـــ ابھی کل تو نہ معلوم ڈیرا ڈیرا گھومتی آکر اس شہر میں بس گئی ـــ دس بچّے اس شہر کے، دس اس شہر کے لگا لئے اور بن گئیں بڑی اشراف کی بچّی ـــ اس قتامہ سے تو چار دن پہلے تک اشراف اپنی بہو بیٹیوں کا پردہ کراتے تھے ـــ اور آپ چلی ہیں اسکی بات لے کر ـــ اے میں واری اپنے چھوٹے حضور پر ـــ سرکار ـــ وہ خاندان ڈھونڈا ہے ـــ وہ خاندان ڈھونڈا ہے کہ بڑے بڑے اشرافوں کی نظریں جُھک جائیں ـــ وہ ـــ اَے وہ مُوئی نجّو کی ماں۔ اس کی کیا مجال کہ ایسے اشرافوں کی ڈیوڑھی میں بھی قدم رکھ سکے ـــ"

"اے بس بس ـــ ہو گا ـــ تم تو نجّو کی ماں کے پیچھے ہی پڑ گئیں، بھلا تمھارے ہوتے ہوئے کسی اور سے یہ کام کوئی کیوں کروانے لگا ـــ

تمھارا تو خاندان پشتوں سے ہم شرفاء کے رشتے ناتے جڑواتا آیا ہے۔"
اور بڑی بی درمیان ہی میں بول پڑیں ــــ
"اور کیا سرکار ــــ خدا رکھے میرے لئے تو ہر ڈیوڑھی ایسے کھلی ہوئی ہے جیسے بچھڑی ماں کی گود ــــ جب پہنچوں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہوں ــــ ذرا کسی کے سامنے میرا نام تو لے دیکھئے سرکار ــــ بڑے بڑے اشرافوں کی بیگمیں میرے سامنے منھ نہیں کھول سکتیں ــــ ابھی وہی لیجئے کل کی بات ــــ بشیر میاں کی بیگم صاحبہ بس ذرا اونچے ہی بولی تھیں کہ بھری محفل میں ان کی ساس نے جھڑک دیا ــــ 'خبردار جو بی مغلانی کے منھ لگیں ــــ ہماری خاندانی خدمت گزار ہیں بی مغلانی ــــ' اور پھر مسکرا کر ــــ کون ہے مائی کی بیٹی جو مغلانی کے منھ آئے ــــ یوں بخیہ ادھیڑوں ــــ یوں بخیہ ادھیڑوں کہ ــــ"
"اے ہوگا ــــ مجھے کیا ــــ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ میرا کام ٹھیک بن جائے ــــ اے ہاں مغلانی بی ــــ سنا ہے تمھارے آباواجداد، ذکن کے آباواجداد کی ڈیوڑھی سے منسلک تھے ــــ؟"
"اے کیا کہتی ہیں بیگم صاحبہ ــــ خدا رکھے ڈیوڑھی ــــ ارے یہ کہیئے سرکار ــــ آپ ہی سب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ــــ کھانا پینا تک تھا" اور اس قسم کی دلچسپ گفتگو سنتے سنتے نہ جانے ٹرین کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی تھی ــــ میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں کہ ضرورت سے میں نیچے اتری۔ ــــ دیکھا ــــ ایک بڑی شاندار ــــ گوری چٹی ــــ موٹی سی خاتون ــــ ــــ زیورات سے لدی ــــ سیٹ پر نیم دراز تھیں ــــ انھوں نے غور سے مجھے دیکھا ــــ دھندلی سی روشنی میں ان کی ناک پر بڑا سا ہیرا اپنے بیش بہا ہونے کا اعلان کر رہا تھا ــــ اور جب میں جا رہی تھی۔ میں نے سنا بڑی بی فرما رہی تھیں ــــ
"بی بی کسی اشراف گھرانے کی لگتی ہیں۔" اور میں مسکراتی ہوئی جب واپس لوٹی تو بی مغلانی نے میرے چاند سے چہرے کے بارے میں فوراً

اعلان کر دیا ــــ

"اے بی بی آپ کہاں تشریف لئے جا رہی ہیں ــــ خدا رکھے" ــــ؟

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ــــ

"لکھنؤ!"

یہ سنتے ہی جیسے وہ چونک پڑیں ــــ اور فوراً بیگم صاحبہ سے مخاطب ہو گئیں ــــ "دیکھا ــــ دیکھا ــــ سرکار میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ یہ بات سوائے کسی اونچے خاندان کے اور کسی میں ہو ہی نہیں سکتی ــــ اے لکھنؤ کے اشرافوں کی کیا بات ہے ــــ خدا رکھے ــــ" اور پھر وہ نظریں جھکائے اپنی گردن ہلاتی رہیں ــــ جیسے لکھنؤ کے نام سے وجد طاری ہو گیا ہو ــــ رات کافی ہو چکی تھی اس لئے میں نے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ کہیں یہ باتوں کا طوفان میری طرف پھر گیا تو ــــ اور میرا دل دھڑک اٹھا ــــ میں خاموشی سے اوپر کی برتھ پر جا کر لیٹ گئی ــــ اور لیٹتے ہی باتیں سننے کی لاکھ کوشش کے باوجود نہ جانے کہاں کھو گئی ــــ

اور جب میری آنکھ کھلی تو کسی بڑے اسٹیشن کا ہنگامہ سامنے تھا ــــ تقریباً پانچ بجے ہوں گے ــــ میں نے فوراً نیچے جھانکا۔ جہاں ایک دم سناٹا تھا ــــ بیگم صاحبہ شاید غسل خانہ گئی ہوئی تھیں ــــ ــــ بڑی بی کے ہاتھوں میں کالے دانوں والی موٹی سی تسبیح تیزی سے گھومے جا رہی تھی ــــ اور پوپلے ہونٹ جلدی جلدی پھڑک رہے تھے ــــ

مجھے شرارت سوجھی ــــ بڑی بی سے نظریں چار ہوتے ہی میرے منہ سے نکلا ــــ

"تسلیم!" ــــ بس پھر کیا تھا ــــ بڑی بی کی دعاؤں سے میرا دم گھٹنے لگا ــــ اور مجھے اس طوفان کو روکنے کے لئے جلدی سے ایک سوال گڑھنا پڑا ــــ "اے بوا ــــ یہ کون بیگم صاحبہ ہیں ــــ؟ کس کی بیگم صاحبہ ــــ؟"

"اے لو ــــ وہ اپنے مجاہد حسین کی بیگم صاحبہ ہیں ــ!" اور پھر چپکے سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگیں۔

ــ "ارے وہی لال کوٹھی والی کی نواسی ــــ اے بی بی وہ میراثن تھیں ــــ لیکن نصیب دیکھئے ــــ نواب شرافت حسین کے گھر لڑا ــــ اور اب ــــ لال کوٹھی والی بیگم کہلاتی ہیں ــ!"

وہ آنکھیں پھاڑے مجھے جلدی جلدی سمجھا رہی تھیں ــــ اور میں ــــ ان کا منھ تک رہی تھی ــــ

اگست ۱۹۶۵ء

بھاگیہ

احاطہ میں کھٹا کھٹ لاٹھیاں چل رہی تھیں ــــ اور گاؤں میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا ــــ عورتیں اپنے دھڑکتے دلوں میں اپنے سہاگ دیوی دیوتاؤں کو سونپ کر رکھشا کے لئے گڑگڑا رہی تھیں ــــ ایک چھوٹی سی ــــ نیم تاریک کوٹھری میں مہوا دبکی ہُوئی تھی ــــ اور اس کا دھیان رگھو میں لگا تھا ــــ وہ اندر ہی اندر کانپ رہی تھی ــــ اس کے جسم کے اعضا جواب دے چکے تھے ــــ لیکن بار بار اس کے ہونٹ ہلتے اور وہ بڑبڑا اٹھتی "بھگوان! ــــ رگھو بھاگ جائے ــــ بھگوان ــــ بھگوان ــــ!" اور اس کی آواز گلے میں رندھ جاتی ــــ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کی دَھارا، اُبل پڑی۔ رگھو، اکیلا ہے ــــ بالکل اکیلا ــــ اور اس کے سامنے خُون میں لتھڑا ہُوا رگھو کا چہرہ یقین دلا رہا تھا ــــ "مہوا ــــ! پریشان مت ہو ــــ ہم جرور ملیں گے ــــ"

"ہاں رگھو ــــ" وہ چیخ پڑی ــــ "بھگوان! میرا رگھو ــــ میرا سہاگ میرا سیندور ــــ" اور اس کے ٹھنڈے ہوتے جسم میں ایک جھٹکا سا لگا ــــ اسے معلوم تھا ــــ بھگوان اس کی مدد نہیں کریں گے ــــ اس نے پاپ کیا ــــ گھور پاپ ــــ سارے گاؤں والوں نے یہی کہا تھا ــــ بھلا گھا سی چاچا کا لڑکا رگھو ــــ جسے وہ رگھو بھیا کہتی تھی ــــ اس کی مانگ میں سیندور کیسے

ڈال سکتا تھا ــــ اور ــــ اور پھر ــــ وہ تو ادھوا سی تھی ــــ اسے کیا حق تھا کہ وہ سیندور کی لالی سے جیون کو رنگین بنا لے ــــ یہ دُوسری بات ہے کہ جب وہ بیوہ ہوئی تھی تو صرف دس سال کی تھی ــــ اس کی بھابی نے اسے کنوئیں کی مینڈ سے کھیلتے ہُوئے بلایا تھا ــــ اور وہ صرف کمر پر ایک چھوٹی سی گھنگھریا پہنے دَوڑی دَوڑی آئی تھی ــــ اور پھر نہ جانے کیوں اس کا دِل دھڑک گیا تھا ــــ آنگن میں کئی عورتیں موجُود تھیں ــــ اس کو بیچ میں بٹھا کر ــــ اس کی چوڑیاں توڑ دی گئیں ــــ اس کی مانگ کو رگڑا گیا ــــ اور پھر ماں اور بھابی منھ ڈھانک کر "ہوں ہوں" کرنے لگیں تھیں ــــ اور ــــ وہ ہنسنے لگی تھی ــــ

"تو بیوہ ہو گئی ری ــــ" کاکی بولی تھی ــــ اور وہ یاد کرنے لگی تھی۔ ــــ بہت دن پہلے جب اس کی بھنوری پڑی تھیں ــــ ایک کالا کالا ــــ دُبلا سا لڑکا ــــ پیلے پیلے کپڑے پہنے ــــ آنکھوں میں موٹا موٹا کاجل لگائے ــــ سر پر بڑا سا بجرہ باندھے ــــ بڑی شان سے اس کے آگے آگے چل رہا تھا ــــ اس کے کاندھے پر پڑی چادر کے کونے میں اس کی چنّی کا کونا بندھا تھا ــــ وہ خود بھی بھاری بھاری گہنے لادے ــــ ریشمی گوٹے والا لہنگا پہنے جو بار بار اس کے پیروں سے اُلجھ رہا تھا ــــ اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی ــــ وہ کبھی اپنے دُولھا کو دیکھتی ــــ اور کبھی قریب کھڑی تماشائی سکھیوں پر نظر ڈالتی ــــ جو بڑی لالچ سے اس کے چمکیلے کپڑے گھور رہی تھیں ــــ اسے یہ بھی یاد آیا ــــ جب پنڈت جی پوتر اگنی پر منتر پڑھ کر گھی میں ڈالتے ــــ تو اگنی ماتا کرودھ میں آ کر لپکنے لگتی تھی ــــ وہ گھومتی رہی تھی ــــ پتہ نہیں کتنے چکر ــــ پھر ــــ پانچ چھ مہینے تک گلے میں چاندی کی موٹی سی ہنسلی اور ہاتھوں میں سہاگ کی چوڑیاں پہنے رہی تھی ــــ اس کی سکھیاں جب اس کے کالے دُولھا کا طعنہ دیتیں تو وہ ہنس کر کہتی ــــ

"بھگ ــــ اب وہ گورا ہو گیا ہے ــــ چٹّا گورا ــــ" پھر ذرا شان سے کہتی "جانتی ہے ــــ وہ بڑا امیر ہے ــــ یہ ــــ یہ دیکھ ــــ کتنی موٹی

ہنسلی ہے میری ـــــ اور ـــــ میرے بیاہ کے کپڑے دیکھے تھے ـــــ؟ اور اس کی سکھیاں بیچ بیچ اس کے دولھا کا کالا بن بھول کر اس کی موٹی سی ہنسلی جو اس کے ننگے بنڈے پر گلے میں بندھی ہوئی دیکھنے لگتیں ـــــ اور اس کے چمکیلے کپڑے یاد کر کے اُسے امیر سمجھنے لگتیں ـــــ

اور پھر ـــــ ایک دن ـــــ جب وہ دوسری سکھیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی ـــــ کنوئیں کی جگت سے بلا کر اس کی بھابھی اور ماں نے اس کی چوڑیاں توڑ دیں ـــــ اس کی ہنسلی اُتار لی ـــــ اور ـــــ اوں، اوں کر کے رونے لگیں ـــــ اُس کو ہنستا دیکھ کر اس کی کاکی نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا ـــــ تو بیوہ ہو گئی رے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اب کیا ہو گئی ـــــ اور اسی ادھیڑ بن میں چپکے سے اپنے ڈھور کھول کر چرانے چلی گئی تھی ـــــ لیکن اس کا دل آج اُچاٹ سا تھا ـــــ پتہ نہیں کیوں وہ ڈر رہی تھی ـــــ ہر آہٹ پر چونک پڑتی ـــــ اس کا ننھا سا دل ـــــ سب کچھ سمجھنے سے قاصر تھا ـــــ لیکن خوف کا احساس وہ شدت سے محسوس کر رہی تھی ـــــ وہ سوچ رہی تھی۔ کاکی نے کیوں اس سے کہا تھا ـــــ تو ودھوا ہو گئی ہے ـــــ ودھوا ـــــ؟ اُس نے سوچا ـــــ اور پھر جلدی سے اپنے سامنے والے میدان میں کھیلتی سکھیوں کے پاس چلی گئی ـــــ ارے سُن تو ـــــ میں ودھوا ہو گئی ـــــ بتا تو ـــــ یہ ودھوا کیسے ہوا جاتا ہے ـــــ؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں ـــــ اور پھر اس کی سکھیاں بھی سوچ میں پڑ گئیں تھیں ـــــ ودھوا کیا ہوتا ہے ـــــ اور کسی کی سمجھ میں جب نہیں آیا تو سب اپنے اپنے ڈھوروں کو سوکھی ٹہنی سے ہانک ہانک کر یکجا کرنے لگیں ـــــ رات میں اس نے اپنی بھابی سے یہی سوال کیا ـــــ بھابی ـــــ! مجھے کیا ہو گیا ہے ـــــ سب گاؤں کے دیکھ کر ہائے ہائے کر رہے تھے۔ اور اس کی بھابی نے بتایا تھا ـــــ "تیرا دولھا مر گیا ہے" ـــــ وہ چُپ تو ہو گئی ـــــ پر، پھر بھی سمجھ نہ سکی کہ جب مرا دولھا ہے ـــــ تو ـــــ ودھوا وہ کیسے ہو گئی ـــــ؟

سال بھر سب۔ جنتی کے بیاہ میں جب اسے منڈپ سے دور ہٹنے کو کہا گیا ـــــ تب اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ کوئی بڑی بات ہے ـــــ ضرور مجھ میں کوئی بُرائی

ہو گئی ہے — تب ہی تو اکیلی میں ہی وہاں سے ہٹائی گئی — چتانا — آمنی — گوری — سب ہی تو وہاں کھڑی دیکھ رہی تھیں — وہ وہاں سے سوچتی ہُوئی چپکے سے اپنے گھر چلی آئی اور اسے کسی نے روکا بھی نہیں — دروازے پر ہی اسے رگھو بھیا مل گیا — جو جانوروں کی ناند میں پانی بھر رہا تھا — اسے چپ چاپ اُداس دیکھ کر اس کی طرف بڑھ آیا — کیا ہو گیا تجھے — مُنھ کیوں لٹکائے ہے —؟ اور مہوہ نے سارا غصہ اسی پر اُتار دیا —

"چپ کا اپنا کام کر — بڑا آیا پوچھنے والا — منھ کیوں لٹکا ہے — اپنا دیکھ —" کہتی ہوئی اندر چلی گئی.

رگھو، مہوا کے چاچا کا لڑکا تھا — سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے. پر کچھ دنوں سے دیورانی، جیٹھانی کے قصے نے گھر تو الگ کر دیئے تھے لیکن آنگن میں صرف دیوار اُٹھی تھی — دونوں کے دروازے ایک ہی احاطہ میں کھلتے تھے — چتنی بڑا بھائی تھا — جس کے دو لڑکے پربھو اور خوشیا تو اپنے گھر دوار کے ہو گئے تھے اور مہوا بغیر گھر دوار کے ہی لٹ چکی تھی — منو چھوٹا تھا — جو مہوہ کے ساتھ جانور چرانے جاتا تھا — مہوہ بے چاری جانور دیکھتی اور وہ غلیل چلاتا یا دُوسرے چرواہوں کے ساتھ کبڈی کھیلتا —

گھاسی چھوٹا بھائی تھا — جس کے صرف دو بیٹے تھے — رگھو، بڑا کوئی چودہ پندرہ سال کا — اور — شنکر، چھوٹا کوئی دس سال کا —

دن گزرتے گئے — اور مہوہ اپنی سونی مانگ اور ننگی کلائیوں کے ساتھ اٹھارہ سال کی ہو گئی — اس کی سکھیاں سیندور بھر بھر کر گودیں بھی بھر چکی تھیں — اور — اور اب وہ جان چکی تھی کہ اس کا جیون کتنا ادھورا ہے — اور — کتنا ادھورا رہے گا — سدا کے لئے — چتا تک — مسکراہٹیں اور خوشیاں اس سے سدا کے لئے چھن چکی تھیں — وہ سوچتی — چمپا کتنی خوش رہتی ہے — چھوٹی سی بات پر بھی وہ زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے — اور — اور وہ چتانا تو نہ جانے کیسی ہو گئی ہے — تین ننگے دھڑنگے کالے کالے بچوں کی ماں ہے — جن کے ہمیشہ ناک بہتی رہتی ہے — پھر

وہ رگھو کے بارے میں سوچنے لگی ـــــــ ڈو گھورتی ہُوئی آنکھیں اس کا ہر سمے پیچھا کیوں کرتی ہیں ـــــــ اب ہر کام کے لئے وہ اسے ہی پکارتا ـــــــ اور ـــــــ چھیڑتا رہتا ـــــــ بات بھابی سے کرتا اور تاکتا رہتا اس کی طرف ـــــــ کبھی مہوہ کی نظر ٹکرا جاتی تو ـــــــ اسے ایک جھٹکا سا لگتا ـــــــ اور ـــــــ سارا بدن سُن سُن کرنے لگتا ـــــــ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ـــــــ کہیں کسی نے دیکھ تو نہیں لیا ـــــــ یہ جھٹکا ـــــــ

اب تو رگھو بھیّا بھی بہت بڑے ہو گئے ہیں ـــــــ خوب چکلی چھاتی نکالی ہے اِس نے ـــــــ پُوری ایک بھینس کا دُودھ پی جاتا ہے ـــــــ پھر بازوؤں کی مچھلیاں کیوں نہ پھڑکیں ـــــــ وہ گورا تو نہیں تھا ـــــــ لیکن کالا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا ـــــــ محنتی اتنا کہ چار بیگھ کھیت ایک دن میں ہی پلٹ کر رکھ دیتا ـــــــ لمبا تڑنگا ـــــــ گلے میں کالے دھاگے میں پروئی کنٹھی اور بازو پر کسا ہُوا تعویذ بالکل پہلوان لگتا ـــــــ

داڑھی منڈی ہُوئی اور مونچھوں کی ایک گہری لکیر ہونٹ پر پھیلی رہتی۔ کام کاج سے فرصت ملتے ہی نہا دھو کر بانسری لے کنئیں کی جگت پر بیٹھ جاتا۔ اور مہوہ انجانے ہی کسی نہ کسی بہانے بار بار باہر آ جاتی ـــــــ کبھی پانی لینے تو کبھی موتی کو روٹی دینے ـــــــ اور اسے دیکھتے ہی رگھو کی سانس جیسے گھٹ جاتی ـــــــ اس کی بانسری کی تان ٹوٹ جاتی ـــــــ اور مہوہ کھٹ سے اندر بھاگ جاتی ـــــــ

ربیع کی فصل کٹ کر کھلیانوں میں آ چکی تھی ـــــــ اور کھیت چٹیل میدان بن چکے تھے ـــــــ کہیں اکّا دکّا بھورے بھورے ٹکڑے نظر آ جاتے ـــــــ جو کھلیانوں میں سانس لینے کو ڈول رہے تھے ـــــــ چیت کی دوپہر تپ رہی تھی۔ رگھو سامنے والے برگد کی موٹی سی جڑ پر بیٹھ گیا ـــــــ اس کا باپ، چاچا، اور سارے کسان کاموں میں لگے تھے ـــــــ مارڈ چلنے والا تھا ـــــــ اور رگھو کا دل دھڑک رہا تھا ـــــــ وہ سوچ رہا تھا ـــــــ اپنے دل کی بات وہ مہوہ سے کیسے کہے ـــــــ یہ تو پرلے ہو جائے گا ـــــــ لیکن اس خوف کے باوجود وہ تڑپ رہا تھا

وہ کہنا چاہتا تھا ـــــ مہوہ ـــــ یہ تیرے سوکھے ہونٹ ـــــ اور ـــــ اُداس چہرہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا ـــــ میں تیرے سوکھے جھاڑیوں جیسے بالوں کے بیچ میں سیندور کا پوتر پھول اُگانا چاہتا ہوں ـــــ تاکہ تیری زندگی میں بھی بہار آسکے ـــــ اسے ایک جھٹکا لگا ـــــ پاپ ـــــ گھور پاپ ـــــ بھائی ہو کر یہ کیا سوچنے لگتا ہے ـــــ اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا ـــــ تاکہ بھائی کا لفظ اس کے اندر سے گر جائے ـــــ کہیں کھو جائے ـــــ اور ـــــ اور یہ رشتہ سدا کے لئے دم توڑ دے ـــــ ہنہہ کہتا ہوا وہ وہاں سے اُٹھ کر باغ کی طرف چلا گیا ـــــ جہاں شاخوں میں کچّے آم جھول رہے تھے ـــــ اور نیچے ہوا سے گری کیریاں بچّے چیار ہے تھے ـــــ وہ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا ـــــ اس کے ذہن پر خوف کے ساتھ ساتھ مہوہ کا ہیولا بھی چمٹا ہوا تھا۔ بھولا بھالا معصومیت سے بھرا چہرہ ـــــ کھلتا ہوا رنگ ـــــ لمبا قد ـــــ کولھے کچھ اُبھرے ہوئے ـــــ پتلی کمر ـــــ بڑی بڑی ہرن جیسی وحشت زدہ معصوم آنکھیں جن پر موٹی موٹی گھری سیاہ بھنویں ـــــ بھرے بھرے بازو ـــــ اور گول گول سونی کلائیاں ـــــ بچپن میں کتنی شوخ تھی ـــــ پھر دھیرے دھیرے اس میں کتنی تبدیلی آگئی تھی ـــــ

مہوہ کو دن میں کسی وقت بھی سانس لینے کی مہلت نہ ملتی ـــــ گھر بھر میں جو بھی اس سے مخاطب ہوتا، کوئی نہ کوئی کام ہی اس کے سپرد کر دیتا ـــــ رگھو دیکھتا ـــــ اور اس کا خون کھول جاتا ـــــ یہ کیسی بے انصافی ہے مہوہ کے ساتھ ـــــ اگر وہ ودھوا ہو گئی ہے تو اس میں اس کا کیا دوش ـــــ پھر اسکی سزا وہ کیوں بندھوا مزدور بن کر بھگت رہی ہے ـــــ رگھو نے کئی بار گھما پھرا کر مہوہ کی دوسری شادی کے بارے میں بات بھی اُٹھائی ـــــ مگر کسی نے دھیان ہی نہ دیا ـــــ سب کو پتہ تھا کہ مہوہ کے دو مضبوط کاندھے اگر اس گھر سے ہٹ گئے تو اس گھر کی چولیں ڈھیلی پڑ جائیں گی ـــــ بھابی فوراً بولتی ـــــ بچاری سے اب بِواہ کون کرے گا ـــــ اس کے تو بھاگیہ ہی ایسے ہیں ـــــ بار بار مہوہ کے بھاگیہ کی سیاہی سُن کر رگھو بھنّا اُٹھتا ـــــ

وہ رشتہ کا سہی تھا تو بڑا بھائی اس لئے اُس کی شادی کی بات اٹھانے کا حقدار تھا ــــ مگر اِدھر جیسے جیسے دِن گزر رہے تھے ــــ ویسے ویسے وہ اپنے اندر مہوہ کے لئے دُوسری ہی جگہ محسوس کرنے لگا تھا ــــ اور اب وہ مہوہ کی شادی کے ذکر سے خود ہی گھبرانے لگا تھا ــــ اس کا دل بیٹھنے لگتا ــــ پہلے اسے مہوہ پر ترس آتا تھا ــــ لیکن اب اس ترس کی شکل کچھ بدل سی گئی تھی ــــ اُس کی نظروں میں ہر وقت مہوہ گھومتی رہتی ــــ اور اس کا دماغ مہوہ کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ــــ اب وہ مہوہ کے کاموں میں کھلے عام ہاتھ بٹانے لگا تھا تڑکے ہی اٹھ کر وہ اپنی ناندوں کے ساتھ مہوہ کے جانوروں کی ناندیں بھی پانی سے بھر دیتا ــــ اور جب مہوہ جلدی جلدی ناندوں میں پانی بھرنے آتی، اور پانی پہلے سے بھرا پاتی تو مُسکرا دیتی ــــ اسے معلوم تھا کہ پانی رگھو کے علاوہ اور کوئی نہیں بھر سکتا ــــ اس کی یہ انجانی خوشی لمحہ بھر کو ہی آتی ــــ اور پھر خود ہی فوراً غائب ہو جاتی ــــ اور جب چارہ کاٹنے کی مشین کی چرچرر کی آواز کے ساتھ ہی رگھو کے گنگنانے کی آواز بردٹھے سے آتی تو اس کے اٹھتے قدم رک سے جاتے ــــ وہ اپنے چھپّر میں سے دیکھتی کتنا اچھا ہے رگھو ــــ میرے لئے کتنی دیا ہے اس کے من میں ــــ وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ــــ کاش رگھو اس کا بھائی نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ یہ خیال آتے ہی اسے لگا ــــ وہ پاپ کر رہی ہے ــــ اس نے بھیا کیلئے ایسا کیوں سوچا ــــ اور وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ــــ کہیں کسی نے اسے یہ پاپ سوچتے دیکھ تو نہیں لیا ــــ

ایک دن جب مُنھ اندھیرے ہی مہوہ اپنے جانوروں کے ناند کے پاس آئی تو ناندیں پانی سے لبریز تھیں ــــ سفید سفید چمکتا موتی جیسا پانی دیکھ کر مُسکرا دی تھی ــــ اس نے سنا قریب سے ہی کسی نے پکارا تھا ــــ مہوا ــــ اور مہوہ جیسے چونک پڑی "کون ہے ــــ رگھو بھیا!" بھیا کا لفظ سُنتے ہی رگھو کے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو ــــ وہ پسینے سے تر ہو گیا ــــ وہ لوٹنے ہی والا تھا کہ دل نے پھر اسے للکارا ــــ ایک ہی جھٹکے میں ہار گیا رگھو ــــ

کیوں نہیں کہتا یہ سبھیا ویا کچھ نہیں ــــ مہوہ ــــ یہ سب ڈھونگ ہے ــــ یہ خیال آتے ہی اس نے حواس اکٹھا کئے اور اس نے مہوا کے کندھے پر ہاتھ رکھدیا۔ جیسے اپنے لڑکھڑاتے پیروں کو سہارا دیا ہو ــــ "مہوہ ــــ! مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے ــــ بہت کچھ کہنا ہے مہوہ ــــ" اور مہوہ کا جیسے دم گھٹ گیا ہو ــــ وہ بولنا چاہتی تھی ــــ مگر ــــ ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے ــــ وہ ہلنا چاہی ــــ مگر اس کے قدم جم گئے تھے ــــ اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں صرف رگھو کا ہاتھ دیکھ رہی تھیں مضبوط ہاتھ جو اس کے شانہ پر ٹکا ہوا تھا ــــ

رگھو پھر بولا ــــ "مہوہ ــــ! جلدی بول ــــ کب بات کریں ــــ دیکھ صبح ہونے والی ہے ــــ روشنی پھیلنے والی ہے ــــ جلدی بول ــــ" اور مہوہ جیسے خواب میں بڑبڑائی ــــ "صبح ــــ روشنی ــــ نہیں ــــ نہیں ــــ"

"اچھا تو سُن ــــ" رگھو جلدی سے بولا ــــ گھورے پر گوبر ڈال کر جلدی سے گھر آجانا ــــ سب کھلیان جا چکے ہوں گے ــــ سمجھی ــــ" کہتا ہوا ــــ اپنے بردھے میں ہو لیا ــــ

رگھو بے چین تھا ــــ اپنے دل کی بات مہوہ سے جلدی سے بتا کر ــــ جواب معلوم کرنا چاہتا تھا ــــ اس نے بھی بار بار مہوہ کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھی تھی جو صرف اس کو دیکھ کر اُبل پڑتی تھی ــــ لیکن بس لمحہ بھر کو ــــ اور پھر وہ سونی جھیل کے مانند ٹھہر جاتیں ــــ جس میں جگہ جگہ کائی جم گئی ہو ــــ رگھو، پورے گھر میں خوش مزاج تھا ــــ سب سے مذاق کرتا ــــ اور ــــ اکثر وہ مہوہ سے بھی سب کے سامنے مذاق کی کوئی بات کر دیتا تو مہوہ جیسے چونک جاتی ــــ وہ مہوہ کے سامنے بھوجی سے مذاق کرتا ــــ دوسروں سے ہنستا کھیلتا تو مہوہ مسکراتی رہتی ــــ اور مہوہ کی یہ مسکراہٹ ــــ جلدی جلدی اُدلتا بدلتا رنگ رگھو کو بہت اچھا لگتا ــــ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ مسکراہٹ سے آگے بڑھتے ہوئے رنگ کو مہوہ منھ پھیر کر چھپا لیتی ــــ اور ــــ جب دوبارہ چہرہ سامنے آتا تو بالکل سپاٹ ــــ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ــــ اور رگھو اس کی یہ تبدیلی دیکھ کر بے چین ہو جاتا ــــ

آج وہ مہوہ سے کیسے سب کچھ کہہ سکے گا ـــــ؟ لیکن ـــــ لیکن ـــــ آج تو اسے ضرور سب کچھ بتانا پڑے گا ـــــ اتنے دنوں سے روز ارادہ کر کے وہ ہار چکا تھا ـــــ اگر اس نے آج بھی نہ بتایا تو باپو گھر کا پور والوں سے اس کی بات پکی کر دے گا ـــــ اور تب ـــــ وہ اپنے بیاہ کو کیسے روک سکے گا ـــــ باپو ـــــ اماں ـــــ سب کو کیسے بتائے گا سب کچھ ـــــ؟

تھورے پر گوبر پھینک کر مہوہ ہاتھ دھو ہی رہی تھی کہ رگھو آ گیا ـ مہوہ کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگی ـــــ اس نے جلدی جلدی ہاتھ دھوئے اور پوچھے بغیر ہی کھڑی ہو گئی ـــــ اس کے پوروں سے قطرہ قطرہ پانی زمین پر ٹپک رہا تھا ـــــ اور اس کی ہمت جواب دے رہی تھی کہ رگھو اس کی حالت کی پرواہ کئے بنا ـــــ اس کے بہت قریب آ کر بولا ـــــ "بیٹھ جا ـــــ بیٹھ جا جلدی ـــــ" مہوہ کا دل دھڑک رہا تھا ـــــ اس کی آنکھیں زمین میں دھنسی جا رہی تھیں ـــــ وہ محسوس کر رہی تھی رگھو اس سے بہت قریب آ گیا ہے ـــــ وہ بیٹھ گئی ـــــ انجانے ہی مشین کے پُرزے کی طرح ـــــ تھوڑی دیر کے لئے تو رگھو بھی حواس گنوا بیٹھا تھا ـــــ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے دل کی بات کس طرح سے کہے ـــــ پھر بھی ہمت کر کے وہ جلدی جلدی بولنے لگا ـــــ "دیکھ مہوا، کیا تجھے سب کی طرح خوش رہنے کو دل نہیں چاہتا ـــــ بھوجی تجھے ستاتی رہتی ہے ـــــ کیا تیرا دل نہیں چاہتا کہ تیرا کوئی اپنا ہو ـــــ جس سے تو شکایت کر سکے ـــــ سب کی طرح جی سکے ـــــ بول مہوہ ـــــ بول ـــــ کیا تیرا دل نہیں چاہتا ـــــ" اور مہوہ کی بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں رگھو کی آنکھوں سے ٹکرا گئیں ـــــ جو اس کے چہرے سے بہت قریب تھیں ـــــ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی ـــــ اس کا سارا جسم پسینے سے تر ہو گیا ـــــ سُرخ چہرے پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے ـ

رگھو جلدی جلدی بول رہا تھا ـــــ "دیکھ مہوا ـــــ میں تجھے ہنستا دیکھنا چاہتا ہوں ـــــ تیری مانگ کا سیندور لوٹانا چاہتا ہوں ـــــ تیری کلائیوں کو سہاگ کی چوڑیوں سے بھر دینا چاہتا ہوں ـــــ بول ـــــ بول مہوہ ـــــ

ساتھ دے گی ـــــ میں تیرے ساتھ ......" بات اتنی ہی ہوئی تھی کہ باہر کھٹکے کی آواز ہوئی ـــــ اور ـــــ رگھو یہ کہتا ہوا چلا گیا ـــــ "رات چاند نکلنے کے بعد احاطے سے باہر تیرے جواب کا انتظار کروں گا ـــــ اگر جواب نہ ملا، تو سورج نکلنے سے پہلے میں گاؤں سے بہت دور چلا جاؤں گا ـــــ سدا کے لئے ـــــ"

تھوڑی دیر تو مہوہ دور بہت دور کہیں کھوئی رہی ـــــ لیکن جب واپس لوٹی تو اندر ہی اندر مسکرا رہی تھی ـــــ اس کے من کے اندر کا بھاری پن جیسے ہلکا ہو گیا تھا ـــــ خوشی اور خوف کا ملا جلا رنگ اس کے چہرے پر صاف نمایاں تھا ـــــ وہ دن بھر اپنے سارے کام مشین کی طرح کرتی رہی ـــــ اور دماغ دور کہیں بھٹکتا رہا ـــــ وہ سوچ رہی تھی کیا جواب دے گی ـــــ؟ اسے کیا جواب دینا چاہئے ـــــ؟ یہ تو پرلے ہو جائے گا ـــــ رام رام ـــــ لیکن ـــــ اگر رگھو چلا گیا ـــــ سدا کے لئے تو اس کے پاس پھر کیا رہ جائے گا ـــــ ایک وہی تو ہے جس کے میٹھے بول اس کی سونی چٹان جیسی زندگی میں کبھی کبھی شادابی پیدا کر دیتے ہیں ـــــ جس کے سہارے وہ رات دن کولھو کے بیل کی طرح چلتی رہتی ہے ـــــ بھابی کے کڑوے بول تک سہہ لیتی ہے ـــــ ماں کے بدنصیبی کے طعنوں کو گھونٹ گھونٹ پی لیتی ہے ـــــ صبح تڑکے ہی اس کی آنکھیں اچانک یہ جاننے کے لئے کھل جاتی ہیں کہ رگھو نے ناندیں بھر دی ہوں گی ـــــ اور وہ مسکراتی ہوئی ناندوں کو جھانکنے لگتی ـــــ رگھو کو اس کا کتنا خیال ہے ـــــ رات کو جب اپنے تھکے ہارے جسم کے ساتھ چارپائی پر پڑتی تو دور سے آتی ہوئی رگھو کی بانسری کی آواز اس کی ساری تھکاوٹ دور کر دیتی ـــــ اور ـــــ وہ تانوں کے ساتھ لہریں لیتی لیتی سو جاتی ـــــ اگر رگھو چلا گیا تو کیا ہوگا ـــــ؟ ـــــ مگر ـــــ مگر ـــــ بیاہ بھی تو کیسے ہو سکتا ہے ـــــ؟ رگھو نے یہ سوچا ہی کیسے ـــــ؟ اور ـــــ اگر سوچا بھی تھا تو اس سے کیوں بتا دیا ـــــ یہ ناممکن ہے ـــــ بالکل ہی ناممکن، برادری ـــــ باپو ـــــ بھیا ـــــ گاؤں والے ـــــ یہ سب سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگا ـــــ اُف ـــــ اب کیا ہوگا ـــــ؟ وہ بیاہ تو ہرگز نہیں کر سکے گی ـــــ کوئی

راضی ہی نہیں ہوگا ___ مگر ___ پھر رگھو چلا جائے گا ___ اور ___ جب وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تو اس نے فیصلہ رگھو پر ہی رکھ دیا ___

آدھی رات کے قریب جب چاند اُونچا ہونے لگا ___ تو مہوہ بیچین ہو گئی اس کا دماغ پھر کسی فیصلہ کا انتظار کرنے لگا ___ وہ ہچکچانے لگی ___ رگھو کے پاس جائے یا نہ جائے ___ مگر ___ پھر رگھو ___ اور اُسے لگا رگھو دُور بہت دُور ___ کہیں کھو گیا ہے ___ اب وہ رگھو کو کبھی نہیں دیکھ سکے گی ___ اب کبھی ہر آہٹ پر کان نہیں لگائے رہے گی ___ وہ اچانک اُٹھی اور جلدی جلدی ___ باہر نکل گئی ___ اس نے دیکھا چاند آسمان پر جھکنے لگا ہے ___ اور احاطہ میں سناٹا ہے ___ وہ خوف زدہ ہو گئی ___ کہیں رگھو چلا تو نہیں گیا ___ اس نے دوبارہ گردن گھما کر احاطے پر نظر دوڑائی ___ وہاں کوئی نہیں تھا ___ اس کے پیر تھر تھرانے لگے ___ وہ کنوئیں کی جگت پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی ___ اس کا سر گھومنے لگا ___ رگھو ضرور ناراض ہو کر چلا گیا ہے ___

اچانک اس نے دیکھا، چھپر میں ایک چنگاری سی چمک گئی ___ وہ سمجھ گئی ___ رگھو ہی ہوگا ___ پھر شک نے سَر ابھارا ___ شاید نہ ہو ___ چنگاری کا دھوکا ہی ہُوا ہو ___ رگھو کھڑا مہوہ کی بے چینی دیکھ رہا تھا ___ اور خوش ہو رہا تھا ___ پھر اس نے سوچا ___ مہوہ سچ مچ پریشان ہو جائے گی ___ وہ چھپر سے باہر آ گیا ___ اس نے بیڑی کا لمبا کش کھینچا اور بیڑی دُور پھینک دی ___ وہ منھ میں دھواں لئے ہُوئے مہوہ کے پاس آ گیا ___ اس نے سارا دھواں مہوہ کے چہرے پر بکھیر دیا ___ وہ بہت خوش تھا ___ مہوہ کا اسوقت یہاں آ جانا ہی اس کے سوال کا جواب تھا ___ اگر مہوہ کو اس سے پریم نہ ہوتا تو وہ کیوں اس کے باہر چلے جانے کے ڈر سے اس وقت یہاں آ جاتی ___ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو بول راضی ہے ___" اور مہوہ اپنی سونی زندگی سے بیزار ہوتے ہوئے صاف ہاں نہ کہہ سکی ___ اس نے آہستہ سے کہا ___

"دیکھ رگھو ___ نتیجہ سوچ لے ___ بُرا ہوگا ___" اور پھر اس کے ہلتے ہوئے

ہونٹ جیسے جم گئے ــــ رگھو نے کہا ــــ "مگر تو بھی تو سوچ ــــ کب تک گزارے گی ایسا جیون ــــ اور پھر میں ــــ میں تو تیرے بنا اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتا ــــ میں نے سب نتیجہ و تجبہ سوچ لیا ہے ــــ جس میں بل ہوگا وہی میرے سامنے آئے گا ــــ پہلے خوشامد کروں گا ــــ منتیں کروں گا ــــ اور جب ضرورت پڑے گی تو دیکھ رہی ہے یہ بازو کس دن کام آئیں گے ــــ مجھ سے تیری یہ زندگی اب نہیں دیکھی جاتی ــــ اور سچ جان تو ــــ اب میں بے بس ہو چکا ہوں تیرے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے میں سب جانتا ہوں ــــ یہ سب کب تک ہوتا رہے گا بول ــــ" اور مہوہ نے بڑی کوشش کے بعد جواب دیا ــــ

"میرا بھاگیہ ہی ایسا ہے ــــ!"

رگھو نے چڑھ کر کہا ــــ "مہوہ! ــــ بھاگیہ ہوتے نہیں، بنا دیئے جاتے ہیں ــــ" اور مہوہ نے سہمتے ہوئے کہا ــــ

"رگھو ــــ میں ودھوا ہوں ــــ تیری بہن لگتی ہوں ــــ کیا تو سمجھتا ہے سماج تیرا کہا مان لے گا ــــ؟ شاستر دل اور ....." رگھو بیچ میں ہی بول پڑا ــــ "اب کون بڑے خوش ہیں دیوتا جو تو ناراض ہونے سے ڈرتی ہے ــــ اس سے بُرا اور کیا ہوگا ــــ"

مہوہ نے ایک بار پھر رگھو کو سمجھانے کی کوشش کی ــــ "دیکھ رگھو ــــ تو اکیلے سب کا مقابلہ نہیں کر سکے گا ــــ ہمارے سماج میں یہ پاپ ہے رگھو۔"

"سماج ــــ پاپ ــــ ارے یہ سب ڈھونگ ہے مہوہ ــــ!" رگھو کو غصہ آرہا تھا ــــ "مہوہ تو کیوں اندھیروں میں بھٹکنا چاہتی ہے ــــ کیوں اتنی خوف زدہ ہے؟"

مہوہ نے آہستہ سے کہا "دیکھ رگھو ــــ جس روشنی کی مجھے آشا نہیں اسے بار بار مجھے کیوں دکھاتا ہے ــــ بھگوان کے لئے ــــ بھگوان کے لئے رگھو ......" اور پھر اس نے اپنی جل تھل آنکھوں کو ساری کے پلّو سے چھپالیا۔

رگھو، ساری کا پلّو ہٹاتے ہوئے بولا ــــ

"مہوہ ــــ! کیا تو نے کبھی نہیں دیکھا، گھور کالے بادلوں میں جب بجلی

چمکتی ہے تو سارا سنسار چمک اُٹھتا ہے ــــ بادل جتنے کالے ہوتے ہیں، ورشا بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے مہوہ ــــ" کہتے کہتے جذبات کی شدّت سے اس کا گلا رُندھ سا گیا ــــ مہوہ اب لاجواب ہو چکی تھی ــــ وہ جان چکی تھی رگھو کو قائل کرنا اس کے بس کا نہیں ــــ اور پھر ــــ اس کے من میں بھی تو کچّا پن تھا ــــ اس نے اپنا سر رگھو کے کندھے پر ٹکا دیا ــــ دُور سے مرغ کی بانگ سُنائی دی ــــ اور مہوہ چونک کر کھڑی ہو گئی ــــ "ارے صبح ہو گئی"

"ہاں صبح ہو رہی ہے ــــ" کہتے ہوئے رگھو بھی کھڑا ہو گیا ــــ اور دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ــــ

صبح ہوئی ــــ سب کام روز کی طرح ہوتے رہے ــــ لیکن آج جتنی بار مہوہ اور رگھو کی نظریں چار ہوتیں ــــ کرنیں پھُوٹ پڑتیں ــــ دونوں مسکرا اُٹھتے ــــ چہروں کا رنگ بدل جاتا ــــ کئی دن گزر گئے ــــ دونوں دن یا رات کے کسی حصّے میں ضرور مل بیٹھتے ــــ مہوہ کا دل اب بھی دھڑکتا ــــ اگر بات پھیل گئی تو ــــ باپو راضی نہ ہوا تو ــــ اور رگھو کہتا ــــ

"اری پگلی ــــ باپو سے کون پوچھے گا ــــ شہر چل کر بیاہ کر لیں گے ــــ یہاں تو تیرا باپو مجھے مار ہی ڈالے گا ــــ اور ......" تو مہوہ جھٹ سے اپنا ہاتھ اس کے منھ پر رکھ دیتی ــــ اور رگھو کی آنکھیں چمک اٹھتیں ــــ وہ مہوا کا ہاتھ اپنے منھ سے ہٹاتے ہُوئے بولتا ــــ ارے میں بھلا مر سکتا ہوں، کہیں مر گیا تو تیری یہ کلائی نہ سونی رہ جائے گی ــــ اور تیری مانگ ــــ" مہوہ پھر ناراض ہو جاتی ــــ بھگوان نہ کرے ــــ"! اور پھر ــــ دونوں خوابوں میں کھو جاتے ــــ مسکرا اُٹھتے ــــ

اچانک ایک رات رگھو نے مہوہ کو بتایا کہ اب اس کو تیار ہو جانا چاہئیے شہر چلنے کے لئے ــــ رگھو نے بھگوان کی مورتی پہ ہاتھ رکھوا کر پنڈت جی سے پُوچھا تھا ــــ کیا ایسا ہو سکتا ہے ــــ؟ پنڈت جی غصّے سے لال ہو گئے تھے وہ قسم کھا چکے تھے ورنہ اس پاپ کی سزا ــــ رام رام ــــ سگے چاچا کی لڑکی، اور وہ بھی ودھوا ــــ پتہ نہیں کیا برے ہو جاتا ــــ پھر رگھو نے اپنی ماں سے

سفارش کی ــــ ماں نے بھی ایسی اَن ہونی کے لئے صاف منع کر دیا ــــ چاچی اور بھابی کو بھی شک ہو گیا تھا ــــ اور ان کے چہرے کچھ سُوج گئے تھے ــــ مہوہ پر ہر وقت نظر رکھی جانے لگی تھی ــــ اب تو رگھو نے سوچ ہی لیا تھا کہ مہوہ کو لے کر شہر جائے بنا کوئی چارہ نہیں ہے ــــ مگر مہوہ لرز گئی تھی ــــ "بھاگ چلوں تیرے ساتھ ــــ ؟"

"ہاں مہوا ــــ اس کے بنا ہم دونوں کبھی نہیں مل سکتے ــــ" اور پھر مہوہ بھی کسی نہ کسی طرح راضی ہو ہی گئی تھی ــــ

تین چار دن بعد آدھی رات میں کھیتوں کی اونچی نیچی مینڈوں سے ہوتے ہُوئے نہر کے کنارے کنارے دو سائے رینگتے دکھائی دیئے ــــ ٹیلیا پر سے آواز بھی آئی "کون ہے رے ــــ ؟" پھر آواز دینے والا یہی سمجھا کہ خربوزے بچانے والے ہوں گے ــــ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اُکتا کر گھومنے لگے ہوں گے ــــ چلتے ہُوئے مہوہ کے پیر کانپ رہے تھے ــــ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا ــــ ایک ایک قدم چلنا دشوار تھا ــــ رگھو نے اس کو سہارا دیا ــــ کچھ دور جا کر وہ لوگ نہر کی ڈھلان سے ہو کر نیچے کھیتوں میں اُتر گئے ــــ اور پھر اُدھر اُدھر سے ہوتے ہُوئے شہر کی طرف جاتی سڑک کے کنارے لگے درختوں کی اوٹ میں جلدی جلدی شہر کی طرف بڑھنے لگے ــــ

صبح ہوتے ہوتے وہ لوگ گاؤں سے بہت دُور پہنچ چکے تھے ــــ سامنے شہر کے اُونچے اُونچے کلس والے مندر نظر آنے لگے تھے ــــ اور دھیرے دھیرے گھنٹوں کی آوازیں نزدیک ہوتی جا رہی تھیں ــــ اور پھر یہ لوگ ایک بڑے سے مندر کے سامنے کھڑے تھے ــــ بہت سے مرد اور عورتیں اندر آ جا رہے تھے ــــ رگھو نے بھی قدم بڑھائے ــــ پھر سوچنے لگا ــــ کہیں پجاری، ہم دونوں کو اس حال میں دیکھ کر شک نہ کرے ــــ مہوہ کے ننگے ہاتھ ــــ وہ لوٹ پڑا ــــ اور پھر کچھ دُور چل کر ایک چھوٹے سے مندر میں چلا گیا ــــ

اکثر خربوزے اور مٹر کی پھلیاں جب وہ شہر لاتا تو نفع کے کچھ پیسے یہاں چڑھا جاتا وہ دونوں مندر میں داخل ہُوئے ــــ اور بھگوان کے چرنوں میں جھک گئے ــــ

سامنے رکھا ہوا دیا ٹمٹما رہا تھا ــــ چندن اور گھی سُلگنے کی خوشبو سے مندر بسا ہُوا تھا ــــ بھگوان کے ماتھے پر لگا گیلا تلک بتا رہا تھا کہ کوئی پُجاری بالکل ابھی عقیدت کے پھُول چڑھا کر گیا ہے ــــ رگھو نے بھگوان کو گواہ بناتے ہوئے اُنکے ماتھے کا گیلا چندن اور سیندور چٹکی سے چھڑا کر مہوہ کی مانگ میں لگا دیا۔ دونوں پھر بھگوان کے چرنوں میں جُھک گئے ــــ مہوہ نے انجانے ہی رگھو کے پیروں کو ہاتھ لگا کر ماتھے سے لگا لیا ــــ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ــــ خوشی کے آنسو ــــ

اور ــــ رگھو، ہاتھ جوڑے بھگوان سے بنتی کر رہا تھا ــــ بھگوان اِس نیّا کو پار لگانے کی شکتی دینا ــــ ہم دونوں کی رکھشا کرنا بھگوان ــــ خوف و خوشی کے ملے جُلے جذبے سے مہوہ کی آنکھیں بھر آئیں ــــ رگھو اب اس کا اپنا تھا ــــ اب اسے کوئی نہیں چھڑا سکتا تھا ــــ بھگوان کے سامنے۔ یہ بندھن بندھا تھا ــــ اس کی نگاہیں اُٹھیں ــــ سامنے بھگوان کی دو چمکتی آنکھیں مسکرا رہی تھیں ــــ اس نے ہاتھ جوڑ کر اپنے سہاگ کی رکھشا کی بنتی کی ــــ اور دونوں مندر کے باہر آ گئے ــــ مہوہ نے ساتھ چلتے رگھو کو سر اُونچا کر کے دیکھا اور مسکرا دی ــــ رگھو بھی مسکرا دیا ــــ مہوہ کے آنسو نکل آئے ــــ خوشی کے آنسو ــــ رگھو نے اس کا بازو تھام لیا ــــ "اب کیوں روتی ہے اب تو تو سہاگن ہے ــــ اب تجھ کو کوئی نہیں رُلا سکے گا۔" اس کی انگلیاں مہوہ کے اُلجھے اُلجھے بالوں کو سُلجھانے لگیں ــــ دونوں بہت تھکے تھے ــــ تھوڑے بُھنے چنے کھا کر مندر کے باہر لگے نل سے پانی پی کر ذرا دم لینے لگے ــــ مہوہ ساری کا پلّو اُٹھا اُٹھا کر بار بار آنسو پونچھ رہی تھی ــــ شاید وہ آج تمام عمر کے آنسو رگھو کے قدموں میں بہا دینا چاہتی تھی ــــ تاکہ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو رہ ہی نہ جائے ــــ کبھی اور بہانے کو۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ایک طرف چل دیئے ــــ مزدوروں کی بستی میں پہنچ کر رگھو سیدھا بھکا کے گھر پہنچا ــــ وہ پچھلے سال سے شہر میں آ کر بس گیا تھا ــــ اور رگھو اس کے گھر ایک بار آ بھی چکا تھا ــــ رگھو اور بھکا

بچپن کے ساتھی تھے ___ بھگّا کو زمین کے جھگڑے اور بڑے بھائی کی بے ایمانی کے سبب شہر میں مزدوری کے لئے آنا پڑ گیا تھا ___ رگھو اور مہوہ کو دیکھ کر پہلے تو بھگّا کچھ سمجھ ہی نہ سکا ___ مگر جب رگھو نے اسے بتایا کہ اس نے مہوہ سے بیاہ کر لیا ہے تو اسے زیادہ تعجب بھی نہیں ہُوا ___ جب وہ گاؤں میں تھا ___ تب ہی سے اُسے معلوم تھا ___ رگھو کی محبّت کبھی نہ کبھی ضرور رنگ لائے گی ___

اور پھر ___ رگھو نے بھی کوشش کر کے ایک کوٹھری اسی محلّے میں کرائے پر لے لی ___ اور خود بھگّا کے ساتھ مزدوری کرنے لگا ___ ایک ہفتہ گزر گیا ___ رگھو شام کو لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا ___ اور وہ خوشی سے جھوم رہا تھا ___ آج تو مہوہ بہت خوش ہوگی ___ اس نے کچھ پیسے بھگّا سے اُدھار لے کر ایک ساری خریدی تھی ___ لال رنگ کی ساری ___ اپنی مہوہ کے لئے ___ اور پھر بھی اس کی جیب میں کچھ روپے پڑے تھے ___ کوٹھری کے سامنے پہنچتے ہی اس نے جلدی سے پکارا ___ "مہوا ___ او مہوا ___ دیکھ تو ....." کوٹھری کا دروازہ کُھلا تھا ___ مگر کوٹھری میں سنّاٹا تھا ___ اس نے اندر جھانکا ___ مہوہ نہیں تھی ___ وہ گھبرا کر چیخا ___ "مہوا ___" قریب ہی کوٹھری سے نکل کر بھگّا سامنے آگیا ___ وہ آج مزدوری پر نہیں گیا تھا ___ اسے بخار ہو رہا تھا ___ بھگّا کو دیکھتے ہی وہ بے قرار ہو گیا ___ "بھگّا ___ بول ___ بول ___ مہوہ کدھر ہے" ___ اور جب بھگّا نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس سے جب لوٹا تھا ___ کوٹھری کھلی دیکھ کر ادھر آگیا ___ تو پڑوسیوں نے بتایا کہ دو گاؤں والے آئے تھے اور مہوہ کو گھسیٹتے ہُوئے لے گئے ___ ان کے چلّانے سے لگ رہا تھا وہ مہوا کے بھائی اور باپ تھے ___ وہ چیختی رہی ___ روتی رہی ___ لیکن ان لوگوں نے ایک نہ سُنی ___" رگھو کے پیروں تلے سے زمین سرکتی معلوم ہُوئی ___ اس کے ہاتھوں سے بنڈل اسی جگہ گر گیا ___ اور وہ گاؤں کی طرف بھاگا ___

بھگّا نے بہت سمجھایا کہ جب بیاہ ہو گیا ہے تو پولیس کے ذریعہ وہ مہوہ کو ___

لاسکتا ہے ـــ ایسے میں اس کا اکیلے جانا ٹھیک نہیں ہے ـــ" مگر رگھو جیسے بہرہ ہو گیا تھا ـــ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا ـــ لاوا اندر ہی اندر کھول رہا تھا ـــ اس کے منھ سے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے ـــ "نہیں بھکّا' میں ضرور جاؤں گا ـــ پتہ نہیں میری مہوہ کا کیا ہو ـــ" اور یہ کہتے کہتے چھ فٹ کا مضبوط انسان بلبلا کر رونے لگا ـــ پھر بھکّا کی ہمّت نہیں پڑی کہ اُسے منع کرے ـــ

صُبح ہوتے ہی وہ گاؤں پہنچ گیا تھا ـــ وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر میں گھس گیا ـــ ماں سے لپٹ کر رونے لگا ـــ ماں! بتا مہوہ کہاں ہے؟ اور اس سے پہلے کہ ماں کچھ جواب دے ـــ برجھو اپنی لال آنکھیں نکالے ہُوئے آگیا ـــ چنتئ کاکا بھی آگئے تھے ـــ پر خاموش ـــ رگھو نے کسی کی پرواہ نہیں کی ـــ وہ مہوا کے دروازے کی طرف بھاگا ـــ "مہوہ ـــ او مہوا" تب ہی برجھو نے للکارا ـــ "کہاں جاتا ہے دُگا باج ـــ" اور مہوہ اپنے رگھو کی آواز سُنتے ہی کوٹھری سے باہر نکل آئی ـــ اس نے دیکھا ـــ دروازے پر برجھو کھڑا ہے ـــ اور اندر دوسری طرف سے منّو گنڈاسا لئے باہر جا رہا ہے ـــ وہ چیخ پڑی ـــ "نہیں منّو ـــ نہیں ـــ مجھے مار ڈال مجھے ـــ

اب رگھو اور برجھو دونوں آپس میں گُتھ چکے تھے ـــ رگھو غصّہ سے چیخا ـــ "چور ـــ عورتوں کی طرح احاطہ میں گھیر کر لڑ رہے ہو ـــ باہر چلو فیصلہ ہو جائے ـــ مگر میری مہوہ کو کوئی ہاتھ نہ لگائے ـــ وہ میری ہے میری ـــ بھگوان ساکشی ہے ـــ وہ میری ہے برجھو ـــ" اور مہوہ کا نام سُنتے ہی جیسے برجھو کو بچھو نے ڈنک مار دیا ہو ـــ وہ رگھو کو گردن سے پکڑ کر چیخنے لگا ـــ

"مہوہ کا نام لیا تو زبان کھینچ لوں گا ـــ چل باہر ـــ تیری تو آج کھٹیا نکالوں گا ـــ رگھو ـــ" برجھو سے اپنے کو بچاتے ہوئے پھر گھر کے اندر بھاگا ـــ سامنے مہوہ زمین پر بے ہوش پڑی تھی ـــ بھوجی اور کاکی اسے کوٹھری کی طرف گھسیٹ رہی تھیں ـــ یہ دیکھتے ہی رگھو کا سارا جوش

ٹھنڈا پڑ گیا ___ اس کی ساری اکڑ ختم ہو گئی ___ وہ گڑگڑانے لگا ___ "پربھو بھیا میں تیرے ہاتھ جوڑ دوں ___ مجھے اندر جانے دے ___ دیکھ بھیا مہوہ مر جائے گی ___ پھر تم مجھے مار لینا ___ جو چاہے کر لینا ___" وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ پربھو کا بھرپور گھونسا اس کے منھ پر پڑا ___ اور پھر وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ "اچھا تو طاقت دیکھو گے ___" رگھو کے آئے ہوئے آنسو غصّے میں جھلس گئے ___ اس نے پربھو کو پھر للکارا۔

"نکال لا لاٹھی ___ اور بُلا لے اپنوں کو ___" کہتا ہوا گھر میں گھُس گیا ___ چکی والے کونے میں چمکتی لاٹھیوں کے جھنڈ میں سے اس نے ایک لاٹھی گھسیٹی اور باہر نکل آیا ___ اس کا جوان خون گردش کر رہا تھا ___ پربھو اور منو بھی لاٹھیاں لئے تیار تھے ___ دونوں ہی احاطے سے باہر بھاگے اور لاٹھیوں کی آوازیں آنے لگیں ___ کھٹا کھٹ ___

کوٹھری میں مہوہ کو ہوش آ چکا تھا ___ اس کی ماں لٹیا میں پانی لئے اس کے سرہانے بیٹھی تھی ___ ہوش آتے ہی اس کے کانوں میں شور کے ساتھ لاٹھیوں کی آواز بھی گونجنے لگی ___ اسے محسوس ہوا ___ وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہے ___ اس کے اندر کا لاوہ ابل پڑا ہے ___ بھگوان ___ بھگوان ___ رگھو کی رکھشا کرنا ___ بھگوان ___ رگھو لڑتے لڑتے بھاگ جائے ___" وہ منّتیں کرنے لگی ___ "ماں بچا لے رگھو کو ___ پربھو بھیا کو بتا دے میں خود گئی تھی اس کے ساتھ ___ میرے پران لے لیں ___ پر ___ رگھو ___" اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا اُبل پڑی ___

اچانک اسے شور کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں بھی سُنائی دیں ___ وہ چونک پڑی ___ دروازے کی طرف بھاگتی ہوئی زور سے چِلّائی ___ "رگھو" ___ اور کوٹھری کے بند دروازے سے سر ٹکرانے لگی ___ ماں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا ___ مہوہ کا سارا سر خون سے تر ہو گیا تھا ___ کئی لال دھاریاں اس کے چہرے پر بہہ رہی تھیں ___ دروازہ

کھلتے ہی وہ پاگلوں کی طرح احاطے کی طرف بھاگی ـــــ احاطہ میں جیسے سارا گاؤں سما گیا تھا ـــــ وہ بھیڑ کو چیرتی ہوئی بیچ میں پہنچ گئی تھی ـــــ جہاں اس کا لمبا تڑنگا ـــــ بھرے بھرے بازوؤں والا رگھو، خون میں لتھڑا ہوا پڑا تھا ـــــ کاکی اور دوسری عورتیں بے تحاشہ چلّا چلّا کر رو رہی تھیں ـــــ وہ چیخ کر رگھو کے قریب زمین پر سر پٹخنے لگی ـــــ کئی عورتوں نے اسے پکڑنا چاہا، لیکن بے سود ـــــ وہ زمین پر بے سُدھ ہو کر گر چکی تھی ـــــ اس کے سَر سے خون کی دھارا اُبل رہی تھی ـــــ اور زمین پر رینگتی ہوئی اس کالے سے جمے جمے خون میں ـــــ مل گئی ـــــ جو رگھو کے آس پاس پھیلا ہوا تھا ـــــ

اکتوبر ۱۹۶۰ء

رشتے اور فاصلے

ذکیہ نے بے چینی سے دو چار کروٹیں لیں ــــ نرم بستر میں دھنسی ذکیہ کے جسم میں جیسے چاروں طرف سے کانٹے چُبھ گئے ہوں ــــ مہین مہین سوئیاں اس کے روئیں روئیں میں پیوست ہو رہی تھیں ــــ اور وہ مہابھارت کے بھیشم کی طرح محض تیروں کے لپلپاتے پھلوں پر اٹک کر رہ گئی تھی ــــ دُور گھٹنوں چلتا بچپن اس کا منھ چڑھا رہا تھا ــــ گھیر دار فراک ــــ بجیہ ــــ اماں ــــ ابّا ــــ بھیّا ــــ سب ہی تو تھے ــــ اُس کے مٹک مٹک کر چلنے پر آسمان سے ٹکرانے والے قہقہے اُٹھتے ــــ اور موٹی موٹی چھتوں سے ٹکرا نیچے ہی نیچے کمروں اور صحن تک پھیل جاتے ــــ پگھل جاتے ــــ

حلق میں کانٹے سے چبھ گئے ــــ یہ کانٹے کہیں باہر سے نہیں یادوں کی گہری تہوں سے آہستہ آہستہ اُبھرے ــــ اور حلق میں جال سا بنتا گیا ــــ

زندگی کتنی تنہا ــــ کتنی اکیلی ہے ــــ بُوا ــــ بوڑھی سی بُوا ــــ کمرے ــــ گدے ــــ صوفے ــــ قالین ــــ گلدان ــــ مختلف پینٹنگس اور ــــ اور پرانی امبیسڈر گاڑی ــــ کتنی بے جان ــــ کتنی بے آواز ہیں یہ سب ــــ

اس کے کانوں میں گھنگھرو بج اُٹھے ــــ شور و غل سے گھر کا کونا کونا

گونج رہا تھا ـــــ سب ہی اسکول جانے کی جلدی میں تھے ـــــ بجیہ ـــــ بھیّا ـــــ شکو ـــــ اور میں ـــــ ایک ہلچل سی مچی ہے ـــــ میرا موزہ ـــــ میری ٹیونک ـــــ اوہو ـــــ جوتا تو بالکل گندہ ہے ـــــ اور میں ـــــ میں تو بس رو ہی دی ـــــ میرا پسٹل کلر کا ڈبہ بھیّا نے توڑ دیا تھا ـــــ اور بھیّا کی پرکار شکو نے نہ جانے کہاں ڈال دی تھی ـــــ اماں بے حد ناراض ہو رہی تھیں ـــــ اُف! خدایا بچے ہیں کہ طوفان ـــــ کسی کی کوئی چیز ٹھکانے پر ملتی ہی نہیں ـــــ لاکھ شام سے سجا سجا کر رکھوں ـــــ میری تو زندگی عذاب کر رکھی ہے انھوں نے ـــــ لیکن اس ڈانٹ کے ساتھ ساتھ میز پر سب کے پسندیدہ ٹفن تیار رکھے ہوتے ـــــ دودھ کے گلاس ـــــ ٹوسٹ ـــــ جام انڈے ـــــ اور اماں کی نظر سب پر رہتی ـــــ کس نے کون سی چیز نہیں کھائی۔ میرا دُودھ کا گلاس ہمیشہ پکڑا جاتا ـــــ اور اماں جب زبردستی میرے منھ میں گلاس لگا ہی دیتیں تو اچھو ہو جاتا یا پھر کھانسی آجاتی ـــــ

اور اسی گھما گھمی میں نہ جانے کب ابا بھی آجاتے ـــــ بھورے رنگ کا ڈریسنگ گاؤن ـــــ ہاتھ میں دبا ہوا اخبار ـــــ اور ہونٹوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ ـــــ "لاؤ مجھے دو ـــــ ذکو میرے ہاتھ سے پی لے گی۔" اور میں ہنستی ہنستی ان کے گھٹنوں پر چڑھ کر بیٹھ جاتی ـــــ اور گلاس خالی ہو جاتا ـــــ

گود کی گرمی پھر بستر کی نرمی میں کھو گئی ـــــ دُور سے پھٹ پھٹ کی آواز گونجی ـــــ پہرے دار گورکھا ـــــ موٹے سے بانس کو زمین پر پٹخ پٹخ کر اپنے جاگتے رہنے اور گھومتے رہنے کا اعلان کر رہا تھا ـــــ باہر لان میں "بچ بچ" کی تیز آواز گونجی ـــــ شاید کوئی چھچھوندر کمروں میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کر رہی ہو ـــــ بیچاری ـــــ

ذکیہ نے لحاف ٹھیک سے اپنے چاروں طرف لپیٹا ـــــ اور سر کو زور سے جھٹکا دیا ـــــ شاید وہ تمام یادوں کو دُور پھینک دینا چاہتی تھی ـــــ ہلکے نیلے لیمپ کی روشنی میں اسے سامنے ڈریسنگ ٹیبل نظر آئی جس پر قیمتی

کاسمیٹک بکھرا پڑا تھا ـــــ

جانی پہچانی مہک کا ایک جھونکا بہت دُور سے آیا ـــــ اور وہ بھابی کی ڈریسنگ ٹیبل پر جلدی جلدی چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھی ـــــ اتنی ساری لپ اسٹک ـــــ مہکتی خوب صُورت شیشیاں ـــــ اور پھر اس نے نیل پالش سے اپنے ناخن پوتنا شروع کئے ـــــ دُور سے پیروں کی چاپ اسی کی طرف آرہی تھی ـــــ اور اس کا ہاتھ شاید کانپ گیا ـــــ ساری نیل پالش اس کی فیرائل والی سفید فراک پر سینہ سے ہوتی ہوئی سفید سفید دودھ جیسے موزے اور جوتے تک رنگ چکی تھی ـــــ اور پھر بھابی نے اماں سے شکائت کی تھی ـــــ شاید وہ بھابی کو بہت پسند تھی یا یوں ہی ـــــ اور مجھے سمجھایا گیا تھا کہ یہ سب چیزیں بچّے نہیں چھوتے۔ میری آنکھوں میں بھابی کی ڈریسنگ ٹیبل گھوم گئی ـــــ کتنی اچھی اچھی چیزیں ہیں وہاں پر ـــــ گھنٹوں ان کی چیزیں سونگھنے کو دل چاہتا ـــــ عجیب سی مہک تھی ان سب کی ـــــ پیاری سی مہک ـــــ کئی بار تو بھابی میرے لپ اسٹک لگا بھی دیتیں ـــــ اور میں زبان سے چاٹ چاٹ کر ـــــ مہکتی لپ اسٹک تھوڑی دیر میں ہی ختم کر دیتی ـــــ اور پھر افسوس کرتی کاش میرے پاس بھی یہ میز ہوتی ـــــ بڑے سے آئینہ کے ساتھ ـــــ پھر تو مزے تھے ـــــ اور بجیہ کے سینڈل مجھے کتنے پسند تھے ـــــ رنگین لائن سے چپے ہُوئے قسم قسم کے سینڈل ـــــ اور میں ان کے بڑے بڑے سینڈل پیروں میں ڈال کر جب سیڑھیوں پر چلتی تو بجیہ چیخ پڑتیں ـــــ ہائے ہائے ہیل مڑ جائے گی ـــــ میں سینڈل تو اتار دیتی ـــــ لیکن میرے ذہن پر سیکڑوں چیزیں اُبھر آتیں ـــــ ڈریسنگ ٹیبل پر سجی خوب صورت شیشیاں، رنگین طرح طرح کے سینڈل ـــــ بھابی اور اماں کی خوب صُورت ساڑیاں۔ بھابی کے چمک دار جھلملاتے کپڑے ـــــ اور لمحوں میں اُن سب کے برابر ہو کر وہ سب کچھ اپنے جسم پر ناپ ڈالتی ـــــ اور پھر بڑے ہونے کے انتظار میں اپنی گڑیوں کو بکھیر دیتی ـــــ

اس کے ذہن پر ہلکے ہلکے رنگوں کی کچھ دھاریاں اُبھریں ـــــ اور پھر
وہ ساری دھاریاں پھیل پھیل کر اس کے وارڈروب میں لٹک گئیں ـــــ
سُرمئی ـــــ سفید ـــــ خاکی ـــــ ہلکی فیروزی ـــــ بھوری ـــــ اور کئی ایسے
ہی بے نام رنگ اس کے وارڈروب میں سسک پڑے ـــــ وہ خوبصورت
بھابی کے رنگ ـــــ وہ چمکدار جھلملاتے کپڑے ـــــ اور ـــــ اور ـــــ
وہ بھابی والا سُرخ بھاری دوپٹہ ـــــ یہ سارے رنگ اس کی زندگی سے
کسی نے اُڑا لئے تھے ـــــ شاید قوس قزح نے ـــــ اور ـــــ اب ان تک
پہنچنا بے حد مشکل تھا ـــــ بے حد مشکل ـــــ وہ سارے رنگ اس سے
دور جا چکے تھے ـــــ بہت دُور ـــــ

اس نے نہ معلوم کب کالج میں اپنا ہاؤس بدل دیا تھا ـــــ
اور اب وہ نشاط ہاؤس کا سُرخ دوپٹہ بڑے شوق سے اوڑھتی ـــــ اسے
بس یہ یاد ہے کہ ایک بار اسے حلیم ہاؤس کا ہلکا نارنجی دوپٹہ اوڑھنا پڑا
تھا ـــــ سُرخ رنگ کے ساتھ ہی جیسے اس میں اسپورٹ کی نئی ترنگ
جاگ اٹھی تھی ـــــ وہ والی بال میں کالج چیمپئن تھی ـــــ سفید، تنگ
پاجامہ ـــــ سفید قمیص ـــــ سفید موزے ـــــ سفید ہی ٹینس شو ـــــ اور
سُرخ دوپٹہ ـــــ اوس سے بھیگے، ٹھنڈے کورٹ پر جمعہ کے دن، وہ صبح سے
ہی جم جاتی ـــــ جوتے، موزے میں بھی اس کے پیر سردی سے اکڑنے
لگتے ـــــ لیکن میچ ـــــ اور پھر اُس کے ہاؤس پر سب کی نظریں ہوتیں ـــــ
کتنے خوب صورت تھے وہ دن ـــــ رنگین دن ـــــ اور جب چاروں ہاؤس
کے رنگ ـــــ نارنجی ـــــ نیلا ـــــ ہرا ـــــ اور ـــــ لال آپس میں مل جاتے
تو کالج کے دُور تک پھیلے ہوئے لان میں پھول ہی پھول نظر آتے ـــــ
اور پھر پرنسپل کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آگیا ـــــ لحیم شحیم ـــــ خوبصورت
مکھن جیسی سفید پرنسپل کی فرشتوں والی مسکراہٹ ـــــ وہ آج
بڑی خوش تھیں ـــــ انھوں نے ذکیہ کی پیٹھ پر بڑے پیار سے تھپکی دی تھی
آج سالانہ اسپورٹس میں اس نے شہر کی سب سے اسٹرانگ ٹیم کو ہرا دیا تھا

آل لو ـــ ذکیہ بے حد خوش تھی ـــ اور خوشیوں کی اس بلندی پر پہنچ گئی تھی جس سے آگے اور کچھ بھی نہ ہو ـــ

اور اس کے قدموں کو جیسے وقت نے باندھ دیا تھا ـــ وہ آہستہ آہستہ سنبھل کر چلتی ـــ وہ سینئر ٹیچر تھی ـــ لکچرر ـــ ایک پُر وقار پروفیشن ـــ وہ بھاگ کر دو قدم بھی نہیں چل سکتی تھی ـــ وہ آزادی سے بول بھی نہیں سکتی تھی ـــ اس کے قہقہوں کو ایک خانہ میں بند ہونا پڑا تھا' عزت ۔ وقار ۔ بڑائی نہ جانے کس کے خانے میں ـــ

اس نے کروٹ بدل لی ـــ وہ ـــ وہ رات کتنی بھرپور تھی ۔ اس کی کاجل سے بنی مونچھیں دیکھ کر ابّا ـــ اور سارا گھر خوب خوب قہقہے لگا رہا تھا ـــ بھیّا نے بڑے انداز سے کہا تھا ـــ "تو جہاں پناہ میرے لئے کیا انصاف فرمایا آپ نے ـــ" اور ابا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل رہی تھی ـــ ان کی بیٹی آج پھر انعام لے کر آئی تھی ـــ کالج ڈے تھا نا ـــ اور جہانگیر کا کردار ذکیہ نے ادا کیا تھا ـــ سارا گھر بے حد خوش تھا ـــ اور کافی رات تک گھر میں چہل پہل رہی تھی ـــ کتنے لوگ تھے گھر میں ـــ کتنی آوازیں ـــ کتنے قہقہے گونجتے تھے اوپر سے نیچے تک ـــ

بھیانک اندھیرے میں چوکیدار کی وہسل گونجی ـــ اور پھر ـــ کھٹ کھٹ کی آواز دور ہوتی چلی گئی ـــ اور اس کے چاروں طرف خاموشی کے دبیز پردے لپٹ گئے ـــ ہلکا نیلا بلب سسک سسک کر اندھیروں سے زور آزمائی کر رہا تھا ـــ اور اسی کشمکش کو دیکھتے دیکھتے ذکیہ دور ـــ بہت دور پہنچ چکی تھی ـــ جہاں ـــ یادوں کے پردوں پر دن ستاروں کی طرح چمک اٹھتے تھے ـــ یونیورسٹی کی شاہی سرخ عمارت ـــ خوب صورت گنبد ـــ چھوٹی چھوٹی مغلیہ اسٹائل کی برجیاں تارکول سے چمکتی ہوئی سڑکیں ـــ عمارت کے آنگن میں بکھری پڑی تھیں سبزے کے ٹکڑے ـــ جگہ جگہ ہرے قالین ـــ دکھائی دے رہے تھے جامن کے لمبے، چھتادر درخت صدیوں پرانی کہانیاں سنانے کو بیچین کر دیں

بدل رہے تھے ـــــ لائبریری کے سامنے خوب صورت لہریں لیتی ہوئی چھوٹی سی نہر ـــــ اپنے سینہ سے ساری لائبریری کی عمارت چمٹائے ـــــ مسکرا اٹھی درمیان میں چھوٹا سا ننھا سا پل ـــــ اور دور سامنے سرخ بارہ دری کی عمارت ـــــ رینو ـــــ سینی ـــــ اقبال ـــــ رادھا ـــــ رعنا ـــــ قہقہے ـــــ کھلکھلاتی اٹکھیلیاں ـــــ اور ـــــ سنجیدہ اسٹڈی ـــــ چھوٹے بڑے مشاعرے ـــــ سیمنار ـــــ تقریریں ـــــ اور کامن روم کی چھیڑ چھاڑ ـــــ اور واپسی پر شام کو گھر کی بھرپور چہل پہل ـــــ کسی کو کافی چاہیئے کسی کو چائے ـــــ کسی کا ہوم ورک ہے ـــــ تو کہیں نئے ڈیزائن کی قمیص اور کوٹ کے بارے میں بحث ـــــ اور پھر انہیں جھمیلوں میں گھر کے لوگ کم ہونے لگے ـــــ نجمہ اور شکیلہ اپنی اپنی سسرال چلی گئیں ـــــ بھیا اور بھابی بھی دوسرے شہر جا بسے ـــــ اور میں تعلیم کی سیڑھیاں طے کرتے کرتے بہت آگے نکل گئی ـــــ شادی کے لئے شاید کوئی میچ ہی نہ مل سکا ـــــ یا مجھے پسند نہیں آیا ـــــ شاہد ـــــ رضوان ـــــ ساجد ـــــ سب ہی تو چاہتے تھے ـــــ لیکن ـــــ

اور بہت قریب سے گزرتے ہوئے ٹرک کی ڈراؤنی آواز نے جیسے جھنجھوڑ دیا ـــــ اس کا کمرہ ـــــ اس کا پلنگ ـــــ جیسے سب کچھ دہل گیا ـــــ اور ـــــ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں نمی بجھ گئی ـــــ

اندھیرے میں اس کا ہاتھ خلاء میں لہرایا ـــــ جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو ـــــ اور مایوس ہو کر انگلیاں ماتھے کی تنی ہوئی نسوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگیں ـــــ

دس سال سے وہ اس کالج میں ہے ـــــ نہ جانے کتنے چہرے اس کے ذہن پر اپنے نقش چھوڑ گئے ـــــ اس کے طالب علم ـــــ اسکے ساتھی ـــــ اور پھر ہر سال فلم بدل جاتی ـــــ پورے دس سال ـــــ دس ہزار سال ـــــ دس لاکھ سال ـــــ اُف ـــــ اس کی تنہائی ـــــ اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپی اداسی ـــــ

اس نے سُنا تھا ۔۔۔ اس نے بار بار سُنا تھا ۔۔۔ ذکیہ کتنی خوش قسمت ہے ۔۔۔ ذکیہ کتنی خوش قسمت ہے ۔۔۔ وہ سب کے درمیان ہنستی ۔۔۔ اس کے بھانجے ۔۔۔ بھانجی ۔۔۔ بھتیجے ۔۔۔ بھتیجی بہنیں ۔۔۔ ابّا ۔۔۔ امّاں ۔۔۔ رشتہ دار ۔۔۔ سب کے درمیان ذکیہ ہنستی ۔۔۔ قہقہے لگاتی ۔۔۔ اور ان قہقہوں کی گہرائی میں بھیانک اندھیرا لہریں لینے لگتا ۔۔۔ چھٹیاں ختم ہو جاتیں ۔۔۔ اور ذکیہ خالی ہاتھ واپس چلی جاتی ۔۔۔ اپنی ویران دنیا میں ۔۔۔ دُور تنہائیوں میں بھٹکنے کے لئے ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔ ایک ایک خط سے وہ فرمائشوں کو نوٹ کرنے لگتی ۔۔۔ فہرست بنانے لگتی ۔۔۔ سارے رشتہ دار ۔۔۔ بھائی بہن ۔۔۔ ذکیہ سے دُور بہت دُور اپنی اپنی دُنیا میں کھوئے رہتے ۔۔۔ اور ذکیہ اندھیر دل میں ۔۔۔ تاریکیوں میں بھٹکتی رہتی ۔۔۔ جیسے اس نے سب کچھ کہیں کھو دیا ہو ۔۔۔ ایسی دولت جو اس کو ملی بھی نہیں تھی ۔۔۔ جو اس کے خوابوں میں تھی ۔۔۔ محض خوابوں میں ۔۔۔ اور اب وہ تنہائی کے صحرا میں کھڑی چاروں طرف کچھ تلاش کر رہی تھی ۔۔۔ اور بھیانک تنہائی کے دیو اُس سے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں ۔۔۔ تم خوش قسمت ہو ۔۔۔ تمھارے پاس سب کچھ ہے ۔۔۔ تم خوش قسمت ہو ۔۔۔ تمھارے پاس سب کچھ ہے ۔۔۔

اور ذکیہ کے خالی ہاتھ اندھیر دل میں پھر لہرائے ۔۔۔ خلاء میں دُور دُور تک کوئی دوسرا ہاتھ نہیں تھا ۔۔۔ اس نے لحاف پلٹ کر کروٹ بدل لی اس کا دل بے اختیار چاہا ۔۔۔ کوئی تو اس سے پوچھے ۔۔۔ ذکیہ! اتنی رات تک کیوں جاگ رہی ہو ۔۔۔؟ کیوں جاگ رہی ہو ذکیہ ۔۔۔ اور ذکیہ نے لحاف دُور پھینک دیا ۔۔۔ وہ اب کھڑی تھی ۔۔۔ اس نے لائٹ جلائی ۔۔۔ اور بُوا کے کمرے کی طرف اس کے قدم خود بخود اُٹھ گئے۔

۔۔۔ وہ بوا کے قریب گئی ۔۔۔ اور قریب ۔۔۔ اور قریب ۔۔۔ اس نے جھک کر دیکھا ۔۔۔ بُوا لحاف میں گٹھری بنی خرخر کر رہی تھیں ۔۔۔

اور اس کا دل چیخ کر رو اُٹھا ۔۔۔ بوا بھی دُور ہیں ۔۔۔ مجھ سے بہت دُور

____ اور پھر ____ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی ____ میز کے پاس آگئی ____ اب اس کے ہاتھ میں قلم تھا ____ میز کے کونے پر ترتیب سے لگے خطوں میں سے چیزوں کے نام کاغذ پر منتقل ہونے لگے ____ آہستہ آہستہ فہرست آگے بڑھنے لگی ____ ایک ہی مہینہ تو باقی ہے چھٹیوں میں ____ اور تنہائیوں نے چند لمحوں کے لئے دل کی گہرائیوں میں منہ چھپا لیا ____ لیکن ____ لیکن ____ زندگی کی لمبی چوڑی وادی پر ____ دُور اب بھی بادل اُمنڈ رہے تھے ____ گہرے ____ سیاہ ____ سُرمئی ____ اور دھندلے ____

جنوری ۱۹۷۱ء

مٹر پلاؤ

وارڈن نے حامد کی بڑبڑاہٹ سُنی ــــ جو تھوڑی ہی دُور پر سونے کے لئے کروٹیں بدل رہا تھا ــــ "نہ ــــ نہ ــــ بس صاحب ــــ آں ــــ ہاں ہاں ــــ ایک نوالہ ــــ ایک ــــ اے ک ــــ نہ ــــ نہیں ــــ اکنی صرف اکنی ــــ" اور وارڈن کے کان کھڑے ہوئے ــــ "اچھا ــــ سالا بھیک مانگ کر کھا لیتا ہے ــــ یہی کہوں، کمبخت بگراں، دن بھر مارا مارا پھرا کرتا ہے اور سالے مشکل سے رات میں آٹھ آٹھ آنے لا پاتے ہیں ــــ ہونہہ ــــ ٹھہرو سالو ــــ! ملے گا کل سے کھانا ــــ آوارہ ــــ بدمعاش ــــ"

بانس کی چھوٹی سی چارپائی جو اُدوائن نہ ہونے کی وجہ کسی فاقہ مست کا پیٹ معلوم ہو رہی تھی ــ حامد ــــ امجد ــــ اور ــــ نوشہ کو تلے اُوپر اپنے خالی پیٹ میں چھپائے ــــ ان انسانوں کو منھ چڑا رہی تھی جو ان بچوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد رات میں اپنے بھاری جوتوں سے دو چار ٹھوکریں مزید کھلا دیتے تھے ــــ کبھی پیسے چُرانے کا الزام ــــ کبھی کام چوری کا الزام ــــ اس کے علاوہ ان معصوموں کے لئے کوئی اور الزام ممکن ہی نہ تھا ــــ ورنہ وہ بھی انعام دیا جاتا ــــ

بچے کلبلائے ــــ اور چارپائی نے چرچرا کر ان کو اسی طرح پڑا رہنے کی ترغیب دی ــــ حامد پھر بڑبڑایا ــــ "ہوں ــــ ادل ــــ کھانا ــــ"

اور وارڈن کا پارہ اور چڑھ گیا۔

روزانہ یہی ہوتا تھا ــــ کہ صبح ہی صبح نگران ان گیارہ بچوں کو ساتھ لے کر نکل جاتے ــــ کچھ چھپی ہوئی رسید بکیں ــــ تھوڑے سے اشتہار نما گگے سے کاغذ ــــ دو تھیلے ــــ اور یہ گیارہ عدد لڑکے جو آٹھ برس سے لے کر چودہ برس تک کے تھے ــــ دن بھر ادھر ادھر پھرتے رہتے ــــ ہر محلّے میں نگراں سڑک کے کنارے یا کسی چھوٹی سی چائے کی دکان پر یا پھر بجلی کے کھمبے سے لگ کر کھڑے ہو جاتے اور ان چھوٹے بڑے لڑکوں کو ــــ پچیسی کی کوڑیوں کی طرح سارے محلّے میں بکھیر دیتے ــــ اور پھر سوچتے رہتے نہ جانے کتنے چت ہوں اور کتنے پٹ ــــ بچّے دروازوں پر آوازیں لگاتے ــــ ماں جی یتیموں کی سن لیجئے ــــ یتیم خانے سے آئے ہیں سرکار۔ بہن جی یتیموں پر دیا کیجئے ــــ اور جب ان حربوں سے ناامید ہونے لگتے تو اپنی آوازوں میں جن میں موٹی، مہین، توتلی، اور نحیف سب ہی ملی ہوتیں ــــ پوری قوت سے گا اٹھتے ــــ

یتیموں کی فریاد سن لیجئے

ہے پُر درد افسانہ سن لیجئے

ہر گلی میں بچّے دروازوں پر بکھرے ہوتے ــــ اور پوری کوشش کرتے کہ کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے ــــ اکثر خوشامد کرتے کرتے ان کی آنکھیں تک چھلک پڑتیں ــــ یہ سوچ کر ہی اُن کی روح تھرا جاتی کہ اگر پیسے کم لیکر جائیں گے تو رات کو مرغا بننا پڑے گا ــــ اور ڈنڈے الگ ــــ اور پھر رات کو آموختہ بھی تو یاد کرنا ہے ورنہ ــــ کل صبح مولوی صاحب ــــ اور مولوی صاحب کا ڈنڈا جسے اکثر غصّہ میں وہ مولا بخش کہا کرتے تھے یاد آتے ہی اُن کی پتلی پتلی ٹانگیں کانپ اٹھتیں ــــ وہ جلدی کرتے ــــ بہت جلدی ــــ اور بار بار اپنے پیسے گنتے ــــ

یہ یتیم خانہ تھا ــــ اسلامی یتیم خانہ ــــ یہی کوئی پندرہ لڑکے ہوں گے ــــ جن میں کچھ ایسے تھے جو آٹھ دس سال کی عمر میں یہاں داخل

ہُوئے تھے ۔ اور کچھ تو پانچ چھ سال سے بھی کم کے یہاں لائے گئے تھے ۔ ان سب کے رہنے کی جگہ تھی لکھوری اینٹوں کی موٹی موٹی دیواروں والا قلعہ نما مکان ___

ایک وارڈن تھے ___ یعنی افسرِ اعلیٰ ___ ایک نگراں ___ یعنی فوج کا کمانڈر ___ ایک باورچی ___ یعنی اَن داتا ___ ان تین کے علاوہ ان معصوموں پر ظلم کرنے کے لئے ایک اور بھیانک شخصیت تھی ___ چھدری چھدری داڑھی اور ٹھوڑی کی طرف لٹکتی مونچھوں والے مولوی صاحب ___ جن کے گال جتنے پچکے تھے ___ آنکھیں اتنی ہی اُبھری ہُوئی ___ موٹا سا تہبند ___ جس کا رنگ میل سے سیاہ ہو چکا تھا ___ ٹخنوں سے ایک بالشت اُونچا ڈھیلا ڈھالا کُرتا پیروں میں بے رنگ سا پمپ جُوتا ___ ایک ہاتھ میں لمبی سی تسبیح اور دُوسرے میں مولا بخش ___ کندھے پر جھُولتا گندا سا ریشمی بڑا رُومال، جس پر ریشم سے دھاریوں میں کچھ کڑھا ہوا تھا ___ یہی مولوی صاحب اِن بچوں کو دُنیا کے تمام علوم پلانے کے لئے صبح آٹھ بجے سے آ دھمکتے ___ تین گھنٹے تک متواتر کسی کو گالیاں ___ کسی کو ڈنڈا ___ اور کسی کو چانٹا دیتے رہتے ___ کوئی ذہین بچہ اگر جلدی سے سبق یاد کر لیتا ___ اور ڈرتے ڈرتے مولوی صاحب سے کہتا ___ "مولوی صاحب سُن لیجئے ___ میں نے یاد کر لیا ___" یہ سُنتے ہی دُوسرے بچے پر دہاڑتے ہُوئے مولوی صاحب ٹھہر جاتے ___ اور کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہُوئے کہتے ___ "کمبخت ___ جیسے اس کے باپ کا نوکر ہوں ___ جان چاٹے ہیں ___ ابے اتنی جلدی یاد کر لیا ___ اگر نہ یاد ہُوا تو دیکھنا ___" اور ___ ان کی گرج دار آواز اچھے خاصے یاد سبق کو بھی بُھلا دیتی ___ اور ہر بچہ ___ اَٹک اَٹک کر سبق سُناتا اور انعام پاتا ___

ہاں! نگراں صاحب ذرا نرم دل تھے ___ شاید اس لئے کہ بچے سارا سارا دِن ان کے ساتھ ہی رہتے ___ کبھی کبھی اس ننھی سی فوج کو پریڈ کراتے کراتے کسی محلّہ میں ٹھہر کر دو چار آنے کی موم پھلیاں خرید کر دو دو چار چار ___ بانٹ دیتے ___ یا کبھی کبھی کسی بچّے کے کم پیسے پانے پر ڈرتے ڈرتے وارڈن سے سفارش بھی کر دیتے ___ بچّے ان کو منشی جی کہتے تھے ___

اور یہی منشی جی ــــ ان بچوں کے لئے کبھی مہربان ماں اور کبھی شفیق باپ بن جاتے ــــ بالکل دُبلے پتلے ــــ پیلے پیلے ــــ لمبے قد کے آدمی تھے ــــ اپنا بچہ کوئی تھا ہی نہیں اس لئے بڑی بی کے انتقال کے بعد خدمتِ خلق کے خیال سے یہاں آ گئے تھے ــــ یہاں پندرہ روپے مہینہ اور کھانے پر وہ جیسے ٹک گئے تھے۔ کئی بار اس سے اچھی نوکریاں ملیں بھی ــــ لیکن کسی انجانی زنجیر نے جیسے انھیں یہاں جکڑ لیا ہو ــــ دن بھر بیچارے بچّوں کی فوج لئے محلّے محلّے پھرتے ــــ سارے بچّوں کو نظر میں رکھتے ــــ کہیں کوئی بھاگ جائے تو ــــ وارڈن نہ جانے کیا سزا دے ڈالے ــــ بچّے ان سے ڈرنے کے باوجود پیار کرتے تھے ــــ اور حامد، جو ان سارے بچّوں میں سب سے چھوٹا تھا ــــ یہی کوئی آٹھ دس سال کا معصوم سا پھولے پھولے گالوں اور پتلی گردن والا۔ پیلے رنگ کا ــــ ان سے بہت مانوس تھا ــــ اور باتیں بھی دُوسرے بچّوں کی بہ نسبت زیادہ کرتا ــــ

اور جو یہ وارڈن صاحب تھے ــــ یہ ایک پُرانے گھاگ قسم کے کسی نواب صاحب کے مصاحب تھے ــــ اور نواب صاحب اپنے مُنھ چڑھے مصاحب کو یہ کھنڈر قسم کا قلعہ نما مکان دے کر اپنے بیٹے کے پاس لاہور جا چکے تھے ــــ یہ کسی کو نہیں معلوم کہ بتّن صاحب نے نواب صاحب کو کیا پٹّی پڑھائی جو انھوں نے اپنی آخری پُونجی اُنھیں بخش دی ــــ بتّن صاحب کے بال بچّے کہیں دُور رہتے تھے ــــ اور بتّن صاحب نے ایک یتیم خانہ کھول کر قوم کی بہبودی کا بیڑا اٹھا لیا تھا ــــ اور وہ قوم کے سچّے خادم بنے اپنے بال بچّوں کو قوم کی فلاح پر قربان کر کے یہ یتیم خانہ چلا رہے تھے۔

ایک باورچی نوکر تھا ــــ جو فی بچّہ دو چپاتیاں پکا کر گیارہ بجے دے دیتا تھا ــــ اور شام کو تین چپاتی فی بچّہ ــــ اس پر بھی اگر کمبخت کی نیت کبھی خراب ہو جاتی تو آٹے کو ذرا پتلا کر کے اور روٹیاں تھوڑی ہلکی کر کے چار چھ روٹیاں اپنے کسی مہمان کے لئے بھی یہیں سے پکا لے جاتا ــــ

بچّوں کی ساری کمائی یہی بتّن صاحب رکھتے تھے ــــ نگراں کی تنخواہ

پندرہ رُوپے ___ مولوی صاحب کو پانچ رُوپے ___ اور باورچی کو آٹھ رُوپے دینے کے بعد ساری کمائی کے وہ واحد مالک تھے ___ یتیم خانہ کے نام کافی روپیہ ماہانہ کے حساب سے آتا تھا ___ اور پھر سارے بچّوں کی دن بھر کی کمائی ___ آمدنی میں کچھ نہ کچھ تو اضافہ کرتی ہی تھی ___

بچّوں کو کھانا تو بس جیسا تیسا ہی ملتا ___ اور کپڑے بھی واجبی بننے ہر سال جاڑوں میں بتن صاحب دوڑ دھوپ کر کے بڑے لوگوں سے کچھ بڑے چھوٹے کپڑے وصول کر لاتے ___ اور پھر یہ لمبی جانگھیا اور اونچی قمیص نسم کی شکلوں میں بچّوں کے جسموں پر نمودار ہوتے ___ اتفاق سے اگر کبھی گرم کپڑے مل جاتے تو سب سے پہلے بتن صاحب ہی حقدار ہوتے ___ ان کے قابل نہ ہوا تو نگراں صاحب ___ اور اگر خوش قسمتی سے نگراں صاحب نے انکار کر دیا تو توضرور کسی بچّے کے کٹکٹاتے ہوئے دانت ذرا تھم جاتے ___

اس طرح اس یتیم خانہ میں نئے کپڑے بننے کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی ___ ہاں عید بڑی ٹوپیاں ضرور بنوائی جاتی تھیں ___ جو سب ایک ناپ ہونے کی وجہ سے بچوں کے سروں پر مختلف ناپ کی بن جاتیں اور ماتھے سے گدّی تک جھبی رہتیں ___

بیگم صاحبہ میز پر مع بچّوں کے بیٹھی ہی تھیں کہ دروازے سے صدا آئی، یتیموں کی فریاد سُن لیجئے ___ "اف! یہ کمبخت رات کو بھی چین نہیں لیتے"۔ بیگم صاحبہ کسمسائیں ___ "سالوں نے روز گا بنا رکھا ہے ___ روز گا ___" صاحب نے بڑی سی بوٹی منھ میں رکھتے ہُوئے کہا ___ بیگم صاحبہ نے ذرا گردن اونچی کر کے صاحب کی پلیٹ میں جھانکا ___ اے کچھ لیجئے تو ___ کیسے کھا رہے ہیں ___ کہتے ہوئے بیگم صاحبہ ان کی پلیٹ میں دو کبابوں کا اضافہ کر ہی رہی تھیں کہ پھر آواز آئی ___

کسے امّاں کہہ کر پکارا کریں
کسے ابّا کہہ کر بلایا کریں

"اف ___! اس کمبخت نے تو ناک میں دم کر دیا ___" وہ غصہ میں

مڑی ہی تھیں کہ زرینہ کا ہاتھ میز پر ڈھکی قاب سے لگا اور ـــــ تڑاخ کی آواز کے ساتھ سارا مٹر پلاؤ ـــــ زمین پر ـــــ بیگم صاحبہ زور سے چیخیں ـــــ "یہ کمبخت مُردار شاکر کا بچہ اتنے کنارے ٹکا گیا تھا قاب ـــــ اس کی ذات سے اتنا نقصان ہوا ـــــ" بیگم صاحبہ اپنے نوکر پر برس رہی تھیں کہ باہر سے پھر آواز آئی ـــــ "ہاں صاحب کچھ حکم ہو جائے ـــــ" اور صاحب ـــــ بیگم کے بڑبڑانے کی پرواہ کئے بغیر بول پڑے ـــــ "ارے بھئی دیدو کچھ کھانا دانا ـــــ اور ٹالو ـــــ شور مچا رہا ہے ـــــ" ڈانٹنے کے باوجود باہر سے برابر آواز آرہی تھی ـــــ توتلی سی معصوم بھیک مانگنے کی آواز ـــــ

شاکر کو حکم ہوا کہ باورچی خانہ سے نوکروں والی پلیٹ لے آئے ـــــ اور زمین سے پلاؤ اُٹھالے ـــــ اور تھوڑا سا باہر دے آئے ـــــ شاکر کے منھ میں پانی بھر آیا ـــــ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آج اتنا پلاؤ کھانے کو ملے گا ـــــ بوٹیاں بچا کر اس نے چھوٹی سی پلیٹ میں پلاؤ نکالا اور باہر کی طرف چلا ہی تھا کہ زرینہ نے ٹوک دیا ـــــ "تھوڑی بوٹیاں اس میں رکھ لو تمہارے لئے تو بہت ہیں ـــــ

ایک پلیٹ مٹر پلاؤ ـــــ ننھے سے لڑکے کے سامنے تھا ـــــ برآمدے کی ہلکی روشنی میں اس نے دیکھا ـــــ پلاؤ ـــــ اور لمبے لمبے چاولوں کے جال میں سے جھانکتے ہوئے گول گول مٹر ـــــ اور سب سے اوپر رکھی ہوئی بوٹی ـــــ بچّے کا دل، جیسے ٹھہر گیا ـــــ مچل گیا ـــــ اسے یقین نہیں آیا۔ اس کے سامنے اسکے کھانے کے لئے پلاؤ ـــــ اتنا پلاؤ ـــــ پوری پلیٹ ـــــ اسے یاد آیا ابھی کچھ ہی مہینے پہلے اس نے مزے دار پلاؤ کھایا تھا ـــــ کسی کے سیوم میں ـــــ اس نے دوبارہ پلیٹ غور سے دیکھی ـــــ اور ہاتھ آگے بڑھ گیا ـــــ لیکن ایک جھٹکا سا لگا ـــــ اور پھر دل زور زور سے دھڑکنے لگا ـــــ ابھی تو صرف چار آنے ہوئے ہیں۔ پپڑی پڑے ہوئے ہونٹوں پر اس نے زبان پھیری ـــــ دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا جیسے اُچک کر پلاؤ والی پلیٹ میں آجائے گا۔

پلاؤ کی خوشبو دماغ میں بسی جارہی تھی ـــــ اس کا آگے بڑھتا ہوا ہاتھ

ٹھٹھک گیا ــــ "نہیں ــــ نہیں ــــ کھانا نہیں ــــ ہمیں پیسے چاہئیں پیسے،
آنہ ــــ دو آنہ صاحب ــــ"

"ابے لیتا ہے سالے یا دوں لات ــــ" نوکر نے ڈانٹا۔

"نہ ــــ نہیں سرکار ــــ" اور پلاؤ پر چمکتے ہوئے گول گول مٹروں نے جیسے اسے آگے کہنے سے روک دیا ــــ بڑے بڑے ــــ گول گول مٹر کے دانے جیسے دیدے پھاڑے اسے تک رہے ہوں ــــ بہت سارے مٹر ــــ اور پھر اڑتی ہوئی مہک۔

چلّے کے جاڑے پڑ رہے تھے ــــ اور اسے صبح گیارہ بجے صرف دو روٹیاں ملی تھیں ــــ دن بھر پیدل چل چل کر وہ روٹیاں بھی نہ جانے کہاں کھو چکی تھیں ــــ اور اب ــــ اب مٹر پلاؤ اس کے سامنے تھا ــــ مگر جیب میں پڑے تھوڑے سے پیسے اسے اچھی طرح یاد تھے "آج منشی جی اسے کسی طرح نہیں بچا سکیں گے ــــ کیوں کہ اس نے کئی دن سے آٹھ آنے پورے کر کے وارڈن کو نہیں دیئے تھے ــــ اور اس کی نظروں کے سامنے بتن صاحب کا جوتا ناچ گیا ــــ نہ معلوم کتنے جوڑوں سے مرصّع ــــ چمڑے پر چمڑا لگتے لگتے اصل چمڑے کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ لیکن اس آراستگی سے جوتے کا وزن بہت ہو گیا تھا ــــ اسی لئے چوٹ بھی اس سے زیادہ لگتی تھی۔ اور جوتے کا خیال آتے ہی ــــ گول گول چمکتے مٹر کے دانے ایک دم بتن صاحب کے جوتے کی کیلوں میں بدل گئے ــــ اس کو اپنے جسم پر کچھ چبھتا ہوا محسوس ہوا ــــ اور وہ بول اٹھا "سرکار ــــ صاحب ــــ ہمیں پیسے دے دو۔ ــــ ہمیں پیسے دے دو بابوجی ــــ" وہ پیسوں کے لئے خوشامد کر رہا تھا ــــ اور زبان بار بار ــــ ہونٹوں تک آ کر مٹر پلاؤ جھانک جاتی ــــ آنکھیں چاولوں کے اندر دور تک کچھ تلاش کر کے واپس آ جاتیں۔

"اچھا لے ــــ" اور ایک اکنّی بچے کے ہاتھ پر تھی ــــ ننھا سا دل پھر دھڑک گیا ــــ اس نے پلاؤ کو دیکھا ــــ اسے اب پلاؤ نہیں مل سکتا تھا۔ ایک نوالہ بھی نہیں ــــ اس نے پلاؤ بیچ دیا تھا ــــ ایک اکنّی میں۔ اور

اس کی مٹھی کی گرفت ذرا سخت ہو گئی ــــ اس میں اکنی تھی ــــ ایک اکنی جو
شاید اس کو بٹن صاحب کے ظلم سے بچا سکے گی ــــ شاید انھیں خوش کر سکے گی.
اس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے ــــ وہ وہاں سے چل دیا ــــ چوراہے کی طرف
ــــ وہاں بجلی کے کھمبے سے لگے، سردی میں سکڑے ہُوئے نگراں صاحب کھڑے
تھے ــــ سب بچے پہنچ چکے تھے ــــ اور اب صرف حامد کا انتظار تھا ــــ دُور سے
حامد دکھائی دیا ــــ مُردہ قدموں سے اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا ــــ
حامد کے پہنچتے ہی نگراں صاحب بچوں کو لے کر یتیم خانہ کی طرف چل دئیے ــــ
حامد کے سامنے بار بار پلیٹ ناچ جاتی ــــ اگر وہ کل مار نہ کھا چکا ہوتا تو آج پلاؤ
ضرور کھا لیتا ــــ لیکن کل کے جوتے اور تلے میں اُبھری ہوئی کیلوں کا لمس
وہ اب بھی اپنی پیٹھ پر محسوس کر رہا تھا ــــ اسے یاد آیا آج تو اسے سزا
کے طور پر آٹھ آنے سے زیادہ پیسے لانے تھے ــــ یہی کہا تھا صبح بٹن صاحب
نے ــــ اور اس کی جیب میں تو پیسے بہت کم ہیں ــــ اس نے سوچا پیسوں کی
گنتی اتنی مشکل کیوں ہوتی ہے ــــ بڑی مشکل سے آگے بڑھتی ہے ــــ اور
پھر اس نے اپنا سر ایک طرف جھٹک دیا ــــ ہوں ــــ میں کیا کروں ــــ
کل سے تو زیادہ ہی لایا ہوں ــــ اور پھر اس کے سامنے چاولوں میں سے
جھانکتے ہُوئے مٹر چمک اُٹھے ــــ

سب نے پیسے گنوا دئیے ــــ کسی کے کچھ کم تھے اور کسی کے کچھ زیادہ.
کسی کے دو جھاپڑ پڑے اور کسی کے ایک جوتا ــــ حامد کی جان نکل رہی تھی
ــــ یہاں تو روز ہی یہ ہوتا ہے ــــ اور اس کی پیٹھ میں تو کل کا درد ہی ابھی
تک باقی ہے ــــ حامد کی باری آگئی ــــ آئی ہی نہیں بلکہ اس نے خود ہی سے
جلدی بلا لی ــــ پیسے گنتے ہی بٹن صاحب کا ہاتھ اُونچا ہُوا ــــ اور ــــ حامد
کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ــــ تتلیاں ناچ اُٹھیں ــــ اور وہ تلملا کر
زمین پر گر پڑا ــــ دھڑا دھڑ دو چار ہاتھ اور پڑے ــــ نگراں صاحب
جلدی سے بیچ میں آگئے ــــ حامد بلبلا کر چلّا اُٹھا ــــ

خاموش ــــ بدمعاش ــــ نمک حرام ــــ بڑھاؤں بھاؤں ــــ

حرام کا کھلاؤں ــــ جیسے اس کے باپ کا قرض کھایا ہے ــــ چل ہٹ سامنے سے ــــ آج کھانا ــــ کھانا ــــ !!! ــــ اور کھانے کا نام سنتے ہی اس کے ذہن میں پھر مٹر پلاؤ کی تشتری تیر گئی ــــ وہ خاموش سسکیاں لیتا ہوا وہاں سے چلا آیا ــــ اور جھولا سی چارپائی میں گر پڑا ــــ

گھنٹی ہوئی سب لڑکے کھانا کھانے چلے گئے ــــ حامد اکیلا، اونچی چھت والے بڑے سے کمرے میں پڑا رہا ــــ کمرے سے باہر لمبے سے دالان میں دھندلی سی روشنی ہو رہی تھی ــــ اور بچے کھانا کھا رہے تھے ــــ حامد، پڑا سوچ رہا تھا ــــ یہ باپ کا قرضہ کیا ہوتا ہے ــــ ؟ پتہ نہیں کس مزے کا ہوتا ہے ــــ مولوی صاحب بھی یہی کہتے ہیں ــــ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ــــ دو تین سال پہلے وہ یہاں آیا تھا ــــ اسے کچھ کچھ یاد آیا کہ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اس کا باپ اس کی ماں کو مارا کرتا تھا۔ کبھی کبھی بہت مارتا تھا ــــ اتنا کہ اس کی ماں بیمار ہو جاتی تھی ــــ پر، پتہ نہیں پھر ابا کہاں چلے گئے ــــ اور اماں نے نوکری کر لی تھی ــــ گلی کے نکڑ پر اونچے والے مکان میں ــــ اور وہ جو کھانا اپنے ساتھ لاتی تھیں ــــ اس میں کبھی کبھی پلاؤ بھی ہوتا تھا ــــ اور وہ دونوں وقت ماں کی واپسی کا انتظار کیا کرتا تھا ــــ ماں کے آتے ہی وہ گندے سے کپڑے میں بندھا ہوا کھانا چھیننے لگتا ــــ پتہ نہیں ماں آج کیا لائی ہے ــــ ؟ اسے پلاؤ بہت اچھا لگتا تھا ــــ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کبھی کبھی پلاؤ میں چمکتے ہوئے مٹر کے دانے بھی ہوتے تھے ــــ اور وہ ہمیشہ مٹر کے دانے الگ چن چن کر کھا لیتا ــــ اور چاول الگ ــــ اور پھر ــــ ایک صبح اس کی ماں بستر سے نہیں اٹھی ــــ اس نے لاکھ جگایا ــــ مگر وہ ہلی تک نہیں ــــ اور پھر بہت سے لوگ اسے پلنگ پر لٹا کر نہ معلوم کہاں لے کر چلے گئے ــــ وہ محلہ میں دو دو، چار چار دن بہت سے گھروں میں رکھ کر یہاں پہنچا دیا گیا تھا ــــ

سب بچے کھانا کھا کر واپس آ رہے تھے ــــ منشی جی نے ایک روٹی چرا کر حامد کو دی ــــ اور اس کے دو ساتھیوں نے بھی آدھی آدھی ــــ

اور اس طرح دو روٹیاں اس کو مل ہی گئیں ___ جنھیں وہ جلدی جلدی روکھی نکل گیا ___ تھوڑی دیر بعد اٹھا ___ پانی پیا ___ اور پھر جھولے سے پلنگ میں دو اور ساتھیوں کے ساتھ گھس گیا ___

تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی سسکیاں آتی رہیں ___ اور ___ سسکتے سسکتے اس کی آنکھ لگ گئی ___ اس نے دیکھا ___ اس کے سامنے پلاؤ کی بڑی بڑی قابیں رکھی ہیں ___ جن میں سے بڑے بڑے مٹر کے دانے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھ رہے ہیں ___ مہین چاولوں کی جالی میں سے ___ وہ خوش ہو گیا ___ اس کا جسم پھول کی طرح ہلکا محسوس ہو رہا تھا ___ کہیں بھی درد نہیں تھا ___ وہ مسکرا دیا ___ پلاؤ ___ گرم گرم بھاپ پلاؤ کے اوپر دھواں سا پھیلا رہی تھی ___ اس نے سوچا ___ پہلے دانے چن لوں ___ وہ جھپٹنے ہی والا تھا ___ کہ اچانک اسے خیال آیا ___ پیسے ابھی کم ہیں ___ اور وہ بڑبڑا اٹھا ___ "نہ ___ نہ ___ بس صاحب ___ ہوں ___ ہاں ___ ایک نوالہ ___ ایک ___ ایک ___ اکنی ___ نہیں ___" اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کا سر پھٹ گیا ہو ___ اونچے ___ بہت اونچے پہاڑ سے کسی گہرے کھڈ میں گر گیا ہو ___ اور اس کی آنکھ کھل گئی ___ سامنے وارڈن صاحب کھڑے ہوئے چیخ رہے تھے ___ "چور ___ ذلیل ___ نمک حرام بھیک مانگ کر کھا لیتا ہے نکل جا یہاں سے ___"

۱۹۵۸ء

فنکار

گھنے کہرے کی دبیز چادر میں لپٹی یہ سردیوں کی رات تھی ــــ اور سامنے دُور تک جاڑے سے ٹھٹھری ریل کی پٹریاں سمٹی سمٹی پڑی تھیں ــــ اور ان پر تیزی سے اپنی بھیانک آواز بکھیرتی ہوئی گاڑی آگے بڑھ رہی تھی ــــ آگے ــــ اور آگے نہ معلوم کہاں تک کے لئے ــــ شاید وہ ان دُور دُور تک پھیلی پٹریوں کی آخری حد کو پھلانگ جانا چاہتی ہو ــــ جیسے صدیوں نے لمحے پھلانگ کر زندگی کو زندگی سے جوڑ رکھا تھا ــــ

تقریباً تین بجے چوں چوں کی آواز کے ساتھ رفتار میں کمی آئی اور گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکی ــــ کمپارٹمنٹ میں زیادہ تر لوگ اُونگھ رہے تھے ــــ جن کے پاس کمبل اور لحاف تھے، وہ اپنے چاروں طرف لپیٹے بیٹھے ہی بیٹھے سو رہے تھے ــــ اور جو بے چارے اس سے محروم تھے وہ اپنے آس پاس کے مسافروں کے لحافوں اور کمبلوں سے محض اپنے آپ کو چپکائے ہُوئے اُونگھ رہے تھے ــــ کچھ نے تو اپنے ہاتھ اور پاؤں دونوں ہی برابر والے کے لحاف میں چھپا رکھے تھے ــــ لیکن وہ ــــ بڑی دیر سے اپنی منزل کے انتظار میں کمبل کے اندر ہی اندر کلبلا رہا تھا ــــ

گاڑی کے رُکتے ہی وہ اپنا کمبل سنبھال کر اُٹھا ــــ بڑا سا تھیلا اُٹھایا ــــ اور پلیٹ فارم پر اُتر گیا ــــ پلیٹ فارم پر کہرے میں ڈوبی ہُوئی ٹمٹماتی روشنیاں

آنکھیں جھپکا رہی تھیں ___ اور اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے ___ اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا ___ دُور دُور تک پھیلے اندھیروں میں اس کی آرزوئیں مُسکرا رہی تھیں ___ اس کے سارے جسم میں خوشی کی لہر کوند گئی ___ اُس کے ذہن پر بیتے ہوُئے دس سال اس کی نظروں کے سامنے لمحہ بن بن کر گزر رہے تھے ___ اور اس پوُرے عرصہ پر ایک ہی رنگ اُبھر رہا تھا ___ سُرخی مائل سنہرا رنگ ___ جو اس کے خوابوں کی تعبیر تھا ___ اسے فنکار بننا ہے ___ فنکار ___ مصوّر ___ اور اس کے لئے اسے لمبے لمبے سفر کرنے ہیں ___

اس نے اپنی چھوٹی سی دُنیا، اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوُئے یہ دس سال گزارے تھے ___ تھیلوں میں رنگ، کاغذ، کینوس، ایک جوڑا کپڑا ___ اور کمبل، اکثر اس نے پیٹ بھرنے کے لئے سڑک کے کنارے اپنے فن پارے بکھیر دیئے تھے ___ یا کسی پارک کی بنچ پر بیٹھے بھاری جیب والے کے ہاتھ میں منٹوں میں بنا اس کا اسکیچ پکڑا دیا تھا ___ اور کئی دن تک بے فکری سے کاغذ پر رنگ پھیلاتا رہا تھا ___ وہ دنیا کے کونے کونے میں گھوم کر زندگی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا ___ وہ گاؤں گاؤں پھرا تھا ___ اکثر پہاڑی علاقوں میں چلتے چلتے اس کے پیروں میں چھالے اُگ آئے تھے ___ لیکن وہاں کے باسیوں کی محبت، زندگی سے پیار ___ اس کے پیروں کے چھالوں کو پھُول بنا دیتی۔

اُسے ہندوستان میں پھیلے ہوُئے چپّے چپّے پر ہزاروں سال پُرانی مقدّس یادگاروں کو دیکھنا ہے ___ ان کے حسن کو اپنے خونِ دل کا رنگ دینا ہے ___ اس نے پوُرے پانچ سال کا کورس کر لیا تھا ___ وہ اپنے کلاس میں سب سے زیادہ ذہین تھا ___ اس نے کئی شاہکار تخلیق کئے تھے ___ اس کے ہاتھ میں برش ہوتا اور کینوس کے سامنے وہ گھنٹوں اپنی اَدھ کھلی آنکھوں سے کچھ دیکھتا رہتا ___ اور پھر اس کا کینوس جب ختم ہو جاتا ___ تو وہ بے چین سا ہو جاتا ___ وہ ہمیشہ سوچتا ___ سب کچھ ادھورا ہے ___ وہ چھینی اور ہتھوڑا اُٹھا لیتا تو اس کے سامنے پتھر پگھلنے لگتے ___ لیکن ___ اس کی پیاس اور شدید ہو جاتی ___

اور آج ___ آج اس کا وہ خواب پوُرا ہونے والا تھا ___ اس نے

موٹی موٹی کتابوں میں ان موتیوں کو ٹٹولا ضرور تھا ___ لیکن ___ لیکن ___ آج وہ اس جگہ کھڑا تھا جہاں اندھیرے میں اس کے چاروں طرف اس کی آرزوؤں کے جگنو چمک رہے تھے ___

اس نے گزرتے ہوئے ریلوے ملازم سے پوچھا ___ "یہاں سے اجنتا کتنی دُور ہے؟"

ایک بے تعلق سی آواز آئی ___ "موٹر صبح چار بجے جائے گی!" اور پھر وہ ٹین کے سائبان کے تلے سے ہوتا ہوا کہیں غائب ہو گیا تھا ___

ٹرین نہ جانے کب کھسک گئی تھی ___ اسے کچھ پتہ نہ تھا ___ دُور، دُور تک پھیلی لوہے کی پٹریاں چمک رہی تھیں ___ گاڑی کے آجانے سے یہاں جو تھوڑی سی زندگی کلبلائی تھی، اب پھر سناٹوں میں لپٹ چکی تھی ___ لکڑی کی بنچوں پر لوگ اوڑھے لپٹے سو رہے تھے ___ وہ بھی سائبان کے نیچے ایک بنچ کے خالی کنارے پر ٹک گیا ___

دس بجے وہ اجنتا کی مقدس سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا ___ گھوم گھوم کر چلتی ہوئی بس سے اس نے پہلے ہی دھندلی دھندلی سرخی میں کچھ نشان ڈھونڈ لئے تھے ___ اور اب ___ اب وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا ___ ایک ایک سیڑھی پر وہ دل ہی دل میں سجدے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا ___ اس کا دل مسرت سے لبریز تھا ___ اس کے قدم پھول کی طرح ہلکے محسوس ہو رہے تھے ___ اور جب وہ آخری زینہ پر چڑھ کر پہلے راستے پر مڑا تو حیرت اور مسرت سے کانپتے ہوئے اس نے قریب کے پتھروں کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ___ ایک لمحہ کو عقیدت کے بوجھ سے اس کی پلکیں جھک گئیں ___

اجنتا ___ اس کی آرزو ___ اس کی منزل ___ اس کے سامنے دُور دُور تک پھیلی تھی ___ پہاڑوں کی کوکھ میں چھوٹے بڑے شاہکار ___ صدیوں سے جیسے اس کے منتظر تھے ___ چھوٹے بڑے دَر ___ خوب صورت غار نما ___ دائروں کی صورت دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔

وہ سوچ رہا تھا ___ کتنی مقدس جگہ ہے یہ ___ جہاں ہزاروں سال

پہلے ___ کتنے عظیم فنکاروں نے جنم لیا تھا ___ اُن کے قدموں کے نشان تو مٹ چکے ہیں ___ لیکن گہری کھائیوں کے اُوپر ناگنوں کی طرح رینگتے یہ پتلے راستے آج بھی ان فنکاروں کے لمس سے بالکل تازہ ہیں ___ وہ فنکار دن بھر ان دیواروں پر ___ ان چٹانوں پر اپنے حسین تصوّر اور جذبات اور تصویروں کو مورتیوں میں، ڈھالتے رہتے ہوں گے ___ ان کے ہتھوڑے ___ چھینیاں ___ ان کے چھوٹے بڑے برش زندگی کی سچائیوں کو اُبھارنے میں کبھی ناکام نہیں رہے ___ ان کا تخلیق پر ایمان ___ ان کا خلوص ___ ان کی عقیدت ___ ان کا آرٹ ان کا حُسن سب کچھ یہاں محفوظ ہوتا گیا ___ اور وہ عظیم خالق رات میں کس طرح اپنے بزرگ استادوں کے گرد جمع ہو کر ان کے قیمتی مشورے اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیتے ہوں گے ___ اور لازوال مسرّت ان کو مدہوش کر دیتی ہوگی ___ یہاں کے چپّے چپّے پر ان کی عظمت کی مہریں ثبت تھیں ___

اس کا سر عقیدت سے پھر جُھک گیا ___

"اے خالقو ___ کون کہتا ہے تم ماضی میں تھے ___ تم ___ تم تو ہمیشہ سے تھے، ہمیشہ سے ہو ___ اور ہمیشہ رہو گے ___ اے عظیم خالقو ___ تم امر ہو ___ یہاں کا چپّہ چپّہ گواہ ہے کہ تم امر ہو ___ تمھارے قدموں کی چاپ یہاں محفوظ ہے ___ تمھارے ہتھوڑوں کی گونج آج تک اس خاموشی میں سُنائی دیتی ہے۔"

اور اس نے محسوس کیا، سچ مچ غاروں کے خالق اُسے گھور رہے ہیں۔ اَنجانی جگہوں سے اس کے وجود پر نظریں پھسلتی ہُوئی محسوس ہُوئیں اور اس کے ماتھے پر چند قطرے اُبھر آئے ___

اس نے سُنا سیکڑوں خاموش آوازیں فضا کے دوش پر اس کا استقبال کر رہی ہیں ___

وہ سوچتا جا رہا تھا ___ اور اس کے قدم ایک نئے جوش کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

چند ہی دنوں میں وہاں کا عملہ اُسے پہچاننے لگا تھا ___ بے ضرر سا

فنکار ــــ اب اسے غاروں میں تصویریں دیکھنے کے لئے کسی نئے دیکھنے والے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا ــــ جس کے طفیل روشنیوں میں وہ بھی ہزاروں سال پُرانے بنے شاہکار دیکھتا ــــ اب اسے روشنی کی آسانیاں مُفت ہی مل گئی تھیں ــــ اس کا فن سے پیار ــــ فن پارے سے عقیدت اور لگن دیکھ کر عملے والے اس کی پوری مدد کرتے اور وہ بنا کھائے پئے ــــ گھنٹوں ایک ایک فن پارے کو تاکتا رہتا ــــ اور اس کا برش کینوس کو رنگتا رہتا ــــ

آج تک ایسا انوکھا فنکار وہاں کے لوگوں نے نہیں دیکھا تھا ــ انھیں لگتا کہیں بنانے والوں میں سے ہی کسی نے پُنرجنم تو نہیں لے لیا ــــ

وہ دن دن بھر کسی کونے میں رنگ و برش لئے ایک ہی تصویر میں کھویا رہتا ــــ اور جب رات کا اندھیرا پھیلنے لگتا تو کوئی نہ کوئی عملے والا اُسے خواب سے جگالے جاتا ــــ کھلاتا پلاتا ــــ اور ــــ اور پھر اس سے دیر تک باتیں کرتا ــــ

ایک دن دوپہر کے وقت وہ پہلے غار میں بیٹھا تھا ــــ سامنے دیوار پر بنی ایک نرتکی کی تصویر آہستہ آہستہ رنگوں کا لباس پہنے اس کے کینوس پر اُبھر رہی تھی ــ برش اس کے ہاتھوں میں تھا ــــ اور آنکھیں کبھی کینوس اور کبھی نرتکی پر دونوں طرف متحرک تھیں ــــ

سامنے ــــ دیوار تیز روشنی میں نہائی چمک رہی تھی ــــ اور تصویریں سہمی سہمی اسے تاک رہی تھیں ــــ اس کے پیچھے اور دائیں بائیں غار دُور تک اندھیرے میں ڈوبا ہُوا تھا ــــ اس اندھیرے میں سے گھورتی سیکڑوں آنکھیں اُسے چاروں طرف محسوس ہو رہی تھیں ــــ اسے لگا کوئی بھاری سی گھورتی ہُوئی نظر اس کی پشت پر ٹھہر گئی ــــ اس کی کنپٹیاں گرم ہو گئیں ــــ چاروں طرف سے گھیرتی ہُوئی نرم و نازک نگاہوں کی سنسناہٹ بھی اس نے محسوس کی ــــ اور پھر اس نے سُنا غار کے اندھیروں میں لوگ آہستہ آہستہ چل پھر رہے ہیں ــــ اس کا دل تڑپ گیا ــــ وہ چاہتا تھا کہ اچانک مڑکر اس پتھر کی دُنیا کے باسیوں کو چلتے پھرتے دیکھ لے ــــ بس ایک لمحہ ــــ وہ بجلی کا لیمپ

گھما کر سب کچھ دیکھ سکتا تھا ___ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ___ اسے ڈر تھا کہ اس نے روشنی گھما کر اگر ذرا بھی دیکھنے کی کوشش کی تو یہ چلتی پھرتی مورتیاں اور تصویریں سب خوف سے بھاگ کر اپنی اپنی جگہ دیوار میں چھپاں ہو جائیں گی ___ یا پھر ___ اس کی اس حرکت سے وہ ناراض بھی تو ہو سکتی ہیں ___

اسے نہیں معلوم تھا ___ پتھروں کی دیوار پر جڑی ہوئی یہ کہانیاں اندھیروں میں جاگ جاتی ہیں ___ اور ___ آج کے انسان کے بارے میں باتیں بھی کرتی ہیں ___ اور ___ اور آج شاید اتنی دیر تک اسے برش چلاتے دیکھ کر ہی ان کی دنیا میں اتھل پتھل مچ گئی تھی ___ پھر وہ کیوں انکو دیکھنے کی کوشش کرے ___

اس کی نگاہیں نرتکی پر تھیں ___ اور برش اسی طرح چل رہا تھا ___ اور ___ نرتکی دھیرے دھیرے اس کے کینوس پر اتر آئی تھی ___ پھر وہ کیوں ان سب کی آزادی اور سرگوشیوں میں اپنی کسی حرکت سے مخل ہو۔

اسے لگا اس کے بائیں طرف والے اندھیرے حصے کی دیوار سے آواز آرہی ہے ___ کوئی لڑکی کسی بات کے لئے ضد کر رہی تھی ___ شاید وہ دیوار سے باہر نکل کر اس کی بنائی ہوئی نرتکی کو دیکھنا چاہتی تھی ___ لیکن ___ کوئی آواز اسے روک رہی تھی ___ شاید کسی شاہزادے کی آواز ___ لیکن لڑکی برابر ضد کئے جا رہی تھی ___ اس نے صاف سنا تھا ___

وہ آج کے مصور کی کاریگری دیکھنا چاہتی تھی ___ کینوس پر اتری ہوئی نرتکی کو دیکھنا چاہتی تھی ___ اور یہ بھی کہ آج کا مصور اسے کتنے ہزار سال کی زندگی دے سکتا ہے ___ اس کے برش میں کتنی جان ہے ___

وہ جھکا ہوا کینوس پر برش پھیر رہا تھا کہ ___ وہ لڑکی چپکے سے دیوار سے اتر آئی ___ سارے غار میں سناٹا چھا گیا ___ اندھیروں میں چلتے پھرتے قدموں کی آواز اچانک رک گئی ___ اس کی یہ ہمت ___ دائیں ہاتھ کی دیوار سے جس پر ہلکی سی روشنی تھی ___ ایک بوڑھے شخص نے گھور کر دیکھا ___ شاید نظروں ہی نظروں میں اس نے منع بھی کیا تھا ___

لیکن اس نے کسی کی پرواہ نہ کی ـــــ اور اَب ـــــ دبے قدموں وہ، اُس کی طرف بڑھ رہی تھی ـــــ

وہ محسوس کر رہا تھا ـــــ اس کے جسم کا رُواں رُواں حساس ہو گیا تھا ـــــ اس کا ہاتھ ضرور متحرک تھا ـــــ لیکن اس کا سارا وجود ساکت ہو گیا تھا ـــــ اسے محسوس ہُوا وہ لڑکی اس کے پیچھے بہت قریب آ گئی ہے ـــــ کسی کے قُرب کا اتنا لطیف احساس آج سے پہلے اسے کبھی نہیں ہُوا تھا ـــــ

اچانک اُس کا ہاتھ رُک گیا ـــــ ایک بار پھر کچھ ہلچل ہُوئی ـــــ ہنسی کی دَبی دَبی آوازیں بھی اُبھریں ـــــ کہیں دُور گھنگھرو بھی کھنکے ـــــ اس نے محسوس کیا اس کے پیچھے سے جُھک کے کسی نے کینوس کی زینت کو جھانکا بھی ـــــ وہ تڑپ گیا اور اس کی گردن اچانک پیچھے مُڑ گئی ـــــ دیکھ لینے کی ناکام خواہش ـــــ اور سایہ بھاگ کر قریب ترین کے ستون میں غائب ہو گیا ـــــ اور سارے غار میں سناٹا چھا گیا ـــــ سارا ماحول پتھرا گیا ـــــ شاید آج کے مصوّر کی اس جراءت سے سب خوف زدہ ہو گئے تھے ـــــ آج کا انسان پتھروں کی اس دُنیا کو بھی آزاد چھوڑنے پر تیار نہیں ـــــ اُونچی اُونچی دیواروں کے میوزیم میں سب کچھ بند کر دینے والا ـــــ تہذیب یافتہ انسان ـــــ سارے فن پارے مارے خوف کے پتھر گئے اس نے ایک سرچ لائٹ ہاتھ میں اُٹھائی ـــــ اور اس کی روشنی اس ستون پر ڈالی جہاں وہ لڑکی چھپ گئی تھی ـــــ

اس نے دیکھا ـــــ لڑکی مُسکرا رہی ہے ـــــ لڑکی یا حُسن کا مجسّمہ ـــــ اس کی خمار آلود جھکی جھکی نظریں جیسے کہہ رہی ہوں ـــــ

'فنکار ـــــ آؤ ـــــ آؤ فنکار ـــــ آگے بڑھو اور مجھے اپنا لو ـــــ میرے اندر چھپے فن کو اپنے فن میں سمو لو ـــــ اور ـــــ اَمر بن جاؤ ـــــ فنکار ـــــ تم سچّے فنکار ہو ـــــ تم نے ہماری دُنیا کو محسوس کیا ـــــ ہماری باتیں بھی سُنیں' اور ـــــ اور فنکار کی آنکھیں جیسے اس تصویر پر جم گئیں ـــــ اور تصویر نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں ـــــ

"فنکار میرے دوست ـــــ فنکار میرے دوست" کی دھیمی دھیمی آواز

اس کے چاروں طرف بکھری بکھری محسوس ہوئی ـــــ اس نے چاروں طرف سرچ لائٹ گھمائی ـــــ

دیواروں اور ستونوں پر بنے سیکڑوں شاہکار ـــــ خاموش نظروں سے اُسے تاک رہے تھے ـــــ دوستی اور محبّت کی لطیف نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں ـــــ اور سارا غار مہک رہا تھا ـــــ اس نے سوچا ـــــ پتّھر کی یہ دُنیا بھی دوستی اور پیار کے امر بندھنوں میں بندھی سیکڑوں برس پار کر گئی ـــــ اور ـــــ اب تک انسان کے شیطانی پنجوں سے بچی ہے ـــــ کاش ہماری دنیا کے لوگ بھی پتّھر کے ہوتے ـــــ اور شیطانی وسوسوں سے بچے رہتے ـــــ

اُس نے روشنی بند کر دی ـــــ اور غار سے باہر آ گیا ـــــ یہاں چمکتی ہُوئی دھوپ اور تپتی ہُوئی چٹانیں دُور تک پھیلی نظر آئیں ـــــ وہ پاس ہی بنے دفتر میں چلا گیا ـــــ دَفتر خالی تھا ـــــ لوگ کھانا کھانے جا چکے تھے ـــــ وہ ایک کرسی پر لیٹ سا گیا ـــــ اس کے ذہن پر وہ حادثہ پھر سے ابھرنے لگا، اسے اُنھیں باتوں کو سوچنے میں لُطف آ رہا تھا ـــــ یہ ہزاروں سال سے بسے پتّھر کے شاہکار اُسے جیتے جاگتے لگ رہے تھے ـــــ اس کی نظر میں وہ تصویریں بے جان نہیں تھیں ـــــ جن کو آج سے بہت پہلے فنکاروں نے تخلیق کیا تھا ـــــ

اور پھر ـــــ دھیرے دھیرے وہ ان سب سے اس قدر گھل مِل گیا کہ ـــــ خود اپنے آپ کو اُن میں سے ایک سمجھنے لگا ـــــ دَرمیان میں بنے بڑے ہال میں جب قدم رکھتا تو اس کا دل شانتی سے بھر جاتا ـــــ سامنے دس فٹ اُونچی بدھ کی مُورتی کے چاروں طرف موتیوں کی برکھا محسوس کرتا ـــــ آدھی کھلی آنکھیں ـــــ کھنچی ہُوئی لمبی بھنویں ـــــ اور ـــــ مُسکراتے ہُوئے ہونٹ ـــــ جیسے ساری دُنیا کا سکوت سمٹ کر ان ہونٹوں پر جمع ہو گیا ہو ـــــ وہ سامنے سرچ لائٹ رکھ کر گھنٹوں اس شانتی کے سمندر میں غرق رہتا ـــــ پھر اچانک ایک دن اس نے محسوس کیا ـــــ بھگوان کے چہرے پر کرب تھا ـــــ بے چینی تھی ـــــ وہ کانپ گیا ـــــ کیوں ـــــ آخر کیوں ـــــ ؟ بھگوان تو شانتی کا اتھاہ

سمندر ہیں ۔۔۔ پھر ۔۔۔ اور وہ بے چین ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا ۔۔۔ چند قدم اُدھر جاتے ہی بھگوان کی شانتی ان کے چہرے پر پھر لوٹ آئی ۔۔۔

"اِس ۔۔۔ یہ کیا ۔۔۔ یہ لازوال نروان کی مسرت ۔۔۔" اور پھر وہ چہرے کے دائیں طرف گیا ۔۔۔ بھگوان کے چہرے کا کرب پھر اُبھر آیا ۔۔۔

"ایک چہرہ اور تین رُوپ ۔۔۔ اے خدا ۔۔۔ کہاں گئے وہ فنکار جنھوں نے یہ رُوپ دیا تھا ۔۔۔" اس نے دونوں آنکھیں ۔۔۔ دونوں کھنچی ہُوئی بھنویں ۔۔۔ پھر غور سے دیکھیں ۔۔۔ بالکل یکساں ۔۔۔ سکون، خوشی اور کرب کا ایسا لازوال شاہکار ۔۔۔ اُس کا سر، اِس کے خالق، عظیم فنکار کے اَن دیکھے قدموں پر جھک گیا ۔۔۔ باہر سُورج بھی آسمان پر جُھک چکا تھا ۔۔۔ غار کے چھوٹے سے دَروازے سے ہلکی سی روشنی اندر آرہی تھی ۔۔۔

اور ۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا ۔۔۔ یہ کیسی دنیا ہے ۔۔۔ ؛ پتھروں کی ہو کر بھی زندگی سے بھر پُور ۔۔۔ محبّت کی حرارت سے معمور ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ ایک وہ دُنیا ہے ۔۔۔ جہاں زندگی کروٹیں لیتی ہے ۔۔۔ مگر ۔۔۔ بے جان ۔۔۔ محبت پلتی ہے مگر ۔۔۔ لین دین کی گود میں ۔۔۔ اور اس کے پاس صرف چند تصاویر ۔۔۔ برش ۔۔۔ رنگ ۔۔۔ اور تھوڑا سا بچا ہوا کینوس ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔ بس ۔۔۔

۱۹۶۸ء

ڈائری

میں نے بڑے غور سے اسے دیکھا ___ وہ مچمچی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا ___

"بی بی جی! میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں ___ سارا محلہ مجھے جانتا ہے"۔

اور جب تک میں یہ فیصلہ کروں کہ سچ مچ یہ چور اچکا ہے یا نہیں، وہ پھر بول دیا۔

"لالہ جی سے پوچھ لو ___ ساب جانتے ہیں ___ آپ جاؤ میں گھر چھوڑ آؤں گا ___ پنڈت جی کے نام سے سب ہی جانتے ہیں"۔

اس کا ہاتھ اپنی بات کو وزنی کرنے کے لئے کبھی اوپر نیچے اور کبھی دائیں بائیں گھوم رہا تھا ___ اور میں اس کے بکھرے بکھرے شناختی ٹکڑوں کو جمع کر کے اس کے وجود میں جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ___ انسان اپنے وجود کے بارے میں کتنا مشکوک ہے ___ کتنی جلدی اپنی پہچان کے آئینے کو نظروں کے سامنے اس طرح لہرانے لگتا ہے کہ دیکھنے والا بنا سوچے سمجھے آنکھیں بند کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے ___ تو میں بھی جلدی جلدی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔ سامنے چکی میں آٹا پس رہا تھا ___ کئی ڈبے۔ گٹھریاں اور تھیلے اِدھر اُدھر بکھرے رکھے تھے۔

"بی بی جی یہ آپ کا پس جائے ___ پھر یہ نیلا والا تھیلا پسوا کر میں پہنچا دوں گا ___ آپ کے گھر ___" وہ پھر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میرے یقین کو ٹٹولنے لگا۔

"بی بی جی ــــ! میں تو آپ ہی کی طرف کا ہوں ــــ وہ سلطان پور کے پاس مسافر خانہ، بس اس سے لگا ہوا ہمارا گاؤں ہے ــــ!"

میرے ذہن میں شبہ نے پھر سر اُبھارا ــــ "لو ــــ ہماری طرف کا تو ہو ہی گیا ــــ اب تو ضرور....."

"ارے بی بی جی ــــ! وہ جو ہیں نا ــــ وہ ــــ مرتضیٰ صاحب ــــ اُنکے گھر کے تو سارے کام میں ہی کرتا ہوں ــــ مسلمان ہیں تو کیا ہوا ــــ ہیں تو اپنی طرف کے ــــ اور وہ آپ کے گھر کے پیچھے گپتا جی ــــ وہ بھی رائے بریلی کے ہی ہیں!"

پنڈت جی اپنا اعتبار مضبوط کرنے کے لئے جتنی کیلیں جڑ رہے تھے ــــ ہر جھٹکے کے ساتھ میرا شک سر اٹھاتا جا رہا تھا ــــ "نہیں ــــ چکی کا مزدور ہی پہنچا دیتا ہے!"

میرا خشک سا جواب سُنکر وہ کچھ ہراساں سا ہو گیا ــــ کُرتے کے بائیں طرف کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک ڈائری نکالی ــــ آٹھ دس سال پُرانی میں تعجب سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی ــــ گھر تک پہنچنے کا اب کون سا پینترا بدلیں گے ــــ ڈائری کھولی تو لپے پُتے حروف دور سے ہی دکھائی دے رہے تھے ــــ انگلی پر تھوک لگا لگا کر وہ ورق اُلٹنے لگے ــــ اور پھر ایک صفحہ کھول کر ڈائری میرے ہاتھ میں تھما دی ــــ

سی ۔۱۱۔ مرتضیٰ صاحب ــــ اور نیچے چھوٹے بڑے سامان کی فہرست، میں ابھی دیکھ ہی رہی تھی کہ بولے۔

"آپ کے رشتہ دار ہیں نا؟"

"وہ نہیں ــــ ان کی مسنز رشتہ دار ہیں ــــ!" اور وہ جیسے کھل اٹھا۔

"کئی بار سوچا کہ آپ کا نام بھی ڈائری میں لکھ لوں ــــ پر بغیر اجازت کیسے لکھ لیتا ــــ"

ایک عورت چکی میں سے باہر آتے ہی پنڈت جی پر برس پڑی ــــ

"واہ پنڈت جی ــــ! خوب لائے تیل ــــ کل سے کارڈ لے گئے ہو۔"

اور پنڈت جی جلدی جلدی بنانے لگے ___

"بی بی جی ___ اکل کی لین بہت لمبی تھی ___ پھر تیل بھی ختم ہو گیا ___ آج شام تک تیل پہنچ جائے گا ___ ضرور ___ کل کے چھ کارڈ نمٹ گئے ___ آج بس پانچ اور ہیں ___ آپ کا مٹی کا آٹا آگیا ہے ___ گھر کہہ آیا تھا ___ مل گیا ہوگا ؟"

"ہوں!" کہتی ہوئی وہ عورت گیہوں دیکھنے لگی ___ اعتبار کی مدھم سی کرن میرے ذہن میں پھوٹ چکی تھی ___

لمبا سا بھورا کرتا، سفید گھر کی دھلی دھوتی، گرد سے اٹا ہوا جوتا، لمبے لمبے سوکھے مگر مضبوط ہاتھ پیر، گورا چٹا، نرم نرم جھریوں سے بھرا چہرہ، لمبی ناک ___ اور ___ سوکھے سوکھے ہونٹ ___

بے چارے کو کام کی ضرورت ہو گی ___ لیکن ___ لیکن یہ مزدوری کا کام میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا ___

"تو ___ بی بی جی ___ آپ کا نام لکھ لوں ___ ؟ آٹا ابھی پہنچا دوں گا ___ اور جو کام کہیں گی ___ سب شام تک روز ہو جائینگے ___ اب آپ اپنے گھر جائیں ___"

میرا ذہن پھر شک سے دھندلا ہو گیا ___

"کہاں پہنچاؤ گے پتہ معلوم ہے ___ ؟"

"ہاں ہاں ___ کیوں نہیں ___ وہ گوردوارے کے موڑ پر لال کوٹھی کا اگلا حصّہ ___ جہاں پھولوں کے بہت سے درخت ہیں ___" اور میرے ذہن کو پھر جھٹکا لگا ___ اتنا صحیح پتہ بلاوجہ کسی کو کیوں یاد ہونے لگا ___

ڈائری ابھی میرے ہاتھ میں تھی جس کے بہت سے ورق مختلف نمبروں اور نام کے ساتھ لپے پڑے تھے ___ کام کچھ اس طرح تھے ___ کارڈ سے مٹی کا تیل۔ نوکر کی بات ___ سادے پان کے پتّے ___ کسی ورق پر کچھ سبزیوں کے نام ___ کسی پر جائیے اور دالیں ___ جو جس نے بتایا، نام اور نمبر کے نیچے درج تھا ___ میں نے ڈائری پکڑاتے ہوئے کہا ___

"ٹھیک ہے، آپ گھر آجائیے گا ___ بات کرلیں گے ___ آج تو ڈبّہ مزدور

پہنچا دے گا ـــــ" میں بات ختم بھی نہیں کرنے پائی تھی کہ پنڈت جی نے آٹے کا ڈبہ اُٹھا کندھے پر ٹکا لیا ـــــ نیچے سے کندھے پر پڑی تولیہ اُڑس لی ـــــ آٹا جل رہا تھا ـــــ اور پھر ذرا جھک کر دو تھیلے اور اُٹھا لئے ـــــ

ـــــ "ارے پنڈت جی! یہ ہمارے نہیں ہیں ـــــ" میں بول پڑی۔

"نہیں بی بی جی! یہ تو ڈی، ۷، ا ـــــ اور ایم، ۳ والوں کے ہیں ـــــ جائیں بی بی جی! آپ گھر جائیں ـــــ میں ابھی آتا ہوں ـــــ پہلے ایم کی طرف ہو لوں ـــــ" میری گھبراہٹ وہ تاڑ گیا ـــــ پھر بولا ـــــ "بی بی جی ـــــ! فکر نہ کرو ـــــ میں ابھی آتا ہوں ـــــ آپ کا نام تو ڈائری پر لکھ گیا ـــــ" کہتے ہوئے وہ ایک طرف چل دیئے ـــــ

میں نے اپنی طرف سے یقین کرنے کو لالہ جی سے پوچھ ہی لیا ـــــ یہ پنڈت جی ـــــ کیا آپ کی چیکی پر ......" اور لالہ جی بیچ ہی میں بول پڑے ـــــ

"نوکر وو کر کسی کے نہیں ـــــ بس بھوت ہیں بھوت ـــــ ہر جگہ موجود رہتے ہیں ـــــ پھر تعجب سے پوچھا ـــــ "کیا سچ مچ آپ انھیں نہیں جانتیں ـــــ؟" لالہ کے پوچھنے کے انداز سے مجھے اپنی جنرل نالج اور محلے سے بے خبری پر واقعی افسوس ہوا ـــــ

"اجی صاحب! کالونی میں شاید ہی کوئی ہو جو پنڈت جی کو نہ جانتا ہو۔" یہ کہتے کہتے وہ ایک ہاتھ سے دھوتی کا لٹکتا ہوا کونا اٹھا کر دوکان کے اندر چلے گئے ـــــ مجھے تھوڑی سی تسلی ہوئی ـــــ

بازار کے اور دوسرے کام کر کے جب میں گھر لوٹی تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پنڈت جی بڑے زور و شور سے میرے شوہر سے باتوں میں مشغول ہیں ـــــ میں نے تو سوچا تھا کہ خوب لمبی چوڑی مزدوری لے کر پنڈت جی جا چکے ہوں گے ـــــ یا ابھی آئے ہی نہیں ہوں گے ـــــ لیکن یہاں تو اپنی طرف کی باتوں کا سمندر اُبل رہا تھا ـــــ پنڈت جی کہہ رہے تھے ـــــ

"اپنی طرف شریف عورتیں کہیں بازار ہاٹ کرتی ہیں ـــــ بابو جی یہ تو سب دلّی کا رنگ ہے ـــــ ارے آپ میاں لوگوں کے یہاں کہیں عورتیں ایسی پھرتی

ہیں ___ عزت چلی جائے عزّت ___ پر یہاں کس کی کیا پہچان ___ ہم سے جہاں تک ہو سکتا ہے ہم سیوا سے باہر نہیں ___ اچھا بابو جی ___ جے رام جی کی ___" اس نے دونوں ہاتھ اُونچے کر کے ماتھے سے لگائے ___ کندھے کی تولیہ سے شانے اور ہاتھ جھاڑتا ہُوا گیرٹ سے باہر چلا گیا ___

اور جب مجھے معلوم ہُوا کہ وہ مزدور سا کچھ بھی نہیں لے گیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب اس نے اپنی ڈائری میں نام لکھ لیا ہے اور مہینہ مہینہ کے حساب سے کام کریگا ___ چلو ٹھیک ہے ___ بہت سے جھنجھٹوں سے بچی ___ اور پھر میرے ذہن میں ایک ہیولا اُبھرا ___ بڑا سا ہنڈولیم کا ڈبہ کندھے پر ___ دو بڑے بڑے کھیلے ہاتھوں میں ٹانگے ___ مچمچاتی آنکھوں سے مجھے گھورتا ہُوا ___ "بی بی جی ___ ! میں چور اُچکا نہیں ہُوں ___ !"

پنڈت جی نے مزدوری نہیں مانگی تھی ___ مجھے اپنی کم ظرفی پر شرمندگی محسوس ہُوئی، کتنی بار میرے دل کے چور نے اس بے چارے شریف آدمی کو اپنے رنگ میں رنگ رنگ دیا تھا ___ میں نے اپنے آپ سے لڑنا چاہا ___ دو چار ڈائیلاگ کا لین دین بھی ہُوا ___ اور پھر ___ صلح وصفائی بھی ہو گئی ___

پھر دن گزرنے لگے ___ اور ڈائری کے کئی ورق میرے کاموں کی فہرست سے بھی سیاہ ہو گئے ___ کبھی پیسوں کی بابت پنڈت جی نے کھُل کر بات نہ کی ___ بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کھُلے پیسے نہیں لئے ___ جب پیسے دیئے انہوں نے بند مٹھی میں لے کر کُرتے کی جیب میں ڈال لئے ___ سب کے ساتھ مزدوری کا طے توڑ ایسا ہی تھا ___ کوئی پیسوں کی کھلی بات نہیں کر سکتا تھا ___ سَودے کے معاملہ میں حساب کوڑی کوڑی کا صاف کر جاتے ___ اپنی مزدوری کا بس مٹھی اور دل میں حساب کرتے۔

پنڈت جی سارے محلّے میں بوند بوند بٹے تھے ___ ڈائری کے ورق ورق میں ان کا جی دھرا رہتا ___ تھیلوں، گٹھریوں اور ڈبوں کے ڈھیر کے ڈھیر اِدھر سے اُدھر لڑھکتے رہتے، مگر کیا مجال ہے جو گڑبڑ ہو جائے ___ اگر ڈائری میں کسی نام کے آگے دو دن خالی رہ جاتے تو پنڈت جی ایسی اُداس آنکھوں سے دیکھتے ___ کیا

سامان خراب آگیا تھا ___؟ کیا مہنگا لگا تھا ___" ہر قسم کے سوال کر ڈالتے ___ وہ روز ڈائری کے ہر نمبر پر کچھ نہ کچھ لکھنا چاہتے تھے ___ سی، ۱۴۱ ___ ڈی، ۶/۱۲ ___ ایم ۴ ___ جی، ۱۷ ___ سارے پنڈت جی کو ازبر تھے ___ گرمی، جاڑا، برسات پنڈت جی کے لئے یکساں تھے ___

پھر ایک دن کسی نمبر کے آگے کچھ نہیں لکھا ___ دو دن ___ پھر تین دن ___ پھر کئی دن گزر گئے ___ پنڈت جی غائب تھے ___ سب کو تشویش تھی۔ سی، ۱۴۱ والے ایم ۴ میں ___ ڈی ۶/۱۲ والے جی، ۱۷ میں سب ایک دوسرے سے پوچھتے گھوم رہے تھے ___ پنڈت جی کا نمبر کسی گھر کے ایک سو کھے ورق پر کبھی نہیں تھا ___

ہر گھر کی گاڑی اٹک اٹک کر چل رہی تھی ___ اور پنڈت جی کی ڈائری۔ ساری کالونی کے نمبر اپنے سینہ پر چسپاں کئے اس کوٹھری کے دھندلکے میں چپ چاپ تکیہ کے نیچے پڑی تھی۔ اور پنڈت جی تیز بخار میں بے سدھ پڑے بڑبڑا رہے تھے ___ بی بی جی فکر نا کریں۔ سامان ___ سامان تو سب پہنچ جائے گا ___

جے ہو

بھیروں کو اس علاقے میں کون نہیں جانتا تھا ـــــ وہی بھیروں جسکے پاؤں نہ جانے کب کٹ گئے تھے ـــــ شہر کے اس وسطی علاقے کے خوب صورت بازار کا ہر دوکان دار اس کی آواز سے مانوس تھا ـــــ خوب صورت چوکور پارک، جب رات کو بجلی کے قمقموں سے جگمگا اٹھتا اور چاروں طرف کی چمکتی ہوئی دوکانوں سے چھنتی ہوئی دودھیا روشنی سڑک پر پھیل جاتی تو پارک کے کنارے پر بنے ہوئے مہابیر جی کے عالی شان مندر سے گھنٹوں، گھنٹیوں اور سنکھ کی آوازیں آدھے بازار میں گونج اٹھتیں ـــــ ان کی آوازوں کو سنتے ہی بھیروں اپنے بھاری دھڑ کو گھسیٹتا ہوا مندر کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ جاتا۔ اور گھنٹوں اور سنکھوں کی آواز کے ساتھ ساتھ اُسکی آواز بھی تیز ہو جاتی۔

"بابوجی! بابوجی ایک پیسہ ـــــ مہابیر کے نام پر۔"

اور جب وہ دیکھتا کہ بھگوان کے گھر آنے والوں میں سے کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو وہ اور بھی زور سے چیخنے لگتا......

"کچھ دے دو ـــــ دیا کرو بابو ـــــ میں کام نہیں کر سکتا ـــــ میرے پیر......"

اور پھر بیٹھے ہی بیٹھے اپنے کٹے ہوئے پاؤں اس طرح ہوا میں اُچھالنے لگتا کہ لوگوں کو دیا آہی جاتی۔

بھیروں کی عمر تیس پینتیس سال کے درمیان ہوگی۔ اسے خود بھی یاد نہ تھا کہ اس کے پیر کب کٹے اور کس طرح وہ اس بازار میں پہنچ گیا۔ ہاں اُسے یہ ضرور یاد تھا کہ وہ سدا سے اسی بازار کی چوڑی سڑک پر دُوسرے اپاہجوں کے ساتھ کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتا رہا ہے۔ اس کا اوپر کا دھڑ بالکل صحت مند تھا۔ تندرست بازو۔ چوڑی چھاتی۔ ذرا باہر نکلے ہُوئے میلے میلے پیلے دانت۔ سر کے بال بڑھے ہُوئے اور گرد آلود چہرے کے چاروں طرف لٹکتے ہُوئے۔ داڑھی اور مونچھیں خودرو جنگل کی طرح چہرے پر جھاڑیاں بنائے ہُوئے۔

ہاں تو دن بھر یہ مختلف دوکانوں کے سامنے اپنے بھاری ڈیل کو گھسیٹتا پھرتا اور گھٹنوں سے اُوپر کٹے ہُوئے پیر زمین پر رگڑتے رہتے۔ وہ دن بھر بھیک مانگتا۔ اور رات کو بھگوان کے گھر آنے والوں کی دیا دھرم سے فائدہ اُٹھانے کے لئے مندر کی سیڑھیوں کے قریب ہی بیٹھا چلا آیا کرتا۔

وہ بھیک مانگتا تھا۔ ہر آنے جانے والے کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا۔ مگر جب اسے کوئی جھڑک دیتا تو جیسے اس کے دل پر ٹھیس لگ جاتی۔ وہ گھنٹوں سوچتا۔ وہ کیوں زندہ ہے؟ دھرتی کا بوجھ بنا۔ کیوں نہ جان دیدے۔ مگر اس کے ہاتھ بالکل مضبوط ہیں۔ وہ مٹھی بند کر کے ہوا میں ہاتھ پھیلا دیتا۔ اور اپنے تنے ہُوئے بازو دیکھتا۔ وہ کسی کا گلا بھی گھونٹ سکتا ہے۔ اور پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں جلدی جلدی کھولنے اور بند کرنے لگتا۔ اس کا دماغ بالکل صحیح ہے۔ وہ بھی کچھ کام کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ اس کی زبان بالکل صاف ہے۔ وہ بھی پارک میں ہونے والے جلسوں میں "بھارت ماتا کی جے" بول سکتا ہے۔ بس پیر ہی تو نہیں ہیں اور اس لئے وہ محتاج ہے۔ فقیر ہے۔ اور اس جیسے نہ جانے کتنے فقیر ہیں جو دن بھر اس چوڑی گنجان سڑک پر رینگتے رینگتے رات کو تھک کر فٹ پاتھ پر آرام کرنے کے لئے پڑ رہتے ہیں۔

وہ اب بھیک مانگتے مانگتے گھبرا گیا تھا۔ کیوں کہ کئی بار اس نے پارک میں ہونے والے جلسوں میں سُنا تھا۔ "بھیک مانگنا ختم ہو جائے گا۔" کئی بار اس نے ترنگے لہراتے دیکھے تھے۔ کئی بار اس نے بھی اس خوشی میں "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ لگایا تھا۔ لیکن اَب دس بارہ سال بعد بھی بھیک مانگنا ختم نہ ہو سکا تھا۔ وہ

انتظار ہی کرتا رہا کب اور کیسے بھیک مانگنا ختم ہو گا۔ جب کوئی بھیک دینے والا کہہ دیتا۔
کچھ کرتے کیوں نہیں جی!

تو مجبوراً اسے اپنی کٹی ہوئی ٹانگ ہوا میں اُچھالنی پڑتیں۔

"لاچار ہوں بابو ____!"

مگر یہ کرتے ہوئے اُسے اچھا نہ لگتا۔ اُسے اپنی کٹی ہوئی ٹانگوں کی نمائش سے ذہنی کوفت ہوتی۔

ایک دن مندر کے پیچھے کوڑے کے پاس بیٹھا بھیر دل بھیک مانگ رہا تھا ____ اچانک اُسے کوڑے میں کچھ رنگین کاغذ دکھائی دیئے ____ خوب صورت رنگین کاغذ ____ وہ لاشعوری طور پر ادھر کھسکتا ہوا گیا۔ وہ رنگین کاغذ نہیں تھے۔ کسی بڑے رسالے کے دو پھٹے ہوئے ورق تھے۔ وہ رنگین تصویریں دیکھنے لگا۔ ایک عجیب قسم کی جگہ تھی۔ بہت سے چھوٹے بڑے پُرزے ایک بڑے سے کمرے میں لگے تھے اور ان کے سامنے کرسیوں پر قطار در قطار آدمی بیٹھے کام کر رہے تھے ____ سب کے ہاتھ کسی نہ کسی کام میں مشغول تھے۔

"ایں۔ یہ کیا ____ ان کے پیر کہاں ہیں ____؟ اس نے پھر غور سے دیکھا ____ سچ مچ کسی کے پیر نہیں تھے۔ سب کام کرنے والے کوٹ پہنے تھے اور نیکروں میں سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ کسی کے تھوڑے تھوڑے پیر نظر آرہے ہیں اور کسی کے بالکل غائب اس نے محسوس کیا، پارک کے چاروں طرف لگا ہوا بازار تیزی سے گھومنے لگا۔ اس نے جلدی سے کاغذ دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا۔ اور چیخ اُٹھا۔

"کام ____ کام ____ میں بھی کام کر سکتا ہوں!"

تھوڑی دیر وہ سر اونچا کئے اور آنکھیں بند کئے چیختا رہا۔ اور پھر گردن جھکا کر تصویریں دیکھنے لگا۔ اب اس کے دونوں ہاتھوں میں دُوسرا کاغذ پھیلا ہُوا تھا۔ وہی اپاہج بیٹھے ہُوئے کھا رہے تھے ____ مختلف قسم کے کھانے ان کے سامنے ڈھیر تھے ____ ہر ایک کے سامنے ایک ایک سفید دودھ کی بوتل بھی رکھی ہوئی تھی ____ وہ پھر چیخ اُٹھا۔

"آہا ____ کھانا ____؟ کھانا بھی ملے گا!"

اور پھر ــــ وہ نہ جانے کیا کیا چیختا رہا ــــ دو کانداروں نے دیکھا ــــ اور یقین کر لیا ــــ بھیرون پاگل ہو گیا ــــ بے چارہ ــــ ایک تو اپاہج تھا ہی، اَب پاگل بھی ہو گیا۔

لوگوں کا مجمع اس کے گرد اکٹھا ہونے لگا ــــ اور بھیرون رنگین کاغذ ہاتھ میں دبائے ایک ایک کا پیچھا کرنے لگا ــــ ایک ہاتھ میں تصویریں بلند کئے، اور دُوسرے ہاتھ کو زمین پر ٹیکتا ہوا وہ تیزی سے کھسکتا۔

"بابو ــــ! بابو پیسہ نہ دو ــــ مجھے بتا دو ــــ مجھے پہنچا دو بابو ــــ جے مہابیر جی کی ــــ جے بھارت ماتا کی ــــ" اور اس طرح بھیرون کے پیچھے دوڑنے سے لوگوں کا مجمع ختم ہو گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ وہ بغیر کچھ کھائے پئے، بس یہی چلّایا کرتا۔

"بابو ــــ! بابو پیسہ نہ دو ــــ مجھے بتا دو ــــ مجھے پہنچا دو بابو ــــ جے مہابیر سوامی کی ــــ جے بھارت ماتا کی ــــ"

کئی دن کے فاقوں سے وہ نڈھال ہو چکا تھا ــــ اس میں اب بیٹھنے کی بھی سکت نہ تھی ــــ وہ لوگوں کے پیچھے بھاگنے سے بھی مجبور ہو گیا ــــ اور اب ایک ہی جگہ پڑے پڑے ہر آنے جانے والے سے یہی التجا کرتا ــــ

کچھ لوگوں نے اس کے آگے کچھ کھانا ڈال دیا جسے اس نے دیکھا بھی نہیں، وہ اب بھیک نہیں مانگے گا ــــ وہ چیخ رہا تھا کہ ایک راہ گیر کو اس نے ٹھٹھکتے ہوئے دیکھا ــــ راہ گیر نے مڑ کر بھیرون کی طرف دیکھا تھا ــــ

پیلے رنگ کا دبلا پتلا سا نوجوان جس کے پتلے پتلے خشک ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ اس وقت کسی ضروری کام سے جا رہا ہے ــــ سفید کسمیلی قمیص ــــ سفید، کمر سے نیچے لٹکتا ہوا پتلون ــــ اور ماتھے پر پڑے گھنے سیاہ بال ــــ ہاتھوں میں لپٹے ہوئے کچھ کاغذ ــــ بھیرون پھر چیخا ــــ

"بابو ــــ بابو ــــ بتاتے جاؤ بابو ــــ"

ماتھے پر پڑے ہوئے بالوں کو گردن کے ہلکے سے جھٹکے سے پیچھے کرنے کی ناکام کوشش کے ساتھ ہی وہ نوجوان لوٹ پڑا۔

"کیا پوچھتے ہو بابا۔؟"

"یہ — یہ — یہ دیکھو کہاں ہے —؟ مجھے بتا دو — مجھے پہنچا دو۔

بس —! میں بھی تو کام کر سکتا ہوں — دیکھو — دیکھو — یہ سب کام کر رہے ہیں — سب کام —"

اور نوجوان کے ہاتھوں میں دونوں صفحے پھیل گئے — اس کے زرد رنگ میں سے سرخی جھلکی — اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چمک پیدا ہوئی — اور پھر گہری خاموشی چھا گئی — اس نے چپکے سے وہ رنگین کاغذ لپیٹ کر بھیروں کے سامنے ڈال دیئے۔

"یہ ایک دوسرے دیس کی بات ہے بابا —" نوجوان نے بتایا اور چل پڑا —

بجلی کی سرعت کے ساتھ بھیروں نے جست لگائی اور نوجوان کے پیروں میں لپٹ گیا —

"وہ — وہ کون سا دیس ہے بابو —؟ مجھے بھی پہنچا دو وہاں — میں بھی کام کروں گا — کام —!"

نہیں بابا — ہمارا دیس بھی تو ویسا ہی ہو جائے گا —!" نوجوان نے بتایا —

"سچ — لیکن کب — کب ہو جائے گا ویسا —؟"

"جب ہم چاہیں — جب تم چاہو — جب دیش کے اور لوگ چاہیں جنتا چاہے —!"

"اس دیس میں سب کو کام ملتا ہے —؟ سب کو کھانا ملتا ہے —؟ تو .... تو .... وہاں کا بھگوان بڑا ہی اچھا ہوگا بابو — مگر — مگر — نہ جانے کتنے گھنٹے اور کتنے سنکھ بجواتا ہوگا —؟ نہ جانے کتنی جے جے کار — اور — کتنا مان کراتا ہوگا —؟ تب تو وہ سب کو کام اور کھانا دیتا ہے —"

"نہیں — وہاں کے بھگوان کے لئے گھڑیال نہیں بجائے جاتے —

وہ محنت کراتا ہے ___ محنت ___ وہاں بھگوان محنت ہے ___! یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پتلون کی مہربان بھیرول سے چھڑانا چاہیں ___ اسے جانا تھا۔ بہت ضروری کام سے ___ مگر ___ بھیرول نے اپنی گرفت اور بھی سخت کرلی۔ اور بولا۔

"ایک بات اور بتا دو بابو ___ صرف ایک بات ___ اپاہج لوگ کام کرنے جاتے کیسے ہیں ___؟"

"موٹر آتی ہے ___ اور سب کو کارخانے پہنچا دیتی ہے ___ سب ایک ہی جگہ بڑے سے گھر میں رہتے ہیں ___" یہ کہتے ہوئے وہ نوجوان تیزی سے چلا گیا ___

اور بھیرول ___ دوسرے دیس کی بات سوچتا رہا ___ کب ہو جائے گا یہاں بھی ویسا ___؟ کب بھیک منگے ختم ہو جائیں گے ___؟ کب چھوٹے بڑے سیکڑوں رینگتے ہوئے کیڑوں سے یہ سڑکیں پاک ہو جائیں گی ___؟ اب اس کے ذہن کو سکون تھا ___ جیسے وہ اس جانے پہچانے دن کا انتظار کرنے لگا ہو ___

قریب پڑی ہوئی کھانے کی چیزوں میں سے کچھ چیزیں اس نے بین بین کر کھائیں ___ اور جگمگاتے ہوئے مندر کے نیچے بنے ہوئے پختہ فرش پا تھ پر لیٹ کر کچھ سوچنے لگا ___ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ___ اور اس نے دیکھا ___ مندر کے پیچھے والی سڑک سے ایک بڑی موٹر اس کے قریب آکر رکی اور کچھ لوگوں نے اسے اٹھا کر موٹر میں بٹھا لیا ___ اس موٹر میں اور بھی بہت سے ایسے ہی اپاہج بیٹھے تھے ___ وہ سب ایک جگہ لے جائے گئے ___ سب کے لمبے لمبے بال کٹوا کر چھوٹے کرائے گئے ___ پھر انھیں نہلا دھلا کر گرم کوٹ اور نیکر پہنا دیئے گئے ___ اور پھر وہ سب کے سب ایک بڑے سے کمرے میں لائے گئے ___ جہاں ان لوگوں نے اپنی پہیہ والی کرسیاں چھوڑ دیں ___ اور زمین پر بیٹھ گئے ___ اب ان کے سامنے بہت سی پوریاں اور کچوریاں ڈھیر تھیں ___ مزے دار ترکاریاں ___ کوئی چاہے کتنی

کھائے — کھانے کے بعد یہ لوگ پہیہ دار کرسیوں کے ذریعہ پھر ایک دوسرے کمرے میں لائے گئے — اس جگہ آکر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اتنا بڑا کمرہ — اور سارے کمرے میں مشینیں پھیلی تھیں۔

اسے ایک کرگھے کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ ماسٹر سکھا رہے تھے۔ بھیردں کو تعجب تھا کہ وہ کیسے اتنی جلدی سیکھ گیا — اس کے سامنے تھوڑی دیر میں ہی اس کے ہاتھوں کا بنا ہوا کپڑا ڈھیر تھا — وہ بے حد خوش تھا۔ اس کا دیس کبھی دوُر دیس جیسا ہو گیا تھا — اب لوگ خالی جے جے کار نہیں کریں گے خالی نعرے نہیں لگائیں گے — اس کی جگہ کام کریں گے — سب کو کھانا ملے گا — وہ سوت اوُنچا کر کے کرگھے میں پھنسا ہی رہا تھا کہ اس کے شانے میں سخت درد ہوا — اور اسے شدّت کے درد کے ساتھ ہی ایک جھٹکا محسوس ہوا۔ وہ چونک پڑا۔ ایک آدمی جھنڈا لئے ہوئے اس کے اوُپر گر پڑا تھا۔ سڑک پر پر بھات پھیری کا جلوس جا رہا تھا۔ اور جھنڈے لئے ہوئے لوگ چلاّ رہے تھے — بھارت ماتا کی جے ہو — بھارت ماتا کی جے ہو — چھبّیس جنوری — زندہ باد۔"

۱۹۶۰ء

پگلی

اس روز سڑک پر پھر سے ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہُوا ـــ بچوّں کے شور وغل نے جیسے محلّہ سر پر اٹھا لیا تھا ـــ ہو ـــ ہو ـــ ہو چاچی ـــ پیچھے دیکھ پیچھے بھوانی میّا ـــ آگے چاچی موت ـــ آگے بڑھیا موت، کا ایک شور سا چاروں طرف پھیل گیا ـــ اور سڑک پر ایک پستہ قد ادھیڑ سی عورت گندی دھوتی باندھے جو اس کے گھٹنوں اور ٹخنوں کے درمیان بے ڈھنگے پن سے لٹک رہی تھی ـــ دھوتی پر پڑے ہُوئے بڑے بڑے تیل کے داغ، گرد اور مٹّی سے اَٹے ہُوئے بال جن کی موٹی موٹی لٹیں آپس میں اُلجھ کر چپک گئی تھیں، چہرے کے دونوں طرف لٹک رہی تھیں ـــ چہرے کے رنگ اور بالوں کے رنگ میں بہت معمولی سا فرق تھا ـــ ماتھے پر گول گول روپیہ کے برابر سیندور کا ٹیکہ لگائے اپنی دھن میں بالکل سیدھی سڑک پر چلی جا رہی تھی ـــ اس کے موٹے موٹے پھیلے ہُوئے ہونٹوں سے سفید سفید جھاگ ٹپک رہا تھا ـــ اس کی مچمچی آنکھیں کھلی تو تھیں، پر تپلیاں کہاں ٹکی ہوتیں کوئی نہیں بتا سکتا تھا ـــ اس کے منھ سے گالیوں اور کوسنوں کے فوارے اُبل رہے تھے ـــ اس کا مخاطب کوئی نہیں تھا ـــ لیکن پیچھے سے آتی آوازوں کو وہ جواب دے رہی تھی ـــ "تو مر گیا ـــ تیرا باپ مر گیا ـــ بھوانی کھا گئی ـــ ناس ہو گیا۔

ناس ـــ بیاہ ہوا ـــ شادی ہوئی ـــ اور ـــ سب لوگ رو ـــ" اور پھر وہ چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دیتی ـــ "ہا ـــ ہا ـــ ہا" جیسے سچ مچ کوئی مر گیا ہو ـــ اس کی آواز سُنکر لڑکوں کا غول اور بڑا ہو جاتا ـــ شور بھی بڑھ جاتا۔ بڑھیا پیچھے بھوانی آگے موت ـــ لڑکوں کا غول جب اس کے پیچھے چل پڑتا اور وہ گھِر جاتی ـــ تو پلٹ پڑتی ـــ اور چلّانے لگتی "مریں تیرے باپ ـــ مریں تیرے بھائی ـــ تیری میّا ـــ" اور پھر خوب زور زور سے ہنسنے لگتی، اتنی زور سے کہ سڑک پر ہی لوٹ پوٹ ہو جاتی ـــ اور پھر جیسے ہی اُٹھ کر بیٹھتی دہاڑیں مار مار کر رونے لگتی ـــ

یہ قصہ ایک دن کا نہیں تھا ـــ ہر دُوسرے تیسرے دن یہی سب ہوتا ـــ کوئی اسے آگے آنے والی موت سے ڈراتا اور کوئی پیچھے چلنے والی بھوانی میّا سے ـــ کچھ بچے اسے چاچی پکارتے اور کچھ بڑھیا ـــ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ سڑک کے کنارے دوکانوں کے پٹڑوں پر بیٹھے بڑی عمر کے لوگ بھی اس کھیل میں دلچسپی لیتے ـــ اور جھوٹ موٹھ چلا اُٹھتے ـــ "او لونڈو ـــ کیا بجواس لگائی ہے ـــ جانے دو۔ جانے دو ـــ چاچی ہے"۔ اور پھر گھناؤنی سی ہنسی کے ساتھ ان کی بھی نظریں دُور تک چاچی کا پیچھا کرتی دکھائی دیتیں ـــ

اس روز کھڑکی میں کھڑی میں بھی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی ـــ اور میرے سامنے میرا بچپن چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھا کر بالکونی سے چاچی کی طرف پھینک رہا تھا ـــ بس یوں ہی ـــ کبھی جو ایک کنکری چھو گئی ہوتی چاچی کے ـــ پھر یہ روائت کتنی آہستہ سے مشرف، انیس اور نزہت سے ہوتی یا سمین تک پہنچ گئی تھی ـــ یہی بالکونی اور بہت ننھی ننھی کنکریاں ـــ امّی کے خوف سے بچتے ہوئے ـــ ہمارے گھر کی روایت اس لئے بالکونی تک محدود تھی کہ ہم لوگ شاید محلہ کی خرابی کے سبب یا محلّے میں باوقار خاندان کے سبب باہر نکلنے سے مجبور تھے۔

ہاں تو جب میں بالکونی پر سے کنکریاں یا کبھی کوئی چھوٹا ڈھیلا، چلّاتی چیختی چاچی کی طرف پھینک دیتی اور وہ چاچی سے کچھ دُور یا چاچی کے سامنے گرتا

تو وہ منہ اُٹھا کر اپنی مچمچی آنکھوں سے اوپر دیکھتی ـــــ پھر جوڑے جوڑے پیلے دانتوں کو ایک دُوسرے پر رکھ کر اسی۔ اسی کی آواز نکالتی ـــــ اور جب دانت ایک دُوسرے سے الگ ہوتے تو سفید سفید جھاگ کے ساتھ نہ جانے کتنی گالیاں، کوسنے اُوپر پھینکتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ـــــ اس کے منہ سے اڑتا ہوا سفید جھاگ کا فوارہ میں دیکھتی تو دیسے خوش تو ضرور ہوتی لیکن یہ خوشی اندر جاتے جاتے عجیب سا دَرد بن جاتی ـــــ ایک خوف ملا درد ـــــ اور پھر میں چپ چاپ کھڑی دیکھتی رہ جاتی ـــــ جاتی ہُوئی چاچی کو ـــــ

یہ ہنگامہ ہمارے بچپن سے ایسے ہی ہوتا چلا آیا تھا ـــــ چاچی کا سڑک پر آنا ـــــ شور وغل کے درمیان چاچی کی زوردار کوسنے اور گالیوں کی آواز ـــــ ہاں اب میرا بالکونی پر جانا ختم ہو گیا تھا ـــــ اور میری جگہ نزہت اور بے بی نے لے لی تھی ـــــ

لیکن اب چاچی کے منہ سے اڑتا ہوا جھاگ ـــــ ان کے جلدی جلدی اُٹھتے قدم ـــــ اور بہت اونچی آواز میں چاروں طرف بکھری گالیاں ـــــ یہ سب مجھے تڑپانے لگی تھیں ـــــ میرے اندر نہ جانے چاچی سے ہمدردی ایک دم کیسے جاگ گئی تھی ـــــ اب بالکونی سے نزہت اور بے بی کا کنکریاں پھینکنے کا کوئی سوال نہیں تھا ـــــ کئی بار بچاریوں کو سزا بھی بھگتنی پڑی تھی ـــــ کنکری چاہے لگی ہو یا نہ لگی ہو ـــــ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں چاچی کی کچھ مدد کروں ـــــ اور یہ مدد یہی ہو سکتی تھی کہ ہمارے گھر کے سامنے والی سڑک سے جب وہ گزریں تو ان کو بچوں سے بچا لوں ـــــ اور پھر ایسا ہی ہونے لگا ـــــ دُور سے چاچی کی بے ڈھنگی موٹی آواز کے ساتھ لڑکوں کا شور سنائی دیا کہ میں کہیں بھی ہوتی جلدی سے حامد کو آوازیں دینے لگتی ـــــ وہ چاہے جتنا ضروری کام کر رہا ہوتا یا ورچی خانے سے بھاگتا ہوا نکلتا ـــــ اسے معلوم ہو جاتا میں نے اسے کیوں آواز دی ہے ـــــ وہ باہر پہنچ کر لڑکوں کو منع کرتا ـــــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑھیا آگے موت تیچھے بھوانی کی آوازیں تو ضرور آتیں لیکن ان پر پڑنے والے اکثر ڈھیلے بند ہو چکے تھے ـــــ پھر بھی لڑکے کبھی ان کی دھوتی کھینچ لیتے ـــــ کبھی

پیچھے سے دھکا دے دیتے ـــــ اور وہ پُورے جوش اور طاقت کے ساتھ گالیاں اور کوسنے دینے لگتیں۔ بغیر کسی طرف دیکھے ـــــ وہ سامنے دیکھتی رہتیں ـــــ جیسے یہ سارا تماشہ ان کے سامنے ہو رہا ہو ـــــ یا اگر گردن کسی طرف مڑ گئی تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا ـــــ ان کی نظریں دور کہیں ٹکی رہتیں ـــــ بعض ڈھیٹ قسم کے لڑکے کبھی کبھی ان کی گرفت میں آجاتے ـــــ وہ ادھر اُدھر بھاگنے لگتیں۔ اور پھر کسی کا ہاتھ اگر ان کے ہاتھ میں آجاتا تو وہ بالکل جھپٹ جاتیں اور چلا چلا کر رونے لگتیں ـــــ اور رونے کے درمیان وہ کیا کیا کہتیں سمجھ میں نہیں آتا ـــــ کبھی کبھی دُور سے پھینکا ڈھیلا ان کے ماتھے پر یا سر پر لگ جاتا تو خون بھی بہنے لگتا ـــــ لیکن انھیں خون بہنے کی خبر بھی نہیں ہوتی ـــــ وہ چلتی رہتیں ـــــ اپنی رفتار سے ـــــ ان کے مٹی میں اَٹے، پھٹے پھٹے پیر کالی کلوٹی پتھر کی سڑک پر بڑھتے چلے جاتے ـــــ

اچانک ایک دن مجھے خیال آیا ـــــ آخر یہ ہے کون ـــــ ؟ کسی کو ان کی خبر تو ضرور ہوگی ـــــ ؟ کوئی تو ان کا ہوگا ـــــ ؟ لیکن سوال یہ تھا کہ یہ بات پوچھوں تو کس سے ـــــ ؟ ایک پگلی بڑھیا جو لوہے والے پُل کے پار سے آتی ہے درد بھری رونے کی آواز ـــــ گالیاں ـــــ کوسنے ـــــ اور پھر یک ٹک ایک طرف کو تاکتی ہوئی آنکھیں ـــــ

مجھے محسوس ہوتا ان کے رونے میں دوسرے پاگلوں جیسی لاپرواہی نہیں تھی ـــــ بلکہ ایک گونا درد پنہاں تھا ـــــ اور یہ درد میرے اندر کہیں کسی کونے میں بس گیا تھا ـــــ جس روز وہ سڑک سے گزرتی ـــــ اس کی آواز کانوں سے ٹکراتی ـــــ اس کے کوسنے ـــــ اس کی گالیاں ـــــ منھ سے اُڑتا ہوا سفید سفید جھاگ ـــــ اور پھر ـــــ بے تحاشا چلا چلا کر رونا ـــــ رات کے اندھیروں میں مجھے سُنائی اور دکھائی دیتا ـــــ اور میں بیچین ہو جاتی ـــــ

اس روز پھر سڑک پر ہنگامہ ہو گیا ـــــ چاچی سڑک سے گزر رہی تھی اور میں نہ جانے کیسے ان آوازوں سے چاچی کو بچانے کے لئے کھڑکی پر پہنچ گئی ـــــ میں نے حامد کو آواز دی ہی تھی کہ ایک بڑا سا ڈھیلا پتہ نہیں کس طرف سے آیا اور

چاچی کے سر کو لہولہان کر دیا ــــ ان کے سر سے خون کی سرخ سرخ دھاریں اُنکے گندے اور چکٹے ہوئے بالوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی ان کے ماتھے پر بہہ نکلی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا سارا منھ خون سے تر ہو چکا تھا ــــ اب خون سے ان کے سامنے سینہ پر پھیلی ہوئی بھوری ساری کتھئی ہونے لگی تھی ــــ میرا سر چکرا گیا ــــ اُف! اتنا خون ــــ میں بے قرار ہو اُٹھی ــــ

"حامد ــــ او حامد ــــ جلدی جاؤ ــــ چاچی کو پکڑ لاؤ ــــ انکے بہت خون بہہ رہا ہے ــــ گھر کھینچ لاؤ ــــ او ہو ــــ ڈاکٹر کے پاس لیجاؤ. جلدی کرو ــــ" اور میری اس بے چینی پر امی میرا منھ دیکھنے لگیں ــــ

"کمال کرتی ہو ــــ وہ بھلا حامد کے قبضے میں آسکتی ہے جو وہ اسے کھینچ لائے گا ــــ؟"

"نہیں امی ــــ خدا کے لئے کچھ کیجئے ــــ" اب میں اپنے آنسوؤں کو روک نہیں سکی ــــ چاچی پر کم اور مجھ پر زیادہ ترس کھا کر امی نے حامد کو حکم دے دیا کہ کسی کی مدد سے وہ چاچی کی پٹی کرا دے ــــ حامد کو حکم ملا ہی تھا کہ میں پھر دوڑ کر کھڑکی کے پاس ــــ

حامد چاچی کے پاس پہنچ تو ضرور گیا ــــ لیکن وہ خون میں لت پت چوٹ سے بے نیاز چلائے جا رہی تھی ــــ اس کے دونوں ہاتھ خون سے رنگ چکے تھے اور وہ وہی ہاتھ نچا نچا کر چلا رہی تھی ــــ حامد نے کوشش کی کہ اس کے قریب جائے ــــ لیکن وہ گالیاں دیتی بھاگی ــــ اس کے منھ سے سفید جھاگ اُبلا پڑ رہا تھا جس میں خون کی لالی بھی شامل ہو چکی تھی ــــ اب خون میں ملا ہوا جھاگ اس کی ٹھوڑی کے نیچے بہہ رہا تھا ــــ اور لڑکوں کی سمجھ میں بھی آ گیا کہ غالباً کچھ گڑبڑ ہو گیا۔ پھر بھی دو چار لڑکے اس کے آس پاس ہی منڈلا رہے تھے ــــ ڈھیلا کس نے مارا تھا کسی کو نہیں معلوم تھا ــــ لڑکوں کا بڑا گھیرا ٹوٹ چکا تھا ــــ اور چاچی، حامد سے بچنے کے لئے سامنے گلی میں بھاگی ــــ حامد اس کے پاس پہنچ چکا تھا ــــ اس کو گھیرنے میں اور لڑکوں نے بھی مدد کی ــــ لیکن چاچی نے حامد کو ایسا دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر

آرہا ـــــ کچھ لوگ ہنس دیئے اور حامد کھسیا گیا ـــــ وہ زمین سے اُٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ چاچی بجلی کیطرح لپک کر پھر سڑک پر بھاگنے لگی تھی ـــــ اس کے منھ سے جھاگ کے فوارے کے ساتھ ساتھ گالیاں اور کوسنے بھی ابل رہے تھے۔

اچانک لکڑی سے بھرا ایک ٹرک سڑک پر ہارن دیتا ہوا گزرا ہی تھا کہ چاچی اچک کر اس کے سامنے آگئی ـــــ ٹرک تو ہارن بجاتا نکل گیا۔ لیکن چاچی زمین پر ڈھیر تھی ـــــ سارے لوگ خاموش تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ـــــ میری بالکونی جیسے نیچے جھک گئی ہو ـــــ میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ـــــ پتہ نہیں کیسے میں اس ملگجے ڈھیر کے پاس پہنچ گئی، جو خون سے تر تھا ـــــ سڑک پر ایک طرف سرخ دھاری بہہ کر رک گئی تھی ـــــ اتنا بہت سا خون ـــــ اور میرے اتنے قریب ـــــ مجھے جیسے سکتہ ہو گیا ہو ـــــ آواز آئی ـــــ

"جان ہے ابھی ـــــ!" اور میں چونک پڑی ـــــ

"کیا بچ جائے گی ـــــ؟"

"ارے نہیں بی بی ـــــ گئی بڑھیا ـــــ!" اور میں مجمع کو چیرتی ہوئی۔ اپنے گھر بھاگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــــ

"امّی! چاچی کے ابھی جان ہے ـــــ امّی چاچی کو بچالو ـــــ امّی اسپتال بھجوا دو ـــــ چاچی کے جان ہے ابھی ـــــ"

امّی خاموش تھیں ـــــ ایک پگلی بڑھیا کی زندگی کی قیمت ہی کیا تھی؟ اس سے کس کو فائدہ تھا ـــــ جو کوئی اسے بچاتا ـــــ دھرتی کا بوجھ تھا۔ سو کم ہو گیا ـــــ امّی نے بہت ٹالا کہ اس فضول کام میں حامد لگ گیا تو ـــــ خواہ مخواہ وقت ضائع ہو گا ـــــ مگر پتہ نہیں کیسے ـــــ شاید بڑھیا کی موت سے زیادہ میرے رونے نے اُن پر اثر کیا ـــــ اور ـــــ چاچی کو حامد نے محلہ والوں کی مدد سے اسپتال پہنچا دیا۔

اب یہ بات تو صاف ہو گئی تھی کہ چاچی ابھی زندہ ہے ـــــ میں نے دبی آواز میں امّی سے پوچھا ـــــ "کیا ہم لوگ اُنھیں دیکھنے نہیں جا سکتے؟" اس کے جواب میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس پاگل بڑھیا کو دیکھنے کے لئے

جانا کتنا غیر ضروری تھا کتنا غیر انسانی ــــ"

شام کو ماسٹر صاحب ہم لوگوں کو پڑھانے آئے ــــ یہ ماسٹر تو کم تھے۔ گھر کے ممبر اور ایسے ویسے کام کے لئے زیادہ ــــ میں نے بڑی خوشامد کی کہ ماسٹر صاحب جاکر چاچی کی خبر لے آئیں ــــ

سارے محلّے میں اب بھی سب کچھ پہلے جیسا تھا جیسے صبح کچھ ہوا ہی نہ ہو وہی ہلچل ــــ وہی آوازیں ــــ وہی گھما گھمی ــــ میں سوچ رہی تھی ــــ چاچی کے بارے میں ــــ صرف چاچی کے بارے میں ــــ

پھر امّی نے بھی اجازت دے دی اور ماسٹر صاحب چاچی کی خیریت معلوم کرنے اسپتال چلے گئے ــــ اور ایک گھنٹہ بعد جب وہ واپس آئے تو خاموشی سے امّی کو بلاکر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے ــــ میں ڈر رہی تھی ــــ کہیں گڑبڑ تو نہیں ہو گئی ــــ میں خوف زدہ سی ماسٹر صاحب کے چہرے کو پڑھنا چاہ رہی تھی ــــ لیکن وہ مجھے دھندلا دکھائی دینے لگا تھا ــــ

اور پھر مجھے معلوم ہو گیا تھا ــــ زمین کا بوجھ آج ہلکا ہو گیا ــــ میرا دم جیسے گھٹنے لگا ــــ اور حلق میں کوئی بڑی سی چیز اٹکتی محسوس ہوئی۔ ماضی کے چند اوراق ذہن کے پردے پر ابھر آئے ــــ اور میں بے قرار ہو اٹھی۔ چاچی ــــ پگلی چاچی ــــ تم کون تھیں ــــ؟ کہتے ہوئے میری آنکھوں سے سوتے پھوٹ پڑے ــــ

اس حادثے کو میں بھولی نہیں ــــ یہ حادثہ میرے لئے بہت بڑا تھا ــــ

اور پھر کچھ دنوں بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کون تھیں ــــ اور کیوں در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھیں ــــ ان کے دو لڑکے ایک ہی وقت میں ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے ــــ ایک چودہ سال کا ــــ اور دوسرا ــــ بارہ سال کا ــــ اور تب سے ہی ان کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا ــــ

اور ــــ اور پھر ان کے اپنے ہی. جیسے بچّوں نے انھیں ڈھیلے مار مار کر اور پاگل بنا دیا تھا ــــ لڑکے انھیں ڈھیلے مارتے ــــ شرارتیں کرتے ــــ منھ سے اُڑتا ہوا جھاگ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ــــ مگر انھیں کیا معلوم تھا کہ اُن جیسے بھولوں کو گنوا کر ہی بے چاری چاچی کی یہ حالت ہو گئی تھی ــــ نہ جانے کتنی چاچیاں ــــ نہ جانے کتنے بابا ــــ سڑکوں پر اسی طرح گھومتے ہیں ــــ اور ــــ پتّھر کے بھولوں سے جھولیاں بھرتے پھرتے ہیں ــــ کون سوچے یہ بابا ــــ یا چاچی کیوں بن گئے ــــ ؟

۱۹۵۷ء

رُخ زندگی کا

آج اس کا من بہت اُداس تھا ___ اس کے ہاتھوں میں پڑا چوڑا جیسے ہتھکڑیاں بن کر اس کی کلائیوں کو جکڑے ہُوئے تھا ___ اور اسکے سینے میں سانس پھنس کر رہ گئی تھی ___ ابھی کتنے دن ہُوئے جب وہ جتندر کے ساتھ ماتھے پر جھومر لگائے، جھم جھم کرتی لال ساڑی میں اس گھر لائی گئی تھی ___ یہ گھر بڑا تھا ___ اُونچا تھا ___ اور ___ سب ہی نے بار بار کہا کہا تھا ___ ریکھا بڑی بھاگوان ہے ___ ایسا گھر ___ ایسا بر ___ تو بس قسمت والوں کو ہی مِلتا ہے ___ اور جب اس نے جتندر کو دیکھا تھا تو وہ بھی کہیں دُور گم ہو گئی تھی ___ کھوئی کھوئی سی ___ اور پھر ___ وہ گھبرائی بھی بہت تھی ___ بہت بڑا خاندان ہے ___ بہت سے چھوٹے بڑے ___ اور اچھے بُرے لوگوں کا جمگھٹا ___ اس نے سب کے ساتھ دل ہی دل میں کتنے رشتے جوڑے تھے ___ اور پھر ___ آہستہ آہستہ کتنی جلدی سارے کے سارے رشتے گڈ مڈ ہو گئے ___ وہ اس گھر کی سب سے چھوٹی بہو تھی ___ اور ___ اور ___ ممی کی سب سے چھوٹی بیٹی ___ لیکن دونوں جگہوں میں کتنا فرق تھا ___

جب اس کے لئے رشتے آنے شروع ہُوئے تھے ___ اور لڑکے کی تلاش ہو رہی تھی ___ وہ روز ہی سُنتی ___ نئے نئے نام ___ لیکن

انتخاب کس قدر مشکل تھا ــــ کبھی ڈیڈی سر کھجاتے کھجاتے کسی ایک نام پر اگر سوچنے لگتے تو ممّی ناک بھوں چڑھا لیتیں ــــ "گھر میں سب سے بڑی بن کر جائے گی تو کیسے نبھ پائے گا" ــــ اور اگر کبھی ممّی خوش ہو کر کسی کے نام کے ساتھ اس کی تفصیل بیان کرنے لگتیں تو ڈیڈی مسکرا پڑتے ــــ "ہاں ہاں ٹھیک ہے ــــ لیکن صاحب بہادر اکیلے رہتے ہیں ــــ اگر کبھی شام کو لوٹنے میں دیر ہو گئی تو گھر میں گنگا جمنا اُبل پڑے گی ــــ" وہ سب بہن بھائیوں میں چھوٹی تھی ــــ بے حد لاڈلی ــــ اسی لئے کبھی کسی سنجیدہ کام میں دل ہی نہ لگا ــــ ممّی نے پتہ نہیں کیسے بی، اے، کے ساتھ ساتھ کچھ تھوڑا بہت باورچی خانے کے بارے میں بتا دیا تھا ــــ ورنہ اسے تو چائے بنانا بھی بڑا مشکل لگتا تھا ــــ جس روز اس نے پہلی بار پڈنگ بنائی تھی ــــ ڈیڈی ــــ بھیا ــــ دیدی سب ہی نے انعام دیا تھا ــــ اور اس نے اسی روز پکچر دیکھی تھی ــــ ہر خوشی کے موقع پر اسے سب سے بڑا انعام یہی محسوس ہوتا ــــ وہ اپنی دوستوں ــــ اور قہقہوں میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب فیصلہ ہو گیا ــــ لیکن جب دیدی نے اسے بتایا تو اسے بڑی الجھن سی محسوس ہوئی تھی ــــ اور بہت سے فلمی مناظر اس کے سامنے اُبھر آئے تھے ــــ اور پھر کالج میں پتہ نہیں کیسے سب کو معلوم ہو گیا تھا وہ بہت شرمائی تھی ــــ روحی ــــ بہن ــــ میرا ــــ شاہین ــــ سب ہی نے کسی نہ کسی طرح جتندر کا نام لے کر اُسے چھیڑا تھا ــــ اس نے سوچا ــــ کیا سچ مچ وہ اب کسی مضبوط بندھن میں بندھ جائے گی ــــ اب تک اس کے دل میں نہ جانے کتنی تصویریں اُبھری تھیں ــــ لیکن وہ ان میں سے کبھی بھی کوئی تصویر دو چار گھنٹوں سے زیادہ اپنے دل میں چھپا نہ سکی تھی ــــ اکثر وہ سوچتی ــــ یہ ریٹا ــــ پربھا ــــ یہ سب کیا گڑبڑ کرتی ہیں ــــ روز ہی کالج سے موٹر سائیکلوں اور اسکوٹروں پر گھومنے نکل جاتی ہیں ــــ اور وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ جاتی ــــ اتنی دیر بوائے فرینڈ سے کیا باتیں کرتی رہتی ہیں یہ سب وہ سوچتی ــــ اور اکثر پوچھ بھی لیتی ــــ لیکن جواب میں چند مسکراہٹوں کے ساتھ ایک لفظ اس کے ہاتھ لگتا ــــ بدّھو ــــ اور وہ کھسیانی ہو جاتی ــــ

رُوتی ــــ بینی ــــ راجو ــــ اسے تو سب ہی اچھے لگتے تھے ــــ سب ہی اس کے ساتھی تھے ــــ سب ہی اس کے دوست تھے ــــ اسی لئے اس نے کبھی ضرورت نہ سمجھی کہ کوئی ایک تصویر وہ اپنے من میں بسائے ــــ اس نے سوچا کہ کیا اب سچ مچ اسے کوئی تصویر من میں بسانا ہی پڑے گی ــــ اس نے جتندر کا نام سُنا تھا ــــ دیدی نے بتایا تھا ــــ وہ لوگ آج آ رہے ہیں۔ ور اس نے شام تک نہ جانے کتنے ٹیڑھے میڑھے اسکیچ اپنے من ہی من کھینچ ڈالے تھے ــــ اور پھر اسے ایک دم الجھن ہونے لگی ــــ محبت ــــ رشتے ذمہ داری ــــ سنجیدگی ــــ یہ سارے الفاظ اسے بے معنی سے لگتے تھے اس نے محبت اور پیار کے جو رشتے ــــ کچھ دیکھے تھے ــــ ان میں ممی ــــ ڈیڈی بھیا اور بھابی کے ہی رُوپ تھے ــــ

پھر دیدی اور ممی نے صبح سے تیاری شروع کر دی ــــ اور کالج سے واپسی پر جب ریتا اور سدھا بھی اس کے گھر ٹھہر گئیں تو وہ بہت ہی نروس ہوئی۔ نہ جانے وہ اتنی بے چینی کیوں محسوس کر رہی تھی ــــ کبھی کبھی وہی بے چینی کچھ میٹھی سی ہو جاتی ــــ اسی الجھن میں اس نے کئی بار سوچا ممی سے کہدے ممی ــــ ابھی اتنی جلدی کیا ہے ــــ پھر پتہ نہیں کیسے دیدی یہ بات جان گئی تھیں ــــ انھوں نے بہت سمجھایا تھا "دیکھ ریکھا ــــ اب تو بچی نہیں ہے اور شادی تو سب کی ہونا ہی ہے ــــ جتندر بہت اچھا لڑکا ہے ــــ بہت اچھا گھر ہے ــــ اور وہ بھی تیری طرح اپنے گھر میں سب سے چھوٹا ہے ــــ موج کرے گی موج ــــ"

وہ گھبرا گئی ــــ اس نے دھیرے سے کہا "دیدی! ــــ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ــــ" اور پھر ــــ اس کی گہری جھیل جیسی آنکھیں دُور کہیں کچھ تلاش کرنے لگی تھیں ــــ

اور جب وہ ڈرائنگ رُوم میں بُلائی گئی تو جیسے ریکھا ــــ کہیں دُور کھو گئی تھی ــــ وہ بت کی طرح آئی اور دونوں ہاتھ ایک دُوسرے سے جڑ گئے ــــ پھر وہ صوفہ میں دھنس سی گئی ــــ اس کے کانوں میں کہیں دُور ــــ

آہستہ آہستہ شہنائیاں بج رہی تھیں ـــــ اور وہ ان اونچی نیچی لہروں میں ہچکولے لے رہی تھی ـــــ

"آپ بیڈمنٹن بہت اچھا کھیلتی ہیں ؟" ـــــ اس کے اندر کئی لہریں رینگ گئیں ـــــ

"جی ـــــ جی ہاں ـــــ" اور جب اس کی نظریں اوپر اُٹھیں تو وہ گہری بھوری جھیلوں میں ڈوب گئیں ـــــ اس کی پلکیں جلدی جلدی جھپک گئی تھیں.

پھر اس رات اس نے کتنی بار کروٹیں بدلی تھیں تب جاکر کہیں وہ جتندر کی آنکھوں سے بچ کر سو سکی تھی ـــــ دوسرے دن جیسے ہر ہر لمحہ میلوں لمبا ہوگیا تھا۔ نجانے کہاں سے الھڑپن نے سنجیدگی کو گلے لگا لیا تھا ـــــ اس کے چاروں طرف بھوری بھوری آنکھیں ناچ رہی تھیں۔ اس کا پیچھا کر رہی تھیں ـــــ ریکھا ـــــ ریکھا ـــــ ریکھا ـــــ اس کے چاروں طرف یہی نغمے اُبھر رہے تھے ـــــ اس کا دل بھی بے چین ہو اُٹھا ـــــ دل میں تو کئی بار گونج سُنائی دی تھی ـــــ لیکن اس کے ہونٹوں سے بھی نغمہ اُبل پڑا ـــــ جتندر ـــــ جتندر ـــــ اچانک ہی وہ گھبرا گئی ـــــ

"کس کو بلا رہی ہو لُواجی ـــــ یہاں تو بس میں ہوں !"

اس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا ـــــ "ارے ہاں ! ـــــ میں تو بھول ہی گئی ـــــ میرا منا یہاں ہے ـــــ ذرا وہ کتاب تو اٹھا دینا میز پر سے۔"

کتاب کے ورق ـــــ ایک ایک کر کے اُلٹتے گئے ـــــ اُلٹتے گئے ـــــ

اس درمیان کئی بار اس کی ملاقات جتندر سے ہوئی ـــــ اور اب وہ اپنی دوستوں کے لگائے اپنے الزام بڑی آسانی سے اپنے ہی ماتھے پر چپکا سکتی تھی ـــــ دھیرے دھیرے اس کی سمجھ میں بہت کچھ آنے لگا تھا ـــــ

اور پھر ـــــ ممی خریداری میں لگ گئی ـــــ انھوں نے نہ جانے کتنی خریداری کر ڈالی تھی ـــــ ساڑیوں کے ڈھیر لگ گئے تھے ـــــ ان کی بے حد لاڈلی ریکھا سسرال جا رہی تھی ـــــ بڑے گھر کی چھوٹی بہو بن کر ـــــ دوسری بہوؤں سے کہیں ہیٹی نہ رہ جائے ان کی بیٹی ـــــ جو سُنتا مبارکباد دیتا ـــــ ریکھا بھی ہر طرف سے

تعریفیں سُنتی ـــــ اور دل ہی دل میں خوش ہوا ٹھتی ـــــ بہت سے لوگ ـــــ بڑا مزا آئے گا ـــــ سب لوگ تاش کھیلیں گے ـــــ پکچر جائیں گے ـــــ اور ـــــ اور ـــــ پکنک کا مزا تو ہر شام آئے گا ـــــ جب اتنے سارے لوگ اکٹھا جائے بیٹھیں گے ـــــ اور ـــــ سب سے مزے کی بات تو ـــــ ممی باہر جانے کو منع نہیں کریں گی ـــــ اس کے ذہن پر گورا چٹا خوب صورت جتندرا ابھرتا ـــــ اور سارے فلمی ہیرو پردے پر سے نہ جانے کدھر غائب ہو جاتے ـــــ اب تو بس جتندر ہی ہر فلم کا ہیرو لگتا تھا ـــــ

جب وہ عروسی جوڑا پہن کر آئینہ کے سامنے آئی تو اس کی آنکھیں خود سے ہی جھک گئی تھیں ـــــ وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی ـــــ ہر ایک تعریف کر رہا تھا ـــــ بڑے سے پنڈال میں مہمان بھرے ہوئے تھے ـــــ اور دور سے باجے گو بجتے ہوئے قریب آ گئے تھے ـــــ

پریوں کے شہزادے جیسا جتندر دولھا بنا پنڈال کے دروازے پر پہنچ گیا تھا ـــــ اور پھر ریکھا اور جتندر ایک دوسرے کے گلے کا ہار بن گئے۔ اور ـــــ ریکھا تو سکھیوں کے قہقہوں اور جتندر کی مسکراہٹوں میں نہ جانے کتنے سنہرے روپہلے جال بنتی رہی تھی ـــــ کتنے خواب سجاتی رہی ـــــ اس نے محسوس کیا تھا ـــــ ایک دن میں وہ کتنی بڑی ہو گئی تھی ـــــ اس کا بوٹا سا قد اپنے سے کئی گنا اونچا ہو گیا تھا ـــــ تاروں کی چھاؤں میں ـــــ شہنائیوں کی لہروں پر وہ اپنے نئے گھر آ گئی تھی ـــــ

یہاں آ کر اس نے محسوس کیا تھا کہ سارے لوگ غلط کہتے تھے ـــــ وہ تو سب سے بڑی ہے ـــــ سب سے اونچی ہے ـــــ اور قدم قدم پر وہ ہار رہی تھی ـــــ جتندر اسے بے حد پیار کرتا تھا ـــــ یا ـــــ باشاید ـــــ گھر پر بھی اس کی تجارت کی عادت اسے لین دین میں مصروف رکھتی تھی ـــــ

ریکھا بڑی اچھی ہے ـــــ بابوجی کا بہت خیال رکھتی ہے ـــــ اور ـــــ ریکھا بابوجی کے سامنے لٹو کی طرح ناچ پڑتی ـــــ ریکھا تو چائے بہت اچھی بناتی ہے ـــــ اور ریکھا ـــــ کئی کئی پیالی چائے دم کر کر کے سب کو دیتی ـــــ وہ

سارے سارے دن کچن اور کمروں کے چکّر لگاتی ــــ اور شام کو جتندر سب حساب چکا دیتا ــــ

"گھومنے چلوگی" ــــ "پکچر چلوگی" ــــ "آؤ چلیں جوس پی آئیں ــ"

اور وہ خوشی سے ناچ اُٹھتی ــــ اسے لین دین کا حساب بالکل نہ آتا تھا ــــ ویسے اس کے پاپا بھی تجارت ہی کرتے تھے ــــ لیکن وہ اس سے بہت دُور رہی تھی ــــ ویدی ــــ بچے ــــ لڑکیاں ــــ شروع میں تو وہ سب کے سامنے ایک پیر سے ناچتی رہی تھی ــــ ایک ہفتہ ــــ دو ہفتہ ــــ اور پھر وہ اندر ہی اندر ٹوٹنے لگی تھی ــــ وہ تو چھوٹی بہو بن کر آئی تھی ــــ لیکن یہاں وہ چلتا ہوا سائیکل کا پہیہ ہوگئی تھی جو دھیرے دھیرے بس گھومتا ہی رہتا ہے ــــ بغیر کسی شور کے ــــ بغیر کسی دھماکے کے ــــ اس کا گڑیا جیسا خوب صُورت چہرہ ــــ اس کے پتلے پتلے سُرخ ہونٹ اور گال پر گہرا سیاہ تل، سب کچھ اب بھی موجود تھا ــــ جتندر تعریف بھی کرتا ــــ لیکن اسے اب جتندر کی باتوں میں گرمی نہ محسوس ہوتی ــــ وہ واقعی محبّت کرتا تھا ــــ بے حد محبّت ــــ لیکن ــــ وہ تو سب سے محبّت کرتا ہے ــــ بابوجی سے ــــ بھابی ــــ ویدی ــــ ماتاجی ــــ اور ــــ ریکھا سے بھی ــــ پھر ــــ اتنے بڑے گھر کا پہیہ اس نے ایسے ہی چلتے دیکھا تھا ــــ اور اسی لئے وہ ریکھا کو اپنی محبّت کی بے پناہ بارش میں نہلا دھلا کر ساری ذمّہ داریوں سے سَجا دیتا ــــ اور خود نو بجے دکان چلا جاتا ــــ اور سائیکل کا پہیہ دن بھر گھومتا رہتا ــ گھومتا رہتا ــــ

اور آج ــــ آج نو بج گئے تھے ــــ اور ریکھا کمرے سے باہر نہیں نکلی ــــ کئی بار اس کے آنسو ضرور نکل آئے تھے ــــ اسے اپنا گھر یاد آرہا تھا ــــ ممی ــــ ڈیڈی ــــ

اور ــــ اسی طرح بستر پر پڑے پڑے وہ بہت دور نکل گئی ــــ جس روز سے وہ اس گھر میں آئی تھی آج پہلا دن تھا کہ وہ نو بجے تک بستر میں تھی وہ بیمار نہیں تھی ــــ اسے کہیں درد بھی نہیں تھا ــ لیکن وہ اندر سے کہیں ٹوٹ

ضرور گئی تھی ـــــ اور ـــــ دُھڑک سا گیا تھا ـــــ اس نے کان لگا کر سُنا ـــــ نیچے باورچی خانہ میں برتن ٹکرا رہے تھے ـــــ اور بچّے کچھ گڑبڑ کر رہے تھے ـــــ لیکن سب ناشتہ کر چکے تھے ـــــ چائے بن چکی تھی ـــــ اور ـــــ وہ ـــــ وہ ـــــ انتظار کرنے لگی ـــــ بے مقصد انتظار ـــــ

وہ نہیں جائے گی ـــــ آخر آج بھی تو سب ہوا ـــــ میرے آنے سے پہلے بھی تو ہوتا تھا ـــــ پھر میں ہی کیوں ...... زینے سے جوتوں کی آواز سُنائی دی ـــــ اور پھر جتندر چائے کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہُوا ـــــ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی ـــــ "ارے آپ لے آئے ـــــ" اور پھر جتندر نے بڑے پیار سے اس کے ہونٹوں سے پیالی لگا دی تو وہ مسکرا اُٹھی ـــــ

"اب چائے روز اسی طرح ملے گی ـــــ ٹھیک ـــــ"

تھوڑی دیر بعد ریکھا ناشتہ دان کے ڈبّے بند کر کے دے رہی تھی۔

"یہ لو ـــــ آلو کے پراٹھے ـــــ"

"اور ـــــ" جتندر نے مسکرا کے پوچھا۔

وہ ہنس پڑی ـــــ "خود دیکھ لینا ـــــ"

اور پھر ـــــ دوکان جاتے ہُوئے دُور تک جتندر پیار سے مُڑ مُڑ کر دیکھتا رہا ـــــ فضا میں دونوں طرف ہاتھ لہراتے رہے ـــــ

سائے

یوں تو دونوں میں کوئی بھی اجنبی نہیں تھا۔ روزانہ ہی صبح ساڑھے نو بجے والی بس دونوں کو لینا ہوتی۔ وہ بغل میں چمڑے کا بیگ لئے آفس کے لئے بس پکڑتا، اور شاردا ایک ہاتھ میں پرس، اُس کے نیچے دبی ہوئی ڈائری اور کچھ کرکشن (CORR-ECTIONS) کی کاپیاں لئے اسکول اسی بس پر جاتی۔ لیکن یہ جان پہچان صرف نظروں تک ہی محدود تھی۔ کیوں میں کھڑا وہ جب اِدھر اُدھر دیکھتے دیکھتے نہ جانے کیسے شاردا کو گھورنے لگتا ــــــ اور جب شاردا کی نگاہیں اس سے ٹکرائیں تو وہ گھبرا کر پھر اِدھر اُدھر تاکنے لگتا ــــــ اور شاردا کی چوری کرتی ہوئی نگاہوں کو اگر کبھی وہ پکڑ لیتا تو وہ بے حد گھبرا جاتی۔ دُبلی پتلی گورے رنگ کی شاردا معمولی سُوتی ساری میں بھی کسی طرح معمولی خاندان کی نہ معلوم ہوتی۔ سادگی سے سنورے ہوئے بال اور کمر تک لٹکتی ہوئی کالی موٹی سی چوٹی اس کی دل کشی میں اور بھی اضافہ کرتی۔ شنگرفی رنگ، ہرنوں جیسی معصوم و سنجیدہ آنکھیں اور گہری سیاہ کمان جیسی تنی ہوئی بھنویں، گلابی ہونٹ جن پر لپ اسٹک کا کبھی سایہ بھی نہ پڑا تھا۔ کمر سے لٹکتا ہوا ساری کا پلّو جب ہوا میں لہراتا تو کیوں میں کھڑا ہر نوجوان اپنی جگہ کسمسانے لگتا ــــــ مگر لڑکیوں پر ہوٹنگ کرنے والے پیشہ ور آوارہ نوجوان بھی اس کو دیکھ کر سیٹی بجانے تک کی ہمت کھو بیٹھتے، اور یہی پُر وقار شخصیت وجہ کے چاروں طرف چھاتی جا رہی تھی ــــــ

بس اسٹاپ پہنچنے میں اگر شاردا کو کبھی دیر ہو جاتی تو وہ بے چین ہو جاتا۔

اپنی آنکھوں پر سے کالی عینک اُتار کر وہ دُور تک نظریں دوڑاتا، اور دُور سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی شاردا جب اسے آتی دکھائی دیتی، تو جلدی سے وہ پھر عینک لگا لیتا ___ شاردا بھی لمبے سے کیو میں کھڑے وجے کو دُور سے ہی دیکھ لیتی ___ سفید پتلون اور قمیص میں بھرے بھرے بدن اور اُونچے قد والا وجے ___ اسے دیکھتے ہی وہ مطمئن سی ہو جاتی ___

ایک دن ___ جب وہ چھوٹے بہن بھائیوں کی ضد پر اِن سب کو ساتھ لیکر سنیما گئی تو بکنگ آفس کے سامنے سے وہ ہٹنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک آواز کے ساتھ ہی دو روپیہ کا نوٹ لئے ہوئے ایک ہاتھ اس کے سامنے آ گیا۔

"پلیز! ایک ٹکٹ ___" اور اس نے دیکھا وجے قریب ہی کھڑا گھبراہٹ میں پلکیں جھپکا رہا تھا، جیسے اس پر بڑے زور سے ڈانٹ پڑنے والی ہو، اور وہ اپنی خطا سے پوری طرح آگاہ ہو ___ شاردا نے خاموشی سے نوٹ لے کر ٹکٹ خریدا، اور ٹکٹ اور بچے ہوئے پیسے اسے واپس کر دئیے۔

ہال میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن نیوز ریل کی روشنی میں اس نے دیکھا، اس کے برابر والی سیٹ پر وجے آکر بیٹھ گیا۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور پھر پردے پر جم گئیں۔ مگر وجے کی قربت سے شاردا معلوم نہیں کیسی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ کسی کی قربت کا ایسا احساس آج سے پہلے اسے کبھی نہ ہوا تھا۔ حالاں کہ کئی بار تو وہ بھیڑ میں چلتے چلتے لوگوں سے ٹکرا بھی چکی تھی، اور "ساری" کہتے ہوئے وہ دوسرے ہی لمحہ بھول جاتی کہ یہ بھی کوئی خاص واقعہ ہوا تھا۔ کئی بار سنیما میں بھی اس کے ساتھ والی سیٹ پر کوئی نوجوان سنیما دیکھتا رہتا لیکن سوائے کبھی کبھی تھوڑی سی گھبراہٹ کے اس نے کچھ بھی محسوس نہ کیا ___ مگر آج ___ آج وہ پریشان تھی ___ کہ اسے کیا ہوا جا رہا ہے ___

اسکرین پر سائے اُبھرتے اور ڈوبتے رہے اور اندھیرے میں کبھی کبھی چار چمکتی ہوئی آنکھیں ٹکرا کر پھر جلدی جلدی اُن سایوں کا پیچھا کرنے لگتیں۔

انٹرول میں اس نے دیکھا کئی بار کچھ بولنے کی کوشش کرتے کرتے رُک سا گیا۔

"یہ — یہ — سب آپ کے بھائی بہن ہیں —؟" اور پھر وہ اپنے اس بے تکے سوال پر خود سے جھینپ گیا۔

"جی —!" ایک باریک سی آواز ریکارڈنگ سے گونجتے ہوئے ہال میں سُنائی دی۔

اور پھر دونوں ہی جیسے خواب سے بیدار ہو گئے۔ سنبھل گئے۔

"آپ کس اسکول میں پڑھاتی ہیں؟"

"جی — رتنا دلی وِدّیالے میں!"

اور جب انٹرول کی آخری گھنٹی ہال میں گونجی تو اس وقت تک — دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کافی جان چکے تھے — فلم ختم ہوئی اور وجے کے ساتھ ہی شاردا بھی مع اپنے بھائی بہنوں کے باہر آ گئی۔

"آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں —؟"

"نہیں — شکریہ —!" کہتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ جُڑ گئے۔

"نمستے —!"

"نمستے —!" کہتا ہوا وجے وہیں کھڑا شاردا کو جاتے دیکھتا رہا — آج اس نے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ اُبھرنے والے سایے کو چھو لیا تھا — برسوں سے روز چڑھائی جانے والی آرتی آج دیوی نے سویکار کر لی تھی۔ اور وہ مزید مُلاقات کے لئے کُھلے ہُوئے باب دیکھ کر پُھولے نہ سما رہا تھا — کل صُبح جب کیو میں کھڑے کھڑے وہ شاردا کو نمستے کرے گا، اور شاردا کے سختی سے بھنچے ہُوئے ہونٹ مسکرا کر جواب دیں گے۔ تو لائن میں کھڑے سب ہی نوجوان اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گے — اور پھر — وہ گنگناتا ہُوا ایک طرف چل دیا —

دُوسرے دن بس اسٹاپ پر دو جھجکتی ہُوئی اور دو ڈھونڈتی ہُوئی نگاہوں کا ملاپ ہوا۔ اور دونوں طرف ہاتھ ہوا میں لہرا گئے —

"نمستے!"

اور جب بس میں بیٹھی ہوئی شاردا نے دیکھا کہ وجے کھڑا ہے تو اُس نے

اپنے برابر ہی سیٹ پر بٹھا لیا ـــــ وجے بیٹھ گیا۔ بس میں کھڑے لوگوں کی بھیڑ میں کچھ کھسر پھسر ہوئی اور پھر پیچھے سے کچھ آوازیں آئیں اور بس کی گھرگھراہٹ میں گم ہو گئیں۔ دونوں بہت کم بولے ـــــ مگر ان میں اجنبیت نہیں تھی۔ بس کے دھچکوں کے ساتھ دونوں کے جسم ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ـــــ

اس کے بعد سے تو وہ روزانہ ایک ہی سیٹ پر بیٹھ کر آفس اور اسکول جانے لگے۔ دونوں کے درمیان سے اجنبیت ختم ہو گئی تھی اور ان کی ملاقات بس اسٹاپ یا بس کے راستے سے بڑھ کر کبھی کبھی کسی ریسٹوران تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دونوں چائے پیتے اور گھنٹوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔

وجے کی صرف ماں تھی اور بس ـــــ مگر شاردا کی گاڑی کے ڈبے بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ رٹائرڈ باپ، ماں، تین بہنیں اور تین بھائی ـــــ اور اس پوری گاڑی کو کھینچنے کے لئے باپ کی پنشن کے چالیس روپے کے علاوہ اُسے ہی سارے کوئلے پانی کا انتظام کرنا پڑتا ـــــ

سب ہی بہن بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ وہ خود بھی پچیس سال سے زیادہ کی نہیں تھی ـــــ اس کے بعد شیلا تھی جو ہمیشہ بیمار رہتی، پھر ستیش، دنیش، پشپا، راجو اور رینو ـــــ سب ہی کے ہر کام دیدی کی تنخواہ پر نربھر رہتے ـــــ شیلا نے ہائی اسکول کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ مگر کھانستی ہوئی شیلا پر اب پڑھائی سے کچھ زیادہ روپے خرچ ہو جاتے۔ وہ لاکھ منع کرتی۔

"دیدی ـــــ! تم میرے لئے دوائیں مت لایا کرو، میں مروں گی نہیں۔"

اور شاردا پیار بھری جھڑکی سُناتی۔

"چل ہٹ ـــــ مریں تیرے دشمن ـــــ میری شیلا تو اب اچھی ہو جائے گی اور پھر ـــــ پھر میں تمھیں پرائیویٹ انٹر کا امتحان دلاؤں گی۔" انٹر کے امتحان کا نام آتے ہی شیلا کے چہرے پر جیسے سچ مچ زندگی کی لہر آ جاتی۔

ستیش فرسٹ ایر میں تھا۔ ہائی اسکول کے بعد پورے ایک سال مارا مارا پھرا، اور پھر جھک مار کر انٹر میں داخلہ کرانا پڑا ـــــ اب تو شاردا نے سوچ لیا تھا کہ بی۔اے۔ سے پہلے نوکری کرانے کو سوچے گی ہی نہیں۔

دنیش اور پشپا اسکول جاتے ___ اور راجو، رینو گھر میں ہی پڑھتے ___ ماتا جی اپنی لاڈلی شاردا کو اس چکّی میں پستے دیکھ کر خود بھی پسی جا رہی تھیں۔ اور شاردا کے ہاتھ پیلے کرنے کا خیال اب سِسک سِسک کر دم توڑتا محسوس ہوتا ___ کون کرے گا بغیر جہیز شادی ___؟

دُوسرے اگر کوئی راضی بھی ہو گیا تو غضب ہو جائے گا ___ شاردا چلی جائے گی ___ اور ___ اور اس کے یہ ننّھے ننّھے پھول ___ اَدھ کھلی کلیوں کا کیا ہو گا ___؟

کبھی کبھی وہ دکھی آوازیں شاردا کا دل کریدنے کی کوشش کرتی ___ وہ شاردا کا سر اپنے سینے سے لگا کر کہتی۔

"میری بچی ___ دن رات کی محنت سے کمھلائی جا رہی ہے ___ بس تین سال اور محنت کر لے ___ پھر ستیش نوکر ہو جائے گا ___ اور میں اپنی رانی کے لئے ایک ___" اور شاردا سمجھ جاتی کہ ماں کیا کہنے والی ہے۔

"نہیں ماں ___ میں نے کہدیا نا کہ میں شادی وادی نہیں کروں گی۔ میرے اپنے ہی بہن بھائی کیا کم ہیں جو میں دوسروں کی خدمت کرنے جاؤں شیلا، ستیش، راجو اور رینو یہی میری دنیا ہیں ___ ماں تُو فکر کیوں کرتی ہے" اور پھر رنجیدہ ماں کو خوش کرنے کے لئے وہ زور زور سے ہنسنے لگتی۔

"بس ___ اس سال ایم، اے، فائنل کر لوں تو جانتی ہے ماں ___ دو سو ملیں گے، پُورے دو سو"۔ اور دو بڑے بڑے نیلے نوٹوں کے تصوّر سے ہی جھرّی پڑے فکر مند چہرے پر جیسے کچھ چمک آ جاتی۔

"ہاں بیٹا ___ بھگوان مالک ہے!" ___ اور پھر وہ چُپکے چُپکے بڑبڑاتی ہُوئی وہاں سے چلی جاتی۔

وہ دونوں ایک دُوسرے کو بہلانے کی کوشش کرتیں۔ ماں سوچتی کہ بیٹی کچھ نہ سوچے، بے چاری خود ہی محنت سے چُور رہتی ہے ___ اور بیٹی سوچتی کہ ماں کو تو سب کی ہی فکر گھلائے ڈال رہی ہے۔ آخر میرے سوا اِن سب کا ہے ہی کون ___؟ پتا جی گھر کے معاملوں سے ہمیشہ ہی الگ رہے۔ بس تنخواہ لا کر ہر پہلی کو ماں

کے ہاتھ پر رکھنے بھر کا تعلق تھا، سو وہ اب بھی کرتے ہیں۔ پنشن کے رُوپے پُورے کے پُورے اب بھی ماں کے ہی ہاتھوں میں جاتے ہیں ـــــ اور پتا جی بے چارے اخبار سے سارا دن جی بہلایا کرتے ـــــ یا پھر نظریں جھکائے اپنی اس بڑھائی آبادی کے بارے میں سوچتے رہتے تھے ـــــ ویسے انھیں سب ہی کی پڑھائی کی فکر رہتی ـــــ اور اکثر اس بارے میں سوال بھی کر بیٹھتے ـــــ مگر راجو اور رینو کو تو پُوری طرح وہی پڑھا رہے تھے ـــــ

سارے گھر میں سناٹا چھایا رہتا ـــــ اگر راجو اور رینو اس گھر میں نہ ہوتے تو گھر اور قبرستان میں فرق ہی نظر نہ آتا۔ ایک سسکتا ہوا سا ماحول سارے گھر پر چھایا رہتا۔ اُکتائے ہُوئے سائے رینگتے رہتے ـــــ ان سایوں میں کبھی راجو، اور کبھی رینو زندگی کی حرارت پیدا کر دیتے اور چاروں طرف بجھے بجھے قہقہے فضا میں گونج جاتے اور پھر وہی نہ ٹُوٹنے والا سناٹا چھا جاتا ـــــ

وجے کی دوستی کے بعد سے شاردا میں جیسے زندگی آ گئی تھی۔ اس کے بھنچے بھنچے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگ اُٹھی تھی۔ بات بات میں اس کے قہقہوں کے جلترنگ کھنکنے لگتے۔ وہ پڑھتے پڑھتے کتاب بند کر دیتی اور کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کئے گھنٹوں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہتی ـــــ

وجے اب اس کے گھر بھی آنے لگا تھا۔ وہ پُوری پُوری کوشش کرتا کہ شاردا کی ذمّہ داریاں بٹا لے ـــــ ویسے اب وہ دوا وغیرہ لانے اور باہر کے اور دوسرے کام زبردستی خود ہی کر لیتا ـــــ اور شاردا کی مسکراتی ہُوئی آنکھیں احسان کے بار سے جھک جاتیں ـــــ

دنیش، پشپا، راجو اور رینو سب ہی وجے سے اس طرح گھُل مل گئے تھے جیسے وہ ان کے گھر ہی کا کوئی فرد ہو ـــــ اور ان سب کو اتنا ہلا ملا دیکھ کر پتا جی کی بوڑھی اور بوجھل آنکھیں اب کچھ ہلکی نظر آنے لگی تھیں ـــــ اور ماں تو روز ہی شام کو تلسی جی کے سامنے دیا جلا کر چندن لگاتی تو اس کے ہونٹ بڑے خلوص سے ہلتے ـــــ

"ہے تلسی ماں ـــــ! یہی تیرے تلک سے سجا ہُوا چندن میری شاردا کا

سہاگ چندن بن جائے ــــ" اور وجے، شاردا، اور کئی ننھے مُنّے ہلے جُلے قہقہے اس کے کانوں میں گونج اُٹھتے ــــ

وجے کی ماں بھی شاردا کے یہاں آنے جانے لگی تھی۔ شاردا جیسی پیسے پیدا کرنے والی، خوب صورت و شرمیلی لڑکی کے بارے میں بھلا وہ کیسے کچھ سوچے بنا رہ سکتی تھی۔ پھر وجے کی پسند کا بھی تھوڑا بہت خیال تھا۔ وجے کئی بار اپنی ماں سے شاردا کے بارے میں کہہ چکا تھا۔ وہ مسکرا کر رہ جاتی۔ وہ سوچتی ــــ چودھری صاحب زندہ ہوتے تو وہ اپنے اکلوتے وجے کو جلدی سے دولھا بنا دیتی ــــ لیکن شاردا کی ذمّہ داریاں ــــ اور ــــ اور وہ اسی خوف سے وجے کی اس بات کا جواب نہ دے پاتی۔ وجے اُسے اپنے گھر میں بھی سمجھاتا ــــ

"ماں ــــ! اس رشتے کے بعد ہم سب ساتھ رہیں گے۔ تمھیں کام بھی نہ کرنا پڑے گا۔ اور سب کے ساتھ رہ کر تمھاری اکیلے ہونے کی شکائیت بھی چلی جائیگی۔ چاچی سے تو تیری خوب پٹے گی ــــ" اور ماں ہوں ہاں کر کے ٹال دیتی۔ اور اپنے ماضی کے بکھرے پڑے ماحول میں کھو جاتی۔

ایک دن شاردا اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ وجے پہنچ گیا۔ آج وہ بہت موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے جھپٹ کر شاردا کے ہاتھ سے کتاب چھین کر میز پر ڈال دی۔

"یہ کیا دن رات پڑھنا پڑھنا لگا رکھا ہے۔ کبھی کتابوں کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھ لیا کرو ــــ اِدھر دیکھو اِدھر۔ میری طرف۔" اور وجے نے شاردا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کرسی سے کھینچ لیا۔ اور پھر اپنے چہرے کو اُس کے بالکل قریب کر کے آنکھیں پھاڑتا ہوا بولا۔

"اس میں پڑھو ــــ دیکھو تو بھلا کیا لکھا ہے؟"

شاردا نے ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا ــــ اور پھر مُنھ بناتے ہوئے بولی۔

"کچھ بھی تو نہیں نظر آتا۔"

وجے نے اس کی کلائیاں اور زور سے دبائیں ــــ "ذرا غور سے دیکھو ــــ"

اور پھر وہ مسکرا دیا۔

شاردا نے غور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہا ___ آں ___ ایک سایہ سا کچھ نظر تو آتا ہے۔ ہلکا سا سایہ ___" اور پھر دونوں قہقہے لگاتے ہوئے کتاب کی باتیں بھول کر اپنی باتیں کرنے لگے ___ وجے سنجیدگی سے سمجھاتا کہ وہ اتنی زیادہ محنت نہ کیا کرے۔ گھر کی پڑھائی کا وقت کچھ کم کر دے ___ مگر شاردا کہتی ___

"اگر ایم۔ اے۔ کر لوں گی ___ تو ___ تو جانتے ہو ___ میری تنخواہ۔"

اور وجے جھٹ سے بول اٹھتا ___

"کوئی ضرورت نہیں۔ میری اور تمھاری تنخواہ ملا کر تو دونوں گھر وہ ٹھاٹ سے رہیں گے کہ بس دیکھنا ___ اب تھوڑے ہی دنوں کی تو بات ہے ___ شاردا رانی جی ___" اور رانی کے نام پر شاردا شرما جاتی ___

"مجھے رانی مت کہا کیجئے۔"

"کیوں ___ ؟ کیا کسی کلرک کی ہونے والی بیوی کو رانی کہنا جرم ہے؟"

اور وہ وجے کی اس بات پر اور بھی شرما جاتی۔

"آپ تو بس ......"

"کیوں ___ بس کیوں ___ ؟ کیا جھوٹ ہے ؟" اور پھر ___ وجے کے بازو ہوا میں پھیل جاتے ___

اچانک ایک دن وجے نے بتایا کہ اسے آج کسی مہمان کو لینے کے لئے اسٹیشن جانا ہے۔ ماماجی کے کوئی دوست آ رہے ہیں۔ اس لئے شام کو نہیں آ سکے گا۔ وہ خود بھی جھلا رہا تھا ___

"یہ ماماجی کو نہ جانے بیٹھے بیٹھے کیا سوجھی ___ میری جان پر عذاب لاد دیا۔ اب نہ جانے وہ کتنے دن بور کریں گے ؟"

شاردا ہنسنے لگی ___ "اُن ___ آپ اس قدر کیوں غصہ ہیں ___ ؟ آخر مہمان ہی تو ہیں ___ چلے جائیں گے دو چار دن میں !"

پھر وہ مہمان کو کوستا اور ماماجی پر جھلاتا ہوا اسٹیشن چلا گیا ___ اور

دوسرے دن جب وجے نے رائے بہادر کے بارے میں تفصیل سنائیں تو سارا گھر ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ بڑے رعب اور دبدبہ کے ساتھ وہ آئے تھے۔ اور ہر بات میں اپنی امارت کا اظہار بڑے بھونڈے پیرائے میں کرتے تھے، مگر پھر بھی وجے کی ماں کو بھابی جی کہہ کر پیر چھوتے تھے ـــــ اور یقین دلاتے تھے کہ چاہے کچھ ہو جائے ـــــ چاہے لاکھوں روپے خرچ ہو جائیں مگر وجے کے پتا جی کی ساری جائداد کا مقدمہ لڑ کر ان کی تمام جائداد واپس ضرور دلا دیں گے ـــــ اور اس مری ہوئی جائداد کے زندہ ہو جانے کی لالچ میں وجے کی ماں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی تھیں ـــــ

وجے کے پتا جی کی کافی جائداد تھی جو دادا کے لئے ہوئے قرضے کے سلسلے میں کسی طرح نکل گئی تھی ـــــ اور اس جائداد کے جانے میں الہ آباد کے کسی رائے بہادر کا ہی ہاتھ تھا ـــــ اور ماں جی کا تو خیال تھا کہ وہ سجن شاید یہی ہوں گے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ عجیب عجیب حرکتیں اور عجیب عجیب باتیں کیا کرتے۔ کبھی کہتے ـــــ

"ارے وجے ـــــ تو تو سدا سفید ہی کپڑے پہنتا ہے ـــــ بجنئی خوب ـــــ میری سروج بھی بس سدا سفید کبوتری ہی بنی رہتی ہے" ـــــ "تیرے ماتھے پر یہ بالوں کی لٹ کیسی سجتی ہے ـــــ خوب! میری سروج کے بھی چاند جیسے ماتھے پر ایسی ہی لٹ لہریں لیا کرتی ہے ـــــ" "ارے تو چاول بالکل نہیں کھاتا ـــــ خوب! سروج تو چاول کو اناج ہی نہیں جانتی۔" اور وجے، سروج سروج سنتے ہوئے گھبرا گیا تھا۔

یہ ساری باتیں سُن کر سب نے خوب ہی مذاق اڑایا ـــــ خوب خوب قہقہے بلند ہوئے ـــــ مگر شاردا کا دل نہ جانے کیوں سروج کا نام وجے کی زبان پر آتے ہی ڈوبنے لگتا۔ حالاں کہ وجے خود ہی سروج کے بارے میں باتیں کر رہا تھا اور اس کا مذاق اڑا رہا تھا ـــــ اور ـــــ شاردا کے علاوہ سب ہی خوب ہنس رہے تھے۔

دو روز تک تو وجے رائے بہادر صاحب کی جی حضوری کرتا رہا۔ مگر بار بار سورج کا نام ٹیپ کا بند ہو کر رہ گیا تھا ـــــ اور وجے ـــــ اس نام سے ہی عجیب سی الجھن محسوس کرنے لگا تھا۔

تیسرے دن صبح ہی وہ شاردا کے گھر چلا گیا ـــــ اور آفس کے وقت تک وہیں رہا ـــــ آفس سے واپسی پر بھی وہ گھر پر نہیں ٹھہرا ـــــ ماں ناراض بھی ہوئی ـــــ مگر وجے نے پرواہ نہ کی ـــــ اور پھر چوتھے دن صبح ہی رائے بہادر اپنا کام پورا کر کے چلے گئے، جس کی وجے کو خبر بھی نہ ہو سکی۔ البتہ ان کے جانے سے وجے نے سکون کا سانس لیا تھا ـــــ اور ـــــ ان لوگوں کی روزمرہ کی زندگی پھر واپس آ گئی تھی۔

ایک ماہ بعد وجے کی ماتا جی اپنے بھائی کے پاس بنارس جانے کیلئے تیار ہوئیں ـــــ وجے نے بھی آفس سے چھٹی لے لی ـــــ شاردا کو وجے کی ایک دن کی جدائی بھی شاق گزرتی تھی اور وجے تو چار پانچ روز کے لئے جا رہا تھا ـــــ شاردا بہت ہی پریشان تھی ـــــ

چلتے وقت جب وجے اس سے ملنے آیا تو نہ معلوم کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ـــــ وجے نے اس کی ٹھوڑی اونچی کرتے ہوئے مسکرا کر کہا ـــــ

"اری پگلی ـــــ! تو چار دن کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی ـــــ جب میں کئی کئی دن کے دورے پر جایا کروں گا تب کیا کرے گی ـــــ" اور پھر وجے کے مضبوط بازوؤں کے حلقے میں شاردا محفوظ ہو گئی ـــــ

وجے ـــــ! وہ آہستہ سے بولی "سورج، بنگلہ، موٹر ـــــ اور ....." اور پھر اس نے اپنا منھ وجے کے سینے میں بالکل چھپا لیا ـــــ وجے نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف ـــــ میں نے ہزاروں بار اپنا یہ اصول تم کو بتایا ہے کہ ـــــ موٹر والے ـــــ موٹر والوں کے لئے ـــــ بنگلے والے ـــــ بنگلے والوں کے لئے ـــــ اور یہ مزدور ـــــ اس مزدورنی کے لئے ـــــ" یہ کہتے ہوئے وجے نے شاردا کے

پیڑی پڑے ہونٹوں پر چند کلیاں کھلا دیں ___ اور پھر وہ چلا گیا ___ اور شاردا کی شفاف جھیل جیسی لبریز آنکھوں سے سوتے پھوٹ پڑے ___ وہ کتنی ہی دیر سوچتی رہی ___ "کیا وجے سونے کے ڈھیر کی چمک سے مقابلہ کر سکے گا ___ جگمگاتے ہوئے سنہرے اور رُوپہلے سکوں سے وجے کی آنکھیں کہیں چوندھیا تو نہ جائیں گی۔" مگر وہ یہ سب کیوں سوچ رہی ہے ___ وہ ___ وہ تو دو تین دن میں واپس آجائے گا ___ پھر سے اس کے گھر میں قہقہے گونج اٹھیں گے۔ وجے ___ وجے تو اس کے گھر میں اور اس کی زندگی میں خوشی بن کر آیا ہے، برکت بن کر آیا ہے ___ وہ کبھی نہیں جا سکتا ہے ___ دُنیا میں اسے کوئی بھی نہیں چھین سکتا ___

پھر اس نے کتابیں الماری میں بند کر دیں ___ وجے کی غیر موجودگی میں وہ صرف وجے کے تصور میں کھوئی رہے گی ___ سائے اسکا دل بہلائیں گے ___ وجے کے آنے تک ___

ایک ہفتہ گزر گیا ___ وجے نہیں آیا۔

وجے کے آفس میں اس نے فون کیا تو اسے معلوم ہوا کہ وجے نے ملازمت سے استعفٰے دے دیا ہے ___ وہ بھی کل ___ ریسیور اس کے ہاتھ سے گر گیا ___ اور وہ لرز گئی ___ نہ جانے کیا بات ہوئی ___؟

اسے کچھ خبر نہیں تھی ___ مگر دل کی دھڑکنیں کچھ کہہ رہی تھیں ___ جسے وہ ماننے پر تیار نہ تھی ___ اسے تو یقین تھا ___ وجے آئے گا ___ اسے وجے کا انتظار تھا ___ وجے آئے گا ___ یا ___ خط آئے گا ___ وہ انتظار کرتی رہی ___

صبح سویرے ہی اس نے اخبار اٹھا لیا ___ سرخیاں دیکھتے دیکھتے اسکی نگاہیں چوتھے صفحہ پر جم گئیں ___

"رائے بہادر بھانومل کی نئی مل کے نئے منیجر اور رائے بہادر کے جانشیں وجے کمار چودھری کی شادی کماری سروج سے کل رات ہو گئی ___ صوبے کے گورنر اور وزراء بھی ڈنر میں شامل تھے۔"

شاردا چکرا گئی ___ اخبار اس کے ہاتھ میں دبارہ گیا ___ اور جب کئی گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا اس کے چاروں طرف بیلے بیلے زندہ سائے پھیلے ہوئے تھے ___ اور ان کی بے نور آنکھوں میں ہراس اور ناامیدی کے طوفان امنڈ رہے تھے ___ وہ کراہی ___

ماں نے پانی بلایا ___ اور اس نے ماں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا تو اٹھ بیٹھی ___

"ماں ___ تم ___ تم ___" اور وہ پھر بے ہوش ہو گئی ___

ڈاکٹر کو دوبارہ بلایا گیا ___ آڑے وقت کے لئے ماں کے بچائے ہوئے روپے بکس کی تہوں سے اوپر آ گئے ___ اور ___ اور شاردا کے دونوں بازو انجکشن سے چھلنی ہو گئے ___

دس بارہ دن بعد جب شاردا اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تو جیسے وہ نئی دنیا میں آ گئی ہو ___ ننھے راجو اور رینو کے مرجھائے ہوئے چہروں نے جیسے اسے کچھ یاد دلا دیا ہو ___ وہ چونک پڑی ___ اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ___ اس کا بوڑھا باپ ___ اور اس کی کمزور کانپتی ہوئی محبت کی دیوی ماں ___

وہ دھیرے دھیرے اپنے کمرے میں پہنچی ___ اور الماری سے کتابیں نکال کر میز پر چننے لگی ___ ماں نے دیکھا تو دوڑی آئی ___

"یہ ___ یہ ___ کیا کر رہی ہو بیٹی ___ ابھی ٹھیک تو ہو جاؤ ___ یہ کتابیں ___" وہ ماں کی طرف دیکھ کر مسکرا دی ___

"ماں ___ مجھے ایم، اے، کرنا ہے ___ اسی سال ___ اور ابھی تو راجو اور رینو دونوں کا داخلہ بھی ہو گا۔"

اور ___ اور ___ اس کے ذہن پر ابھرتے ہوئے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے ___

جیسے تیسے کروٹیں بدل کر سکھیا نے صبح کی تھی ___ ابھی کرن بھی نہیں پھوٹی تھی کہ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں ___ لیٹے لیٹے مسکرائی اور پھر ___ اپنے آپ کھلکھلا کر ہنس دی ___ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان چہرہ چھپا لیا ___ اور پھر اس نے کروٹ بدل لی ___ بانس کی کمزور سی کھاٹ نے بھی چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ اس کی مسرت میں شرکت کا اعلان کر دیا تھا ___ وہ پھر مسکرا دی ___

”آج ___ آج وہ آجائے گا ___ جرور سے جرور آجائے گا ___ لکھا تھا ___ شکروار کو آؤں گا ___ سو آج شکروار تو ہے ہی ___“ وہ کہیں بھول تو نہیں رہی ___؟ اس نے انگلیوں پر حساب لگایا ___ پرسوں بدھوار تھا، پُروے کی بازار تھی ___ کل بی پھے، ادھر کی بازار ___ اور ___ آج ___ آج تو ہے ہی شکر ___ یہ سوچتے ہی اس کے کانوں کی لویں جیسے جل اٹھیں ___ کچھ دیر اور پڑے رہنے کے بعد اس نے انگڑائی لی ___ اور کھاٹ سے اُٹھ گئی ___ وہ آج بہت خوش تھی ___ اس کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے ___ اس کے انگ انگ میں جیسے کچھ تھرک رہا تھا ___ اس نے اُٹھتے ہی کوٹھری کی صفائی شروع کر دی ___ ساری کوٹھری میں جھاڑو دے کر اس نے کوڑا سمیٹا اور پھر مڑ کر اپنی کوٹھری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ باہر کوڑا

پھینکنے چلی گئی ـــــ واپسی میں اچانک اسے خیال آیا کہیں کوٹھری میں برجو نہ آگیا ہو۔
یہ سوچتے ہی اس کی گردن ذرا نیچے جھک گئی ـــــ وہ چپکے سے دبے پاؤں کوٹھری میں داخل
ہوئی ـــــ چاروں طرف نظر دوڑائی ـــــ

"اوں ـــــ ہوں ـــــ بالکل ٹھیک نہیں ـــــ!" اس نے جلدی ـــــ سے
چھوٹی مٹی کی ہنڈیا اٹھائی اور پرانے کپڑے کے پُتارے سے ذرا سی دیر میں ساری
کوٹھری چمکا دی ـــــ

سکھیا جلدی سے کنوئیں سے پانی کھینچ لائی ـــــ اور ڈول لکڑی کے
تختے پر رکھ کر بیٹھ گئی ـــــ اس نے اپنے دونوں پیر خوب رگڑ رگڑ کر صاف کئے ـــــ
منھ دھویا ـــــ ہاتھوں کو کہنی تک خوب مَسل مَسل کر صاف کیا، جن میں چوڑیاں بار
بار کھنک رہی تھیں۔

اس نے برتن تو رات ہی صاف کر لئے تھے ـــــ جو سامنے لپے پتے
چوکے میں چمک رہے تھے ـــــ رات سے ہی اس نے ایسے ویسے سارے
کام جلدی جلدی نمٹا دئیے تھے ـــــ بھلا صبح کے لئے وہ کیوں چھوڑتی کام۔
ـــــ اس نے آنگن میں پڑی کرنوں کو دیکھا ـــــ دھوپ سیدھی
ہوتے ہی ـــــ اور ـــــ اور وہ مسکرا دی ـــــ وہ جلدی سے اُٹھ کر اپنی کوٹھری
میں گئی ـــــ طاق پر رکھے چھوٹے سے آئینے کو اُٹھایا ـــــ منھ دیکھا ـــــ اور جیسے
خود سے شرما گئی ـــــ اندر ہی اندر کئی لہریں اس کے سارے جسم میں رینگ گئیں۔
اُس نے جلدی سے آئینہ طاق پر رکھ دیا ـــــ جیسے برجو چھپا ہوا اُس کی یہ خوشی دیکھ
دیکھ کر مسکرا رہا ہو ـــــ

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ـــــ دل دھک دھک کر رہا تھا ـــــ کہیں دھوپ
تو سیدھی نہیں ہو گئی ـــــ لیکن ـــــ لیکن ـــــ سورج تو آج بڑے دھیمے دھیمے
اوپر چڑھ رہا تھا ـــــ

"بیری کہیں کا ـــــ ہونہہ ـــــ!" اس نے بوتل سے کڑوے تیل کو ہتھیلی
پر انڈیلا ـــــ اور دونوں ہتھیلیوں پر چپڑتے ہوئے بالوں کو چمکایا ـــــ کنگھی
سے بال سنوارے ـــــ اور جب کاجل کی گہری لکیریں اُس نے آنکھوں میں

ڈالیں تو اسے یاد آیا کہ ایک بار برجو نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑتے ہوئے کہا تھا "تیری انکھیں جنجیروں نے تو جکڑ رکھا ہے سکھیا ـــــ!" اور سکھیا نے جلدی سے اپنی کلائیاں چھڑالی تھیں ـــــ

"ارے چھوڑ ـــــ وہ ماں آ گئی ـــــ" اس پر برجو نے کلائیاں تو جھٹ چھوڑ دی تھیں ـــــ لیکن جب سکھیا کی شرارت کھلی تو وہ بناوٹی غصہ دکھاتے ہوئے کوٹھری سے باہر نکل گیا تھا ـــــ اور پھر کس طرح کواڑ کی آڑ سے اس نے خوشامد کر کر کے اسے منایا تھا ـــــ

کاجل کے بعد اس نے سیندور اُٹھایا جو اسے بہت پسند تھا ـــــ موٹی سی سُرخ دھاری مانگ میں سجا کر وہ ہمیشہ مسکرا دیتی تھی ـــــ چاہے بالوں میں کنگھی ہو یا نہ ہو اس کی مانگ سدا بھری رہتی ـــــ سیندور سجانے کے بعد اس نے چھوٹی سی ملگجی گلابی رنگ کی پڑیا اٹھائی اور مکھیا کی بہو کی طرح ذرا سے پانی میں گھول کر پہلے اپنے ہونٹ رنگے پھر ایڑی ـــــ

اس نے آئینہ پھر اٹھا لیا ـــــ ہائے رے اتنے لال ہونٹ ـــــ؟ برجو نے تو کبھی دیکھے ہی نہیں تھے ـــــ اسے افسوس ہُوا ـــــ ہونٹ لال کرنے کا یہ راز اسے پہلے کیوں نہیں معلوم ہوا ـــــ سنگھار سے مطمئن ہو کر اس نے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی چھوٹی سی گٹھری اُتاری ـــــ اس میں اس کی وہی ریشمی نئی ساری بندھی تھی جو برجو نے پتہ نہیں کیسے چھ مہینہ پہلے میکو کے ہاتھ بھیجی تھی ـــــ اس نے ساری باندھی ـــــ یہ اس کے برجو کا پہلا تحفہ تھا ـــــ جسے اس نے بہت سنگھ کر رکھا تھا ـــــ مونگے کا ہار جس میں جگہ جگہ چاندی کے موتی پروئے تھے اس نے دونوں ہاتھوں میں لے کر ذرا اونچا کر کے دیکھا ـــــ اور پھر مسکرا کر گلے میں پہن لیا ـــــ کانوں میں کرن پھول پہن کر جب اس کی نظر اپنی کلائیوں پر پڑی جس میں موٹی موٹی لاکھ کی چوڑیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا ـــــ اسے ذرا سا جھٹکا تو ضرور لگا لیکن اس نے ہونہہ کہہ کر اسے پرے دھکیل دیا ـــــ "برجو آ جائے وہ اس بار کنگن اور پچھیلے ضرور بنوالے گی ـــــ کما کر لا رہا ہے اس کا برجو ـــــ" برجو کا نام آتے ہی

اس کے سامنے چوڑے چکلے سینہ والا لمبا تڑنگا جوان مسکرا رہا تھا۔
آج اسے دو سال کے دکھوں کا ذرا بھی خیال نہ تھا ــــ بیاہ میں لیا ہوا سارا قرضہ برجو کے بھیجے ہوئے روپیوں سے اس نے ادا کر دیا تھا ــــ بڑی مشکل سے اپنے خرچ کے لئے سکھیا پندرہ بیس روپے رکھ کر سب مہاجن کو دے دیتی ــــ اصل تو نہ جانے کب کا ادا ہو چکا تھا ــــ مگر ــــ مگر ــــ سود پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تھا ــــ بڑی مشکل سے مہاجن سے پیچھا چھوٹا تو پچھلے مہینے بوڑھی ساس کی بیماری اور پھر مرنے پر سب خرچ ہو گیا، اور ــــ اب تو سکھیا رانی بن جائے گی ــــ رانی ــــ اتنے بہت سے روپے برجو کماتا ہے ــــ خوب گہنے بنوائے گی ــــ کپڑے بنوائے گی ــــ پھر فوراً اسے خیال آیا ــــ تھوڑے روپے بچانے بھی ضرور ہوں گے ــــ کل کدار ضرورت جو پڑے گی ــــ وہ دو ہی تھوڑی نا رہیں گے ــــ یہ سوچتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ــــ ایک ننھا سا برجو اس کے سامنے کلکاریاں لینے لگا تھا ــــ وہ شرما گئی ــــ "ہونہہ ــــ کیسے کیسے سوچ آتے ہیں ــــ"

اس کا ذہن کبھی ماضی اور کبھی مستقبل میں بھٹک رہا تھا ــــ اس کے ہاتھ الگ کام کر رہے تھے ــــ اور ــــ دماغ الگ ــــ اس نے گٹھری پھر باندھی ــــ آئینہ طاق پر سجا کر رکھا ہی تھا کہ چندا آگئی ــــ اس کی پڑوسن چندا ــــ سکھیا کو سجا سجایا دیکھ کر ایک دم بول پڑی ــــ

"کیوں ری سکھیا ــــ کیا بات ہے ــــ کیا گاؤں میں کوئی ......"
اور سکھیا بیچ میں ہی بول اٹھی ــــ

"ایسے مت بولو دیدی ــــ دو سال بعد ــــ ارے اس روز جو تار آیا تھا ــــ تو نے نہیں سنا تھا ــــ سارے گاؤں میں تار ــــ تار کہتا پھرا تھا ــــ"

"تار ــــ؟ ارے وہ تو کسی بری خبر کی پہچان ہے ــــ!"

"نہ دیدی نا ___ ایسی بدشگونی زبان پر نہ لاؤ ___ اس میں تو تھا کہ شکر وار کو آرہا ہوں ___ ہرکارے سے ہی میں نے پڑھوا لیا تھا ___ اور آج شکر وار ہے ___!"

سکھیا پھوٹی پڑ رہی تھی ___ اس کی یہ خوشی چندا سے دیکھی نہیں جا رہی تھی ___ منھ بنا کر بولی ___

"کچھ ہو سکھیا ___ تیری ساس کو مرے ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے تم ایسے بن ٹھن کر برجو کے سامنے جاؤ گی ___ تو کیا سوچے گا وہ۔" یہ سنتے ہی سکھیا کو احساس ہوا کہ اس نے شاید غلطی کی ہے ___ مگر ___ اس کا دل غلطی ماننے پر تیار نہیں تھا ___

برجو جب باندھ پر بھرتی ہوا تھا اس کی ایڑی کی مہاور بھی نہ چھوٹی تھی ___ بیاہ کے صرف چار مہینے ہوئے تھے ___ پر بابا کی ضد اور گاؤں کے اور دوسرے جوانوں کی بھرتی کو دیکھ کر اس کو بھی صبر آگیا تھا ___ تھوڑے دنوں کا دکھ اس کے سارے کھیت اپنے کر دے گا ___ ساری زندگی آرام سے گزرے گی ___

پر اِس وقت چندا کی ٹوک سے جیسے اس کا دل دھڑک گیا ___ اس کی نظریں چھپر کے سامنے پھیلے ہوئے آنگن کی دھوپ پر گڑی تھیں ___ اپنے کاموں کے ساتھ ساتھ چندا کی باتوں کا جواب بھی ہاں ہوں میں دیتی جا رہی تھی ___ پر دل سے چاہ رہی تھی کہ چندا کسی طرح اسے اکیلا چھوڑ دے ___ تاکہ اس کا یہ وقت سہانے سپنوں میں کٹ جائے ___

چندا نے بھی بھانپ لیا کہ اس کا ٹھہرنا سکھیا کو اچھا نہیں لگ رہا ہے، وہ اکثر سکھیا کو چڑھانے کے لئے کہتی رہتی تھی ___ "تیرے برجو نے جرور شہر میں کسی سے آنکھ لگالی ہے ___ تب ہی تو نہیں آتا ہے ___ ورنہ چار مہینے کی بیاہتا چھوڑ کر کوئی ایسے برس گزارتا ہے ___" لیکن آج اس کی بیٹھین گوئی غلط ہو رہی تھی ___ اور اسے اندر ہی اندر اچھا نہیں لگ رہا تھا ___ وہ اٹھتے ہوئے بولی ___

"اچھّا تو سکھیا ___ میں چلی اب ___ بس آنے میں بھی دو ڈھائی گھنٹے ہی رہ گئے ہوں گے ___ ارے ہاں ___ کیا تو سڑک پر جائے گی، برجو کو لِوانے ___؟"

"ہاں دیدی ___! اور کون ہے ___؟ میں ہی تو ہوں اکیلی ___! شاید کاکا کے گھر سے بھی کوئی آجائے ___ پر، میرا جی نہیں مانتا ___ میں تو جاؤں گی ___"

اور ___ چلتے چلتے چندا سُنا ہی گئی ___ "بہو بیٹیوں کے یہ لچھن تو بُرکھے بُرے بتا دیں ہیں ___ مرد باہر سے آوے تو رنڈیوں کی طرح بن سنور کر سواگت کرنے گاؤں سے باہر ہی پہنچ جائیں!"

سکھیا کو چندا کی بات کڑوی تو بہت لگی ___ لیکن ٹالنے کے لئے کچھ نہیں بولی ___ اور ___ چندا منھ ہی منھ میں کچھ کہتی چلی گئی ___

سکھیا پھر اپنے خیالوں میں کھو گئی ___ وہ آئے گا ___ اب نجانے کیسے بولتا ہوگا ___ بالکل شہری بابو جیسا ___ کہیں مجھے بھول تو نہیں جائیگا کہیں یہ لالی ___ یہ سنگھار دیکھ کر چپ تو نہیں ہو جائے گا ___ ان دو برسوں میں کتنا انرتھ ہوا ___ بابا گئے ___ امّاں گئیں ___ بس میں ہی رہ گئی ___ سو کیا میں پتی کے آنے پر سوگ لے کر بیٹھ جاؤں ___ نہ بابا ___ نا ___

اس نے جلدی جلدی رسوئی کے کام سے فرصت کی ___ موٹی موٹی روٹیاں اور ساگ اٹھا کر چھینکے پر رکھا ___ چولھے کو بجھایا ___ مگر ایسے کہ ایک طرف کنڈے میں آگ سُلگتی رہے ___ اس کا برجو تھکا ہارا آئے گا تو کیا چلم کے لئے آگ بنانے بیٹھ جائیگی ___

دھوپ سیدھی ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی ___ سکھیا نے دروازے بند کئے اور سڑک کی طرف چل دی ___ گاؤں سے باہر والی سڑک کی طرف ___ اور پھر سڑک کے کنارے ایک موٹے سے آم کے پیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر آتی جاتی بسوں کو دیکھنے لگی ___

اس کے سامنے دونوں طرف دُور تک سُرمئی سڑک پھیلی تھی ___

دونوں طرف سے بسیں آ آ کر رکتیں، لوگ چڑھتے، اُترتے اور بسیں اپنی اپنی منزل کی طرف بڑھ جاتیں ——— اسے نہیں معلوم تھا کس طرف کی بس میں اس کا برجو آئے گا وہ دونوں طرف کی بسوں کو باری باری دیکھتی اور جب بس آگے چلی جاتی تو وہ بھی دور ماضی میں بھٹکنے لگتی ———

اب تو برجو بڑا آدمی لگتا ہوگا ——— جب باندھ بننے کی خبر گاؤں میں پھیلی تھی اور لوگ بھرتی ہو رہے تھے تو اس نے بھی سُنا تھا ——— وہ بالکل نئی دلھن تھی ——— بابا بیمار تھے ——— بیاہ کا بھی قرض تھا ——— بوڑھی ساس گلے گلے قرض میں ڈوبی ہونے کے باوجود اپنے لال کو بھرتی نہیں کرانا چاہتی تھی ——— ابھی تو اس نے بڑے لاڈ سے بیاہ کیا تھا ——— مگر قرضہ ——— مہاجن ——— زمین ——— اور ——— بھوک ——— پھر باندھ کی نوکری ——— اور ——— رُوپیہ ——— آخر اس نے بھی مجبور ہو کر کہہ دیا تھا ——— جا، تو بھی چلا جا برجو ——— چھٹی لے کر جلدی آجانا قرضہ اُدا ہو جائے گا ——— اپنی زمین مر جائے گی ——— پھر ساری زندگی عیش ——— لیکن برجو کا دل دھڑک اٹھا تھا ——— نہیں وہ نہیں جائے گا ——— سکھیا کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی ——— وہ بول اُٹھا تھا ———

"ہاں! میں یہاں مزدوری کر لوں گا ——— تیرا سارا قرضہ اُدا کر دوں گا۔ زمین بھی چھڑا لوں گا ——— لیکن ماں میں جاؤں گا نہیں ———"

اور پھر رات میں پنڈال والے جلسے میں سکھیا کو اچھی طرح یاد ہے ——— ایک نیتا جیسے آدمی نے بھاشن دیا تھا ——— "دیش کو اس وقت کتنی چیزوں کی ضرورت ہے ——— دیش کی ترقی کے لئے باندھ ——— اور باندھ کے لئے آدمی ——— آدمی کے لئے روٹی، کپڑا ——— اور ——— رہنے کے لئے مکان ——— اور مہاندی۔ جو دلوی کے رُوپ میں جل بکھیر کر چلتی ہے ——— اس پر باندھ بنا کر کتنی ہی یوجنائیں پوری ہوں گی ——— بہت سے گاؤں بجلی سے چمک جائیں گے ——— باندھ بن جانے سے لاکھوں من اناج زیادہ پیدا ہوگا ——— بہت سے کارخانے چالو ہو جائیں گے ——— جن سے سیکڑوں آدمیوں کو روزگار ملے گا ———

اور یہ سب سُننے کے بعد سکھیا نے سوچ لیا تھا برجو کو جانا ہی چاہیئے

پھر اس نے رات ہی میں برجو سے کہا تھا "تو نے برا کیا ماں کی بات نہیں مانی ـــــ تم ضرور جاؤ ـــــ

برجو کو لگا تھا ـــــ جیسے اس کی خوشیاں کہیں کھو گئی ہوں ـــــ اس نے آہستہ سے کہا ـــــ "سکھیا ـــــ ! یہ تو کہہ رہی ہے ـــــ میں چلا جاؤں ـــــ اس دن چوپال سے اٹھنے میں دیر ہوئی تب تو روٹھ گئی تھی ـــــ اور آج تو ہی اتنی دور جانے کو کہہ رہی ہے ـــــ" اور سکھیا نے سنظر یں نیچی کئے ہوئے جواب دیا ـــــ

"ہوں!"

اور پھر ـــــ آخر کار وہ بھی جانے پر تیار ہو گیا ـــــ اور جب وہ دہلیز کو پار کر رہا تھا تو سکھیا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ چھپا لیا تھا ـــــ

گھرر گھرر کی آواز نے سکھیا کے خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا ـــــ اور وہ بس کو بھرتا کنے لگی ـــــ بس رکی ـــــ اس میں سے ایک بکس لئے، بابو جیا پرشاد اترا ـــــ پرشاد کو دیکھتے ہی وہ جان گئی کہ باندھ سے آنے والی بس یہی ہے ـــــ وہ کانپتی ہوئی کھڑی ہو گئی ـــــ اس کا دل مسرت سے جھوم رہا تھا ـــــ اس کے قدم زمین پر چپک گئے تھے ـــــ وہ ایڑی اٹھا اٹھا کر برجو کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی ـــــ اسی بس پر تو برجو بھی آیا ہوگا۔ اس کے اندر شرم اور خوشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں ـــــ اس کی آنکھیں بس کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں ـــــ

پہلے پرشاد اترا ـــــ پھر مہیش ـــــ پھر کرتار ـــــ حمید ـــــ راجو، سب ہی اتر آئے ـــــ سکھیا نے دیکھا ـــــ بس آگے بڑھ گئی ـــــ

برجو کیوں نہیں آیا ـــــ ؟" اس نے کاکا کے لڑکے منگو کی طرف دیکھا۔

"بھوجی ـــــ تم ـــــ" اور پھر وہ رک گیا ـــــ

"ہاں ہاں بتاؤ ـــــ وہ کیوں نہیں آیا ـــــ؟"

منگو ہکلاتے ہوئے بولا ـــــ "وہ رک گیا ہے بھوجی ـــــ وہ بعد میں آئے گا ـــــ" کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا۔

سکھیا کے کانوں میں جیسے شائیں شائیں کرتا طوفان اُمنڈ آیا ___ "منگو ___" اس نے اس کے دونوں شانے پکڑ لئے ___ "بتا منگو سچ سچ بتا ___ وہ کیوں نہیں آیا ___ کیا اس نے گھر....."

نہیں ___ نہیں بھوجی ___ وہ تو شہید ہو گیا ___ باندھ کا ایک کونا اس کو نہ جانے کہاں بہالے گیا ___!"

سکھیا کے کانوں میں آواز گئی یا نہیں ___ لیکن وہ پتھر کی بن گئی تھی ___ منگو سہارا دے کر اسے گاؤں میں لے آیا ___ سکھیا کا گھر کھولا اور اسے اندر پہنچایا ___ گاؤں میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی ___ اور پاس پڑوس کی عورتیں سکھیا کے گھر جمع ہو گئیں ___

سکھیا کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا ___ اسے چپ چاپ ایک جگہ بٹھا دیا گیا ___ پھر عورتوں نے اسے گھیر لیا ___ رونے کی آوازیں بھی آئیں ___ لیکن سکھیا کی آنکھیں دروازے کے باہر ٹکی ہوئی تھیں ___ جیسے آنے والے کا انتظار اب بھی ہو ___

ایک بوڑھی عورت نے اپنے کندھے کے سہارے اسے ٹکا لیا ___ چندا بھی روتی پیٹتی آگئی ___ پھر کسی عورت نے سکھیا کے ہاتھ آگے کھینچے ___ لاکھ کی موٹی موٹی چوڑیاں اس کی کلائیوں میں پھنسی ہوئی تھیں ___ ایک عورت نے سکھیا کی کلائی زمین پر رکھ کر پتھر اٹھایا ہی تھا کہ ___ سکھیا اچانک ہی چونک پڑی ___

"نہیں نہیں ___ یہ کیا کرتی ہو دیدی ___؟" یہ کہتے ہی اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا ___ اس کے اندر سے آنسوؤں کا طوفان بہہ نکلا ___ جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو ___ جیسے مہاندی کے باندھ کا کوئی کونا ٹوٹ گیا ہو ___ وہ زور سے چیخی ___

"میرا سہاگ نہ اجاڑو دیدی ___ برجو مرا نہیں ہے ___ میری چوڑیاں..."

اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھڑا کر اپنے سینہ سے لگالئے تھے ___ عورتوں نے سیندور مٹانا چاہا تب بھی وہ چیخ اٹھی ___

"نہیں نہیں ___ میں ودھوا نہیں ہوں ___ میرا سہاگ اجڑا نہیں ہے

پہلے ــــ پہلے اس کا نام برجو تھا ــــ اور اب ــــ ماتا مہاندی نے اس کا نام ہیرا کنٹھ رکھ دیا ہے ــــ ہیرا کنٹھ ــــ" وہ اور بھی معلوم نہیں کیا کیا کہتی رہی دھیمی آوازوں میں ــــ

اور رات کو ساری عورتیں جب چلی گئیں تو اس نے گھور کر اپنے گھر کو چاروں طرف دیکھا ــــ اسے ایسا لگا ــــ دروازے سے باہر برجوا سے بلا رہا تھا ــــ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا ــــ اور ــــ سڑک کی طرف چل دی ــــ جدھر سے کل والی بس آئی تھی ــــ

۱۹۵۶ء

اگلا قدم

اندھیرا ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر ملہوترا کے گھر میں سناٹا چھا گیا تھا۔ ان کا اکلوتا بیٹا گاڑی لے کر باہر چلا گیا ۔۔۔ اور سناٹے گھر کے کونے کونے سے چپک گئے ۔۔۔ بچاری نینا کیا کرتی، سوائے اس کے کہ ممی پاپا سے الگ اپنے کمرے میں جا گھسے ۔۔۔ اس نے شالنی کو پسند کیا تھا ۔۔۔ اس میں اسکی کیا غلطی تھی ۔۔۔ ہر لڑکی اپنی اچھی سی دوست کو اپنے بھائی کے لئے پسند کر لیتی ہے ۔۔۔ اب رہی ممی پاپا کی پسند تو جب شالنی میں کوئی برائی تھی ہی نہیں تو وہ کیوں نہ پسند کرتے ۔۔۔ پھر کرنل صاحب خود بھی پاپا کے دوست تھے۔ دوستی کا رشتہ میں بدل جانا ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے ۔۔۔

پھر اچانک یہ گڑبڑ کیسے ہو گئی ۔۔۔ ؟ سمیت تو مہینوں سے شادی کی بات سُن رہا تھا ۔۔۔ لیکن سنجیدہ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا ۔۔۔ بس بات بات پر اچھی سی بہو لا دینے کا وعدہ ممی سے کرتا رہا تھا ۔۔۔ شالنی کی بات پر بھی ہنس کر اس نے ہمیشہ یہی کہا ۔۔۔ "ارے ابھی کہاں ۔۔۔ میری شادی۔

وہ تو شالنی سے بھی ہمیشہ ہنس ہنس کر بات کرتا تھا ۔۔۔ اس کی خوبصورتی کی تعریفیں کرتا تھا ۔۔۔ اس سے فرمائشیں کر کے غزلیں سُنتا تھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ کتنی ہی بار اُردو کے غلط تلفظ کو اس نے صحیح کرایا تھا ۔۔۔ لیکن کبھی اگر اسے محسوس بھی ہوتا کہ شالنی اس سے قریب آنا چاہتی ہے تو بڑی خوب صورتی

سے ٹال دیتا ــــــ "ارے جی یہ سوئیٹر رکھئے اپنے صاحب کے لئے ــــــ بڑا قسمت والا ہوگا ــــــ تیرا صاحب ــــــ" اور شالنی ــــــ امید اور نا اُمیدی کے جھکولوں میں اُلجھ جاتی ــــــ

اور آج جب سُمیت سے کہا گیا کہ کرنل رتیش کے گھر سے کچھ لوگ کل صبح آنے والے ہیں ــــــ شگون لے کر ــــــ تو وہ چونک پڑا ــــــ

"شگون ــــــ نہیں نہیں ــــــ یہ نہیں ہو سکتا ــــــ بالکل نہیں ممی ــــــ یہ بالکل ناممکن ہے ــــــ" اور پھر وہ گاڑی لے کر باہر چلا گیا تھا ــــــ دوپہر میں اس کا فون آگیا کہ وہ آج ہی شہر سے باہر جا رہا ہے کچھ دنوں کے لئے ــــــ اور پھر سارے گھر میں سناٹے کا کہرا چھا گیا ــــــ

ڈاکٹر ملہوترا کا چہرہ جیسے سُت گیا تھا ــــــ ہمیشہ ہنسنے والا جیالا ڈاکٹر۔ جیسے برسوں پُرانا مرض ابھر آیا ہو ــــــ اور وہ اس سے خوفزدہ ہو گیا ہو ــــــ انھوں نے اپنا سارا وجود سمیٹ کر ایک صوفہ میں ڈال دیا تھا ــــــ مسز ملہوترا کو ضرور ان کی اس حالت پر تعجب ہو رہا تھا ــــــ وہ بار بار بے چینی سے ان کے پاس آکر دو چار جملے کہہ جاتیں ــــــ لیکن ان کی صُورت دیکھ کر انھیں کبھی کچھ زیادہ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا ــــــ دنیا میں بدنامی ــــــ دو بڑے خاندان کی ناچاقی کے نتائج۔ اور پھر ــــــ سُمیت کا گھر سے یوں چلا جانا ــــــ یہی دو چار باتیں وہ گھما پھرا کر، کہتی رہیں ــــــ اور خود اُلجھنوں کے سمندر سے بار بار اپنے وجود کو بچانے کی ناکام کوشش کرتیں ــــــ اور پھر ــــــ کمزور پتوار پر ہی لوٹ پڑتیں ــــــ

"تم نے بنایا ہے سُمیت کو ــــــ تم نے میرے بیٹے کو برباد کیا ہے۔ اس کی ہر بات ہمیشہ مان لیتے ہو ــــــ نہ دھرم سے مطلب نہ سنسکار سے ــــــ کتنی بار تم سے کہا ــــــ مجھے اس کی بعض باتیں بالکل نہیں بھاتیں ــــــ لیکن تم ــــــ تم نے اسے بڑھاوا دیا ــــــ اور ــــــ اور ــــــ اب یہ کبھی مان جاؤ گے ــــــ شہر میں کتنی بدنامی ہوگی ــــــ ارے کچھ تو بولو ــــــ کرنل صاحب کو کیا مُنھ دکھاؤ گے ــــــ" مسز ملہوترا بولتی جا رہی تھیں ــــــ

اور ڈاکٹر ملہوترا ــــــ صوفے میں دھنسے دور خلاؤں میں اپنے ماضی

کے بکھرے تنکوں کے درمیان اپنے دونوں ہاتھوں سے دودھ جیسا ریحانہ کا ہاتھ پکڑے اسے سمجھا رہے تھے ـــــ "ریحانہ میں ہار گیا ـــــ میں ممی پاپا سے ہار گیا ـــــ میری ساری دلیلیں بے کار ہو گئیں ـــــ اور پھر ـــــ تمہارے گھر والے ـــــ" اور ریحانہ سسک پڑی تھی ـــــ

"نہیں اتنے کمزور نہ ہو ـــــ یہ ہمارا آخری سال ہے ـــــ ہم لوگ ڈاکٹر بن جائیں گے ـــــ چھوٹا سا گھر بنا لیں گے ـــــ دونوں مل کر کلینک کا کام کریں گے ـــــ اور پھر ـــــ اور پھر دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائیگا۔ طوفان تھم جائے گا ـــــ پاپا ممی اور ابا اور امی سب ملنے لگیں گے ـــــ وہ لوگ بھی تو اتنے قریبی دوست ہیں ـــــ"

"کیا سوچ رہے ہو ـــــ سُمیت شہر سے باہر ہرگز نہیں گیا ہوگا ـــــ مجیب کو فون کر کے پوچھو ـــــ میں کہتی ہوں تم کو کیا ہو گیا ہے ـــــ ارے کچھ کرو ـــــ کل ان لوگوں کو کیا جواب دو گے؟"

ڈاکٹر ملہوترا ـــــ "ہوں!" کرتے ہوئے کسمسائے ـــــ کھوئی کھوئی آنکھوں سے مسز کی طرف دیکھا ـــــ اور پھر آہستہ آہستہ بیڈ روم کی طرف چلنے لگے ـــــ

لیکن آگے بڑھتا ہوا ہر قدم ماضی کے سینے کو روندتا ہوا پیچھے ہی پڑ رہا تھا ـــــ وہ اپنے کو مجرم محسوس کر رہے تھے ـــــ وہ بزدل تھے ـــــ انھوں نے پانچ سال ریحانہ کی مانگ میں سیندور سجایا تھا ـــــ اور ماتھے پر ہمیشہ انھوں نے سرخ چمکتی ہوئی بندی دیکھی تھی ـــــ لیکن یہ سیندور اور یہ بندی ان کے تصوّر میں ہی پڑے پڑے دھندلی ہو کر مٹ چکی تھی ـــــ کتنی ہی عیدیں مجیب چچا اور پاپا نے مل کر منائی تھیں ـــــ پھر جیسے عید اور ہولی، دیوالی سب تیوہار ہم دونوں گھروں کے لئے ہی آتے تھے ـــــ ریحانہ کی فرمائش پر میں نے کالی شیروانی بنوائی تھی ـــــ اور پھر عید پر سب ہی نے نواب صاحب کے نام سے پکارا تھا ـــــ پاپا بھی خوش تھے ـــــ مجھے گہنا اور بنارسی پسند آتے تھے ـــــ اور ریحانہ کو سیندور بھری مانگ اور بندی ـــــ اور پھر،

میں نے اپنے کو بزدل بنالیا تھا ___ ممی پاپا کے سامنے ___ گھٹنے ٹیک دیئے تھے ___ اور پھر وہی ہوا تھا ___ جو ہوتا آیا تھا ___ لیکن ___ لیکن سُمیت میرا اگلا قدم ہے ___

ریحانہ مجھے کبھی نہیں ملی ___ اس نے اپنی پرچھائیاں بھی مجھ سے چھپالیں ___ مجیب چچا اور چچی بھی خاموشی سے چلے گئے ___ بابا اور ممی بھی بکھرے بکھرے لگنے لگے ___

میرے آنگن میں سُمیت اور نینا کھیلنے لگے ___ شروع میں مسز ملہوترا اپنے باپ کی فیکٹریوں اور ملوں کا ذکر کرتی رہیں لیکن دھیرے دھیرے انھیں بھی کلینک کی ملی جُلی مہک کی عادت سی پڑ گئی ___ انھیں کچھ مرضی کے خلاف برداشت کرنا پڑا ہو ___ ڈاکٹر ملہوترا نے وہ لمحہ ہی کبھی نہیں آنے دیا تھا ___

لیکن آج کے اس حادثہ نے سارے گھر میں اُداسی بکھیر دی تھی ___ مسز ملہوترا بھی آج نہ جانے کیوں خوف زدہ سی ہو کر رہ گئی تھیں ___ پچیس سال کے ساتھ میں آج ڈاکٹر ملہوترا اُن کو بالکل نئے نئے سے لگ رہے تھے ___ بے بس ___ کھوئے کھوئے ___ لیکن مطمئن ___ ایک لفظ بھی سُمیت کے خلاف ابھی تک نہیں کہا تھا ___ ان کی یہ حالت دیکھ کر مسز ملہوترا کے اندر جیسے بار بار کچھ ٹوٹ رہا تھا ___ جسے وہ مضبوطی سے جوڑے رکھنا چاہتی تھیں ___

اچانک ڈاکٹر ملہوترا نے فون کے نمبر ڈائل کرنا شروع کئے ___ مسز ملہوترا چونک پڑیں ___ "ہیلو ___ جی ہاں ___ کہنا بس یہ تھا ___ کہ سُمیت کا رشتہ نہیں ہو سکے گا ___ جی ___ پھر بات کروں گا ___ معاف کیجئے گا ___"

مسز ملہوترا کو چکر آگیا۔

"آپ نے ___ آپ نے ___ یہ کیا کہدیا ___ کچھ سوچا بھی ___ اب کیا ہوگا ___ ہ ___ میں کہہ رہی ہوں سُمیت کہیں نہیں گیا ہے ___ جھوٹ بالکل

جھوٹ ـــ وہ یہیں ہے ـــ اسی شہر ......"

"ہاں وہ یہیں ہے ـــ مجھے معلوم ہے ـــ!" ڈاکٹر ملہوترا کی گمبھیر آواز گونجی۔

"تم سیما کو جانتی ہو ـــ؟

"ہاں ہاں ـــ سیما کو کیوں نہیں جانوں گی ـــ کیوں ـــ کیا ہوا ـــ؟ بولو تو ـــ وہ تو بڑی شریف لڑکی تھی ـــ"

"ہاں وہ اب بھی بڑی شریف لڑکی ہے ـــ چلو سُمیت کے لئے اسے مانگ لیں ـــ!"

"نہیں نہیں ـــ ایسا نہیں ہو سکتا ـــ ناممکن ـــ ہمارے سنسکار ـــ ہمارا دھرم ـــ کچھ بھی ہو سُمیت کو ہماری بات ماننا پڑے گی ـ سُمیت ہمارا اکیلا بیٹا ہے ـــ سارا کل برباد ہو جائے گا ـ تم کو کیا ہو گیا ہے؟"

ڈاکٹر ملہوترا گہری نظروں سے مسز کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولے ـــ جو پہلے غلط ہو چکا ہو اسے صحیح ہونے دو ـــ تم سُمیت کی ماں ہو اور سُمیت میرا اگلا قدم ہے ـــ"

۱۹۸۲ء

عہدِ حاضر کی جن تازہ دم ہندوستانی خواتین افسانہ نگاروں نے اردو کہانی اور افسانے کے باریک فرق کو سمجھ کر فنی سطح پر کامیابی سے برتا ہے ان میں ڈاکٹر شمیم نکہت ایک اہم مقام کی حامل ہیں۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ موصوفہ نے پروفیسر احتشام حسین اور رضیہ سجاد ظہیر جیسے بزرگوں کی صحبتوں میں افسانہ نویسی کے فن کی تربیت حاصل کی ہے۔

شمیم نکہت کی کہانی پڑھتے وقت ہماری متخیلہ کی توانائی متحرک اور فعال رہتی ہے۔ شمیم نکہت اپنے قاری کے ذہن کو مشق کرنے کا پورا پورا موقعہ فراہم کرتی ہیں۔ ان کی کہانی کی بنت میں مہارت اور چابکدستی ہوتی ہے اور کہانی کی واقعیت میں منطقی تسلسل ہوتا ہے۔ واقعات کی تمام کڑیاں باہمدگر مربوط ہوتی ہیں۔ کرداروں اور مکالموں کے نفسیاتی پس منظر میں نقطۂ عروج تک قاری کو پہنچانے میں کہانی کی ہلکی پھلکی روزمرہ کی زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ اپنے موضوع سے انصاف کرتی ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں پھیلے ہوئے ہزارہا متنوع اور فکر انگیز موضوعات ان کی گرفت میں آتے ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ کہانی لکھتے وقت وہ سستی جذباتی سطحی اور مجہول روش کے بجائے گہرے شعور اچھے مشاہدے اور بہترین بصیرت سے کام لے کر قاری کے لیے تفکر و تعقل کے بیک وقت اتنے دریچے کھولتی ہیں کہ کہانی ختم ہونے کے بعد اس کے نئے فکری سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اچھے کہانی کار کی یہی پہچان ہے۔

آغا سہیل

پروفیسر و صدر شعبہ اردو

ایف۔ سی۔ کالج۔ لاہور (پاکستان)

لاہور

۱۴ر مارچ ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر شمیم نکہت کی اصل قلمرو گھر آنگن کی مانوس فضا، اس کی خوشیاں، محرومیاں اور مسائل ہیں۔ اس قلمرو میں حیاتِ انسانی کے مطالعہ کے لیے کتنی وسعتیں اور جہتیں ہیں؟ انسانی رشتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی کیسی المناک داستانیں چھپی ہیں؟ اس کا اندازہ کرنا ہو تو ڈاکٹر شمیم نکہت کی کہانیوں کو ذرا غور سے پڑھئے۔ دکھوں اور محرومیوں کی آگ میں جلتے ہوئے انسانوں کے کرب کو انھوں نے اپنی روح میں شدّت سے محسوس کیا ہے لیکن اپنے عہد کی زندگی سے ان کا رشتہ دردمندانہ ہی نہیں حریفانہ بھی ہے۔ اپنی ہر کہانی میں وہ سماج کی ناانصافیوں اور ناہمواریوں کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ اس کے لیے وہ شروع سے قاری کو اعتماد میں لے لیتی ہیں۔ وہ بڑی سادگی لیکن مہارت سے اپنے کردار تراشتی ہیں اور بیانیہ پر حاکمانہ قدرت سے کہانی میں ایک شگفتہ لیکن تہ دار جذباتی فضا پیدا کر دیتی ہیں۔

شمیم کی کہانیوں میں نئے احساس و شعور کے ساتھ ساتھ ان انسانی قدروں کا عرفان بھی ہے جو انھیں عزیز ہیں اور جو ان کے تخلیقی ہنر کا ایک متحرک حصّہ بن گئی ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند افسانہ کی توانا روایت سے فیض ہی نہیں اٹھایا اسے آگے بھی بڑھایا ہے۔ اسے بدلتی ہوئی زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا ہے۔

قمر رئیس

۷-۳-۸۸ء

پروفیسر و صدر شعبہ اردو

دہلی یونیورسٹی